ہنستی مُسکراتی، دل میں درد جگاتی تحریریں

ڈھول ڈھپا

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی

ڈھول ڈھپّا

عطاء الحق قاسمی

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4439310 042-7351963

E-mail: nastalique@yahoo.com

نٓ وَالقَلمِ وَمَا یَسطُرُونَ ٥

القران

مصنف : عطاء الحق قاسمی

سرورق : عبید

بار اوّل : ۲۰۱۲ء

کمپوزنگ : التمش مبین
0321-4730769

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۵۰۰ روپے

بیرون ملک : ۲۰ امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 042-7351963
E-mail: nastalique@yahoo.com

پروفیسر

پریشان خٹک

کے نام

حسن ترتیب

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم!

میرا ایک دوست ہے جو ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرسکتا ہوں، ویسے بھی وہ بہت ''بڑبولا'' قسم کا شخص ہے، اپنی اچھائیاں اور برائیاں خود ہی بیان کرتا رہتا ہے۔ اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی اس کی دیانت اور امانت ہے اور میں نے اس حوالے سے اسے بڑی بڑی آزمائشوں میں پورا اُترتے دیکھا ہے!

آج سے ۴۲ سال پہلے جب وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اور ایک غریب خاندان کا فرد ہونے کے ناطے اسے جیب خرچ نام کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی اسے سکول سے واپسی پر سڑک کے کنارے ایک سو روپے کا نوٹ پڑا ملا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے جی میں آئی کہ وہ اس رقم سے اپنی ساری ناآسودہ خواہشیں پوری کرے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس گھٹیا خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور گھر پہنچتے ہی یہ سو روپے کا نوٹ اپنے والد صاحب کے سپرد کردیا۔ والد صاحب تین روز تک مسجد میں اعلان کرواتے رہے کہ اگر کسی کی کچھ رقم گم ہوئی ہو تو وہ ان سے رابطہ کرے لیکن جب کسی نے ان سے رابطہ نہ کیا تو انہوں نے یہ سو روپے مسجد کے فنڈ میں جمع کردیے۔

پھر جب وہ بی اے کا طالب علم تھا، اس کے والد صاحب نے اسے آٹھ سو روپے نکلوانے کے لیے سیونگ اکاؤنٹ کی کاپی دے کر ڈاک خانے بھیجا۔ کلرک نے اسے آٹھ سو کی بجائے غلطی سے سولہ سو روپے دے دیے۔ کالج کا طالب علم ہونے اور خوشحال خاندان کے لڑکوں سے دوستی کی وجہ سے اب اس کی محرومیوں میں اضافہ ہو چکا تھا، اس

کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ دوستوں کی جوابی خاطر مدارت کر سکتا، چنانچہ اس نے پیسے جیب میں ڈالے اور سائیکل کو پیڈل مار کر گھر کی طرف چل دیا۔ گھر کے راستے میں ایک دفعہ پھر اس کے ضمیر نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا اور گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کا ضمیر اس کی خواہشات پر پوری طرح غالب آ چکا تھا چنانچہ اس نے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہی والد صاحب کو بتایا کہ کلرک نے اسے غلطی سے آٹھ سو روپے زیادہ دے دیے ہیں۔ والد صاحب نے یہ سن کر اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا ''تو پھر تم یہ دوزخ کی آگ گھر تک لے کر کیوں آئے ہو، ابھی جاؤ اور زائد رقم کلرک کو واپس کرو''

جب میرے دوست کو اپنی زندگی کی پہلی تنخواہ ملی تو اس وقت بھی تقریباً اسی طرح کا واقعہ پیش آیا، بینک کے کیشئر نے اسے ساڑھے چار سو روپے کی بجائے ساڑھے چار ہزار روپے ادا کر دیے اور اس نے اسی وقت اس میں سے اپنے ساڑھے چار سو اُٹھائے اور باقی رقم کیشئر کو واپس کر دی۔

زندگی میں ترقی کے مراحل طے کرتے کرتے، وہ اس پوزیشن میں آ گیا کہ اگر وہ چاہتا تو بہت تھوڑے عرصے میں کروڑ پتی بن سکتا تھا لیکن اس سے اس کا وہ عہد نہ ٹوٹتا تھا جو اس نے اپنے خدا سے رزق حلال کے سلسلے میں کیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے پندرہ لاکھ کی رقم ٹھکرائی، ایک اور موقع پر اس نے ایک ایسا کام کرنے سے انکار کر دیا جو اس کے بہت سے بھائی بند کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے لکھوکھا روپے کمائے بلکہ اس کی وجہ سے ان کا سوشل اسٹیٹس بھی بہت بلند ہوا۔ میرے اس دوست کو اللہ تعالیٰ نے عزت، شہرت، مقبولیت سب کچھ عطا کیا ہے، زندگی کی بنیادی ضرورتیں اور سہولیات بھی اسے حاصل ہیں۔ اسے اپنی زندگی پر کوئی پچھتاوہ نہیں، میں دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت کرتا ہوں مگر اس کے سلسلے میں مجھے ایک عجیب وغریب اُلجھن نے گھیر رکھا ہے اور میں یہ کالم اپنی اسی اُلجھن کے حل کے لیے لکھ رہا ہوں۔

گزشتہ روز ہم دونوں دوست آوارہ گردی کے موڈ میں تھے، سارا دن بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے، ہم نے روزہ بھی ایک ہوٹل میں افطار کیا، اس کے بعد

لکشمی چوک جا کر چانپیں کھائیں، کشمیری چائے پی اور پھر گاڑی ایک طرف پارک کر کے پیدل چل پڑے۔ اس روز ہمیں پیدل چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا شاید اس لیے کہ بہت عرصے بعد اس کا موقع ملا تھا۔ لکشمی چوک میں بے پناہ رونق تھی۔ مالشیے، تماش بین، کھابہ گیر، فقیر، نشئی، بے فکرے ہر قسم کے لوگ ریکارڈنگ کے شور شرابے میں اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ میں اور میرا دوست ایک مالٹوں کی ریڑھی کے پاس رُک گئے۔

''کیا خیال ہے مالٹے نہ کھائے جائیں؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ'' میں نے کہا اور پھر ہم دونوں مالٹوں پر پل پڑے۔

ریڑھی والا مالٹے چھیل چھیل کر اور کاٹ کاٹ کر پلیٹ میں رکھتا چلا جاتا تھا اور ہم کھاتے چلے جاتے تھے۔ ہم اس روز عجیب طرح کی جنونی کیفیت میں مبتلا تھے۔ بالآخر ہم نے ہاتھ کھینچ لیے۔ میں مالٹے گنتا جا رہا تھا، ہم نے بیس مالٹے کھائے تھے۔

میرے دوست نے ریڑھی والے سے پوچھا ''کتنے پیسے؟''

ریڑھی والے نے پوچھا ''کتنے مالٹے بنے؟''

میرے دوست نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا ''بارہ!''

ریڑھی والے کے چہرے پر شک کی ایک لکیر سی پھیلی لیکن اس نے بغیر کسی تکرار کے بارہ مالٹوں کے پیسے وصول کیے اور اپنی ریڑھی پر بچھی بوری کے نیچے رکھ دیے۔

میں نے اپنے دوست کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھا مگر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہم دونوں خاموشی سے کار تک آئے، رستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی، بس دونوں ایک دوسرے کو کن اَکھیوں سے دیکھتے رہے۔

یہ میرے دوست کی کہانی ہے۔ یہی میری کہانی ہے، یہ آپ کی کہانی ہے اور شاید ہر بشر کی کہانی ہے، کبھی وہ ''لکھ'' کی چوری نہیں کرتا اور کبھی ''ککھ'' کی چوری پر راغب ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی پارسائی پر غرور نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہر لمحے شیطان الرجیم کے حملوں سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

چل اوئے بکری!

کراچی میں جب میں اپنے میزبان سیّد علی اظہر نقوی کے بنگلے میں داخل ہوا تو مجھے کہیں سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی، یہ یقیناً میری سماعت کا نقص تھا ورنہ کلفٹن میں شیر نے کہاں سے آنا تھا مگر اظہر نقوی نے میری یہ ''خوش فہمی'' جلد ہی دور کر دی اور کہا ''آپ کی سماعت کو دھوکا نہیں ہوا۔ یہ واقعی شیر کے دھاڑنے کی آواز تھی اور شیر وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے'' میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک خوفناک قسم کا شیر مجھ سے دس گز کے فاصلے پر کھڑا تھا بلکہ اس کے ساتھ شیرنی بھی تھی۔ مجھ پر تھوڑی دیر کے لیے کپکپی سی طاری ہوگئی۔ میں نے اپنی اس کپکپاہٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور کہا ''کراچی میں سردی بہت ہے'' اس اثناء میں شیر اور شیرنی نے پنجرے میں بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ پنجرہ کیا تھا، پورا آڈیٹوریم تھا اور اس کی سلاخیں اتنی کھلی تھیں کہ شہر لاہور کے بھاٹی گیٹ کے باہر جو سینڈو ایک چھوٹے سے رِنگ میں داخل ہو کر پھر چشم زدن میں اس سے نکلنے کے فن کا مظاہرہ کرتا ہے، اُس کی شاگردی میں دو دن بیٹھ جائے تو اس میں وہ ذوقِ یقیں پیدا ہو سکتا ہے جس سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں، میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں اس شیر کو سینڈو کا ایڈریس نہیں بتاؤں گا۔

''آپ گڈو کی بے چینی دیکھ رہے ہیں؟''

''کون گڈو؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ سامنے پنجرے میں'' اسے پتہ ہے یہ میرے دفتر سے آنے کا وقت ہے۔ یہ

مجھ سے لاڈ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔''
یہ کہتے ہوئے اظہر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور پنجرے کی طرف چل پڑے۔ شیر سلاخوں پر پنجے جما کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے غالباً اظہر نقوی کی دیدہ بوسی کے لیے اپنا جبڑہ باہر کو نکالا ہوا تھا۔ نقوی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر کو سہلانا شروع کیا، شیرنی ذرا فاصلے پر منہ دوسری طرف پھیر کر لیٹ گئی تھی، غالباً جیلس ہو گئی تھی یا پھر مجھ نامحرم سے پردہ تھا۔
''آیئے اب آپ کو شیرنی سے ملاتا ہوں!'' اظہر نقوی یہ کہہ کر پنجرے کے ساتھ چلنا شروع ہو گئے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ یہ گزرگاہ صرف دو فٹ چوڑی تھی یعنی بائیں طرف پنجرہ تھا اور دائیں طرف بنگلے کی دیوار۔ اس گزرگاہ سے گزرنے کا مطلب ''گزر جائے'' والے پنجابی محاورے ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ شیر ہاتھ بڑھا کر کسی بھی لمحے دست پنجہ کر سکتا تھا۔ اس ''پل صراط'' پر سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میری دو ٹانگوں کے درمیان خلاء کم ہو گیا ہے اور دونوں گھٹنے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ جل ترنگ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ خواجہ اسلام کی کتاب ''مرنے کے بعد کیا ہوگا!'' کے بہت سے ابواب نظروں کے سامنے آ گئے۔ عرفانِ ذات کے ان لمحوں میں کہیں دور سے اظہر صاحب کی آواز سنائی دی۔ عطا بھائی! ڈرنا نہیں اس سے شیر دفاعی پوزیشن میں آ جاتا ہے اور حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد میرے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ جب سفرِ آخرت درپیش ہو تو انسان کو ڈرنے کی بجائے اللہ کو یاد کرنا چاہیے چنانچہ میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اظہر نقوی کو اپنے سامنے پا کر شیرنی نے اپنی آنکھیں میرا مطلب ہے اپنے ڈیلے اُوپر کیے جن میں شکایت ہی شکایت تھی مگر پھر اُٹھ کر وہ پنجرے کے قریب آ گئی اور نقوی صاحب سے گلے ملنے کی کوشش کرنے لگی تاکہ

جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا

کے مصداق تجدید محبت کا اعلان کیا جا سکے لیکن ظالم سماج یعنی سلاخوں کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ نقوی صاحب نے پیار سے اس کی کمر کو سہلایا اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے ''عطا بھائی، آپ کیوں پرے کھڑے ہیں، ذرا قریب آئیں'' حالانکہ مشہور شعر ہے ؎

حسینوں سے فقط صاحب سلام دور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

مگر غالباً نقوی صاحب نے شعر نہیں سنا ہوا تھا!

ڈرائنگ روم میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے نقوی صاحب سے پوچھا ''شیروں کے ساتھ آپ کی دوستی کب سے ہے؟''

''یہ اصل میں میری بیٹی کا شوق ہے'' نقوی صاحب نے کہا ''اس کے شوق کی تکمیل کے لیے یہ جوڑی ہم نے اس وقت خریدی تھی جب یہ دونوں بالکل بچے تھے۔ یہ ہمارے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ انہیں پنجرے میں تو ہم نے مہمانوں کی وجہ سے بند کیا ہوا ہے۔''

''ان کی وجہ سے تو آپ کا گھر بھی بہت محفوظ ہوگا۔''

ہاں کچھ ایسے ہی ہے۔ ایک دفعہ غلطی سے چور اندر کود گئے، سامنے پنجرے میں شیر تھے، ان کی گھگی بند ہوگئی۔ چوکیدار ان کی مشکیں کس کر میرے پاس لایا۔ میں نے کہا ''انہیں تھانے میں دے دو'' چوکیدار بولا صاحب جی مجھے یہ بھلے لوگ لگتے ہیں آپ انہیں تھانے میں نہ دیں، شیروں کے آگے ڈال دیں۔''

یہ کہتے ہوئے اظہر نقوی نے قہقہہ لگایا اور بولے ''خیر چھوڑیں اس بات کو، آپ کو اصل بات یہ بتانے کی ہے کہ طبقاتی شعور جانوروں میں بھی بہت ہوتا ہے!''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ان شیروں کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک فل ٹائم ملازم رکھا ہوا ہے، جو انہیں نہلاتا ہے، انہیں روزانہ بارہ کلو گوشت کھلاتا ہے سیروں کے حساب سے دودھ پلاتا

ہے، اس کے علاوہ ایک ڈاکٹر ہے جو ہفتے میں دو دفعہ ان کا میڈیکل چیک اپ کرتا ہے، ضرورت ہو تو دوا دیتا ہے، ٹیکہ لگاتا ہے لیکن ان کی دوستی صرف میرے ساتھ ہے''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل آقا کون ہے؟''

یہ سنتے ہی ایک دم میرے دل سے ان شیروں کی ہیبت ختم ہوگئی اور مجھے یہ مثل بکری کے لگے۔ میں نے سوچا ان میں اور ہمارے سیاستدانوں میں کیا فرق ہے؟ بچارے عوام ان سیاست دانوں کے نازنخرے سہتے ہیں، ان کے لیے قربانیاں دیتے ہیں، انہیں بڑے بڑے خطاب دیتے ہیں لیکن وہ اپنے عوام سے پیار کرنے کی بجائے اپنے ''اصل آقا'' کے آگے دم ہلاتے رہتے ہیں، اس کے بوٹ چاٹتے ہیں، اس سے اشارہ پاتے ہیں تو عوام کو لے کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور پھر اشارہ پاتے ہیں تو واپس اپنے امریکہ کے کسی وِلا میں چلے جاتے ہیں۔ بچارے عوام انہیں شیر سمجھتے ہیں، مگر یہ تو اپنے آقا کی بکری ہیں!

شام کو لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے اظہر نقوی صاحب کا ہاتھ پکڑا اور انہیں شیروں کے پنجرے کے پاس لے آیا۔ شیر کو میری یہ خود اعتمادی پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی انگارے جیسی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا ''چل اوئے بکری'' اس نے دھاڑنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز بکری کی منمناہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی!

✧ ✧ ✧

لاہور کا تاریک جغرافیہ!

لاہور کے شادی گھر:

یوں تو لاہور میں بہت سے شادی گھر ہیں تاہم ان میں سے مشہور ترین شادی گھر لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ دوپہر اور رات کے اوقات میں یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ یہاں باراتیوں کے علاوہ بھی دوسرے لوگ زرق برق کپڑے پہنے آتے ہیں اور کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ لڑکے والے سمجھتے ہیں یہ لڑکی والوں کے مہمان تھے اور لڑکی والے انہیں باراتی سمجھ کر ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ داتا دربار کے بعد یہ دوسری جگہ ہے جس کے لنگر سے روزانہ بیسیوں مسکین اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ ان شادی گھروں میں ریستوران، ڈائننگ ہال اور رہائشی کمرے بھی ہیں اور یوں ان کی حیثیت ہوٹل کی بھی ہے۔ تاہم زیادہ تر یہ بطور شادی گھر استعمال ہوتے ہیں!

فلم اسٹوڈیو:

لاہور پاکستان کا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں بہت سے فلم اسٹوڈیو ہیں جن میں بیک وقت ایک ہی فلم بنتی ہے۔ اس فلم کی کاسٹ بھی عموماً تبدیل نہیں ہوتی۔ دس پندرہ برس بعد ہیروئن بدل جاتی ہے البتہ ہیرو ایک ہی رہتا ہے جس کا نام سلطان راہی ہے۔ سلطان راہی ایک خوبرو ہیرو کا رول بھی ادا کرتا ہے جسے کالج کا اسٹوڈنٹ دکھایا گیا ہوتا ہے اور ڈریکولا کا بھی۔ وہ یہ دونوں کردار بغیر کسی میک اپ یا گیٹ اپ کے کرتا ہے اور ہر کردار

میں سپر ہٹ جاتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ناظرین کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔ مسلسل ''نظر بندی'' کی وجہ سے یہ ناظرین سیاست میں بھی ہیرو اور ولن کے فرق کو بھول گئے ہیں!

سیاسی رہنما:

لاہور سیاست کا گڑھ ہے لیکن یہاں سیاست دان دوسرے صوبوں یا شہروں سے منگوائے جاتے ہیں اور ان کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ یہاں بہت عرصے سے کوئی مقامی سیاست دان پیدا نہیں ہوا جو ماڑے موٹے سیاست دان ہیں بھی تو ان کا دائرہ اثر لاہور کارپوریشن کی حدود تک ہے۔ لاہور نے بہت عرصے کے بعد ایک مقامی سیاست دان پیدا کیا ہے جس کا نام میاں نواز شریف ہے اور جس کا دائرہ اثر چاروں صوبوں میں موجود ہے مگر یہ سیاست دان بھی ہر ہفتے لاہور دوڑا آتا ہے۔ باقی صوبے والے اس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ وہاں صرف اس وقت جاتا ہے جب وہاں کسی خاتون کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔

اخبارات:

اخبارات کی تعداد اور ان کی سرکولیشن کے لحاظ سے لاہور پاکستان کے تمام شہروں سے آگے ہے۔ لاہور سے جو اخبارات نکلتے ہیں ان میں اہم سے اہم خبر کی پہلی سطر صفحہ اوّل اور باقی ساری خبریں صفحہ سات پر بقیوں والے حصے میں شائع ہوتی ہے۔ چنانچہ قاری سارا وقت پہلے اور ساتویں صفحے کا پینڈا طے کرنے ہی میں مشغول رہتا ہے اور یوں اخبار والے خبر میں چھپی خبر سے اس کا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے اخباروں میں کالی ریورسیں بہت نکالی جاتی ہیں۔ ریورسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی اخبار کو پیلی صحافت کا طعنہ دینا ممکن نہیں رہتا، اسے زیادہ سے زیادہ کالی صحافت کہا جا سکتا ہے۔ اخباروں کی شہ سرخیاں ''دما دم مست قلندر، جیرا آ

گیا میدان میں، ہے جمالو، اوئے تیری لاش نوں مچھیاں ای کھان گیاں'' قسم کی ہوتی ہیں جو بہت پسند کی جاتی ہیں۔ پولیس، کسٹم، ایف آئی اے، انکم ٹیکس، ایکسائز اور فضل ربی والے دوسرے محکموں کی طرح اخبار میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ البتہ کچھ عرصے سے بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے بھی اخبارات نکالے جا رہے ہیں جس سے کارندوں کو بھی بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مذہبی جماعتیں:

لاہور میں تمام مذہبی جماعتوں کے دفاتر موجود ہیں۔ ان جماعتوں کا عہدیدار کوئی بھی باریش شخص ہو سکتا ہے۔ مذہبی جماعتیں لوگوں کی مذہبی تربیت کی طرف بہت توجہ دیتی ہیں۔ چنانچہ مختلف اسٹکرز چھپوا کر کاروں پر ان کے مالکوں سے پوچھے بغیر چسپاں کرائے جاتے ہیں۔ ان اسٹکروں پر یارسول اللہ، یا علی مدد اور یا اللہ مدد لکھا ہوتا ہے۔ دراصل ان اسٹکروں سے مختلف فرقوں کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتیں مذہب کے فروغ کے علاوہ باقی سب خدمات انجام دیتی ہیں۔

مساجد:

استنبول کے بعد لاہور دوسرا شہر ہے جسے مساجد کا شہر کہا جا سکتا ہے۔ مسجد کسی بھی خالی پلاٹ پر اس کے مالک کی مرضی کے بغیر بنائی جا سکتی ہے اور جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو کوئی مائی کا لال اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں لب کشائی نہیں کر سکتا۔ ان مسجدوں میں اہل محلہ کے اعصاب کو مضبوط بنانے کے لیے چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگا دیے جاتے ہیں تاکہ کسی کافر ملک سے جہاد کی صورت میں عوام بموں کے دھماکوں سے پریشان نہ ہوں۔ ان لاؤڈ سپیکروں سے چندہ بھی طلب کیا جاتا ہے اور چندہ دینے والوں کے ناموں کا اعلان بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ چندہ نہیں دیتے باقی تینوں لاؤڈ سپیکروں کا رُخ بھی ان کے گھر کی طرف کر دیا جاتا ہے۔

پبلشنگ کے ادارے:

لاہور میں بے شمار پبلشنگ کے ادارے ہیں چنانچہ کوئی بھی مصنف بآسانی اپنی کتاب شائع کرا سکتا ہے۔ پبلشر حضرات نے اس کے لیے بہت آسان طریقہ کار رکھا ہے یعنی مصنف کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات پبلشر کو ادا کر دیتا ہے چنانچہ اس کی کتاب شائع ہو کر مارکیٹ میں آ جاتی ہے۔ یہ پبلشر حضرات مصنف کو باقاعدہ رائلٹی بھی ادا کرتے ہیں اور یہ رائلٹی دس کتابوں کی صورت میں ہوتی ہے جو مصنف کی رقم سے شائع شدہ کتابوں میں سے دس کتابوں کا پیکٹ بنا کر اسے پیش کر دی جاتی ہے۔

احتجاجی جلوس:

لاہور میں احتجاجی جلوس بہت نکلتے ہیں۔ ان جلوسوں کے لیے حکومت نے شاہراہ قائداعظم کو مخصوص کیا ہوا ہے جہاں چند تاجر حضرات ناجائز طور پر اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں جو ان جلوسوں کے موقع پر عموماً لوٹ لی جاتی ہیں یا جلا دی جاتی ہیں۔ جلوس کے شرکاء قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے بھی اگر کوئی جلوس نکالیں تو قومی املاک کو ضرور نذرِ آتش کرتے ہیں۔ شاہراہ قائداعظم پر جب کوئی احتجاجی جلوس نمودار ہوتا ہے ٹریفک پولیس ٹریفک کا رُخ اردگرد کی گلیوں میں موڑ دیتی ہے اور اس کے بعد بیلٹ ڈھیلی کر کے ٹوپی اُتار کر بھنگیوں کی توپ پر بیٹھ جاتی ہے اور سگریٹ کے کش لگانے لگتی ہے البتہ امریکہ کے خلاف نکالے جانے والے جلوسوں کو منتشر کرنا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے ٹریفک کو گلیوں میں موڑنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ اس موقع پر اگر میگافون کے ذریعے صرف یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو حضرات امریکہ کا ویزہ لینے کے خواہشمند ہوں وہ ایک طرف ہو جائیں تو اس کے بعد جلوس میں جو چیز نظر آئے گی اسے آسان اُردو میں بھگدڑ کہا جاتا ہے۔

اندرونِ شہر!

اندرونِ شہر رہنے والوں کے کچھ مسائل تو وہ ہیں جن سے ہم سب واقف ہیں لیکن کچھ مسئلے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق محض اندرون شہر ہی سے نہیں بلکہ وہ پوری قوم کی سائیکی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میری عمر کا ایک حصہ وزیر آباد میں گزرا ہے۔ پورا وزیر آباد ''اندرون شہر'' تھا اور اس خوبصورت قیام کی یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں لیکن یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ نئے دور میں پرانے قصبوں کو یاد کرنا ان کے حوالے سے جانے جانا کچھ اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے معاشرے میں بنی بنائی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میرے ایک دوست کی پیدائش بھائی پھیرو کی ہے۔ وہ اپنے کسی گناہ پر اتنے نادم نہیں جتنے اپنی پیدائش کے ذکر پر نادم نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی انہیں ان کا پرانا قصبہ یاد دلاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ شاید انہیں ان کی اوقات یاد دلائی جا رہی ہے۔ اگر کبھی پوری طرح ''کارنر'' ہو جائیں اور انہیں اپنی پیدائش کا اتا پتا بتانا ہی پڑے تو فرماتے ہیں ''میں لاہور کے ایک خوبصورت نواحی قصبے میں پیدا ہوا۔ بہت بھلا سا نام ہے اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا'' ایک دفعہ موصوف کی ایک کتاب شائع ہوئی جس پر انہوں نے اپنے کوائف میں لکھا ''میں پنجاب کے ایک غیر معروف قصبے میں پیدا ہوا'' حالانکہ یہ غیر معروف قصبہ پنجاب سے زیادہ معروف ہے۔ ان دنوں اس قصبے کا نام ''پھول نگر'' ہے جو میاں نواز شریف نے بطور وزیر اعظم اپنے ایک ساتھی رانا پھول محمد کی خدمات کے اعتراف کے طور پر رکھا تھا۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ میاں صاحب نے

بھائی پھیرو کا نام میرے دوست کی دلجوئی کے لیے تبدیل کیا ہے۔

گزشتہ روز ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے ''کیا عرض کروں بتاتے ہوئے شرم آتی ہے'' میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ وہ دلی دروازے میں مسجد وزیر خان کے پاس رہتے ہیں اور اس وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کی پریشانی کی وجہ لاہور میں پیپلز پارٹی کی عبرتناک شکست ہے۔ جس کے بعد انہوں نے اندرون شہر کے سارے ترقیاتی پروگرام ادھورے چھوڑ دیے ہیں۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا کہ اپنے ضمیر کے مطابق جو کام کیے جائیں ان کی قیمت تو ادا کرنا پڑتی ہے بلکہ جس کلمہ حق کے لیے آپ کو کوئی قربانی نہ دینا پڑے اس میں ضرور کوئی کھوٹ ہوتا ہے۔ کہنے لگے حضرت یہ بات نہیں ہے، اس قسم کی قربانی کے لیے تو ہم ہمہ وقت تیار ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری دو بچیاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ جب ان کی سہیلیاں پوچھتی ہیں کہ تم کہاں رہتی ہو تو وہ مارے شرم کے بتا نہیں سکتیں کہ وہ دلی دروازے میں رہتی ہیں اور جب کبھی انہیں حقیقت حال بتانا پڑ جائے تو ان کی سہیلیوں کی نظریں بتاتی ہیں کہ وہ ان کی نظروں سے گر گئی ہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دلی دروازے میں میری حویلی ڈیفنس، گلبرگ اور شادمان کی کسی بھی کوٹھی سے بہتر طور پر آراستہ و پیراستہ ہے لیکن یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ رہتے تو ہم دلی دروازے ہی میں ہیں نا! مجھے ان صاحب کی یہ بات سن کر ہنسی آ گئی۔ جس پر وہ ملول ہو گئے اور کہا ''آپ ہنس سکتے ہیں مگر میں نہیں کہ میں دو بچیوں کا باپ ہوں اور میری بچیوں کے لیے کوئی مناسب رشتہ محض اس لیے نہیں آ رہا کہ ہم دلی دروازے میں رہتے ہیں۔''

اور پھر جب انہوں نے اس کی تفصیل بتائی کہ لڑکے والے کس طرح اندرون شہر کے نام سے بدکتے ہیں بلکہ لڑکیوں والے بھی اپنی بچیوں کو اندرون شہر بیاہنے سے گریز کرتے ہیں کہ اس سے برادری میں ان کی ناک کٹ جاتی ہے تو مجھے مسئلے کی نزاکت کا

احساس ہوا اور میں نے سوچا کہ جو قوم اندر سے اتنی کھوکھلی ہو جائے کہ اپنے پرانے گھروں پر فخر کرنے کی بجائے ان پر شرمسار نظر آئے، اس کے (کم از کم) ثقافتی مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے!

اب اگر آپ سچی بات پوچھیں تو یہ سارا مسئلہ مصنوعی طرزِ زندگی کا پیدا کردہ ہے۔ اس طرزِ زندگی کے طفیل معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اپنا باہر سجانے میں لگا رہتا ہے۔ جو لوگ اندر سے مضبوط ہوتے ہیں، وہ باہر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ باہر ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ شاعرِ مشرق و مغرب، حکیم الامت علامہ اقبالؒ بازار حکیماں اندرون بھاٹی گیٹ والے مکان کے تھڑے پہ دھوتی اور بنیان پہنے ایک ہاتھ سے کھجوری پنکھا جھلتے تھے اور دوستوں سے گپ شپ لڑاتے تھے۔ میں نے آئن سٹائن کی ایک تصویر دیکھی ہے جس میں موصوف نے ایک قلم اپنی جیب میں اڑسا ہوا ہے جس کی روشنائی کوٹ پر پھیلی ہوئی ہے۔ قمیض کا کالر مڑا ہوا ہے اور بال بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اندر دنیائیں آباد تھیں۔ چنانچہ باہر کی چکاچوند انہیں متاثر نہیں کر سکتی تھی اس کے برعکس جو لوگ روحانی طور پر اُجڑ جاتے ہیں وہ اپنے کھنڈروں پر شاندار کاغذی عمارتیں تعمیر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کاغذی عمارتیں ہوا و ہوس کے تھپیڑوں سے بار بار زمین بوس ہوتی ہیں۔ ان عمارتوں کے مکین اپنے جسم کی بو ختم کرنے کے لیے پرفیوم چھڑکتے ہیں۔ پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہیں لیکن اندر سڑاند ختم نہیں ہوتی۔ ایک صوفی نے تو لوگوں سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ انہیں یہ لوگ اصلی شکلوں میں نظر آتے تھے۔ یعنی سور، کتے، بھیڑیے اور سانپ کی صورت میں!

انسان جب اشیاء کو اپنا مطمع نظر بنا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ چیزیں اسے برتری عطا کریں گی۔ وہ اتنا ہی احساس کمتری میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اسے پرانی قدریں اچھی نہیں لگتیں۔ پرانے گھر اچھے نہیں لگتے، پرانے قصبے اچھے نہیں لگتے، نئے گھروں کے ڈرائنگ روموں میں چنگیریں لٹکانے سے، گاڑی میں بیٹھ کر پانی والے تالاب کا قلفہ

کھانے سے اور پٹھان کی ریڑھی سے خریدا ہوا سٹہ چبانے سے زمین کے ساتھ ناتہ نہیں جڑ جاتا۔ ''خلائی مخلوق'' ان ظاہرداریوں کے باوجود ''خلائی مخلوق'' ہی رہتی ہے۔ زمین سے مضبوط تعلق کے لیے زمین پر اترنا پڑتا ہے۔ ثقافت میں منافقت نہیں چلتی۔ سینکڑوں سال پرانے گھروں کے چہروں پر جو نور ہے اس کے لیے نئے گھروں اور نئی بستیوں کو بھی سینکڑوں برس انتظار کرنا پڑے گا۔ پرانے گھروں میں خوبصورت قدروں کے ساتھ زندگی گزارنے والے دوست احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے گھروں کی روشنی معاشرے میں تقسیم کریں کہ معاشرے کے نودولتیوں کو اس کی سخت ضرورت ہے۔

دیوارِ گریہ!

ایک سیاح اسرائیل کی سیاحت پر گیا۔ اس نے دیوار گریہ کے متعلق بہت سن رکھا تھا کہ یہودی وہاں جا کر زار و قطار گریہ کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں چنانچہ اس نے بھی وہاں جانے کی ٹھانی اور ایک راہگیر سے پوچھا کہ دیوار گریہ کہاں ہے؟ وہاں دیوار گریہ کو کچھ اور کہتے ہیں۔ چنانچہ راہگیر نے لاعلمی میں سر ہلایا۔ اس پر سیاح نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں جانا چاہتا ہے جہاں یہودی دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ اس پر راہگیر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے انکم ٹیکس کے دفتر چھوڑ آیا!

ان دنوں ہم لوگوں نے بھی آہ وزاری کے لیے اپنی اپنی دیوارِ گریہ تعمیر کر رکھی ہے اور اس ضمن میں ہماری مذہبی جماعتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، ان میں سے کسی کی دیوار گریہ ایران ہے، کسی کی لیبیا اور کسی کی سعودی عرب! ایک دیوار گریہ ہمارے جی ایچ کیو میں ہے۔ جہاں صاحبان اقتدار اور طالبان اقتدار گڑ گڑا کر معافیاں مانگتے ہیں اور آہ وزاری کرتے ہیں تاہم سب سے بڑی دیوار گریہ واشنگٹن میں ہے۔ اگر وہاں سے معافی مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جاتے ہیں۔ بصورت دیگر منزل دور ہو جاتی ہے۔ یہ وہ آستانہ ہے جہاں سے معافی ملتی ہے یا معین قریشی ملتا ہے اور اس کے وسیلے سے بے نظیر حکومت ملتی ہے۔ یہ ساری ذلتیں ہمیں اس لیے اُٹھانا پڑتی ہیں کہ ہم سے وہ ایک سجدہ ادا نہیں ہوتا جو آدمی کو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے۔ ہماری آنکھوں سے عرق انفعال کے وہ قطرے نہیں ٹپکتے جو شان کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے اور نتیجہ یہ کہ ہم در در دھکے کھاتے ہیں۔ اپنی اپنی دیوار گریہ پر حاضری دیتے ہیں لیکن اس سے صرف ہماری

ذلتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری مثال تو اس سردار جی کی ہے جو ایک چھپڑ میں ہاتھ ڈال کر اپنی گری ہوئی چونی تلاش کر رہے تھے اور ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ یا اللہ میری چونی مل جائے۔

ایک دوسرے سردار کا اُدھر سے گزر ہوا اور اس نے موصوف کو ڈانٹتے ہوئے کہا ''یہ تم نے کیا یا اللہ یا اللہ لگائی ہوئی ہے، واہ گرو کو مخاطب کیوں نہیں کرتے؟''

اس پر سردار جی نے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''میں ایک چونی کی خاطر اپنے واہ گرو کا ہاتھ چھپڑ میں نہیں ڈلوانا چاہتا'' ہماری قوم بھی چھپڑ کے کنارے بیٹھی ہوئی ہے اور اس نے اپنی گھٹیا خواہشات کے حصول کے لیے ان ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہاتھ ڈالا ہوا ہے۔ نہ اپنا ہاتھ ان پانیوں سے نکالتی ہے اور نہ اس سے مدد مانگتی ہے جس نے مدد مانگنے والوں کے لیے حوضِ کوثر کا وعدہ کیا ہوا ہے!

میں جب اقبال کو پڑھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، میں سوچتا ہوں کہ خدا نے کنول کا یہ پھول کن پانیوں میں اُگایا ہے؟ گزشتہ رات کلیات اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے میں ایک دفعہ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اقبالؒ اپنی گری پڑی ہوئی قوم کو کھینچ کر اپنی سطح پر لانا چاہتا ہے لیکن قعرِ مذلت میں گرے ہوئے قوم کے سبھی طبقے اسے کھینچ کر اپنی سطح پر لانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہم کلیاتِ اقبالؒ میں سے اپنے سائز کا اقبال تلاش کرتے ہیں اور پھر اسے محفلوں میں لیے پھرتے ہیں۔ اقبالؒ وہ جن ہے جس کا قد آسمان سے باتیں کر رہا ہے اور جس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھ کر ہمیں اپنی کوتاہ قامتی کا احساس ہونے لگتا ہے چنانچہ ہم جنتر منتر پڑھ کر اس جن کو مکھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح پرانی داستانوں میں کوئی مکروہ جادوگر کسی خوبصورت شہزادے کو مکھی بنا کر بوتل میں قید کر دیتا ہے۔ اقبالؒ ممولے کو شہباز سے لڑانا چاہتا ہے لیکن ممولوں کو چھوڑیے ہمارے جو شہباز ہیں وہ خود ممولے بنے ہوئے ہیں اور لڑائی کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ اقبالؒ ذہنوں کو کشادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دماغ کو کام کرنے کی اجازت دینی

چاہیے لیکن ہم دولے شاہ کے چوہے بننے پر اصرار کرتے ہیں۔
اقبال کو مُلّا سے کیوں چڑ ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنے سے بڑے ملا کی سند تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے اور یوں اس کا ذہن کشادہ نہیں ہو پاتا ع

فقیہہ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!

یہ کشادگی وہ ہے جس سے کوئی ایک طبقہ نہیں، قوم کے سبھی طبقے محروم ہو چکے ہیں، عدالت عالیہ ایک صریحاً ناانصافی کے خلاف اپنا تاریخی فیصلہ دیتی ہے۔ ایک ایسا فیصلہ جو عدالت عالیہ کے ان ججوں کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنا فیصلہ بدل کر بہت سے فائدے اُٹھا سکتی ہے لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج کی پڑھی ہوئی قیادت اس پر سیخ پا ہو جاتی ہے اور چمک چمک کے نعرے لگانے لگتی ہے۔ یہی حال قوم کے دوسرے طبقوں کا ہے۔ ہم اختلافی رائے سن ہی نہیں سکتے۔ ہمارا ایک محدود نقطہ نظر ہے جو محدود خواہشات سے پیدا ہوا ہے۔ جو اس کے منافی بات کرتا ہے وہ گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ ہماری قوم دنیا کی شاید واحد قوم ہے جو پوری زندگی اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کرتی ہے دوسرے ہاتھ سے کھجلاتی رہتی ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ دائیں ہاتھ کو اہمیت دیتے ہیں اور کچھ بائیں ہاتھ کو چنانچہ پوری قوم دائیں اور بائیں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ خدا جانے ملک وقوم کی ترقی کے لیے ہم دونوں ہاتھ استعمال کیوں نہیں کرتے، ہمیں ٹنڈا کہلانے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ جھگڑا لیفٹ رائٹ میں نہیں، رائٹ اور رانگ میں ہونا چاہیے! اگر کوئی شخص پاکستان پر ایمان رکھتا ہے اور یہاں اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق نظام نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ اگر کسی شخص کے ذہن میں پاکستان کو خوبصورت بنانے کا کوئی نقشہ ہے اور ہمیں اس کی جزئیات سے اختلاف ہے تو بھی ہمیں اس کی بات پورے تحمل سے سننا چاہیے لیکن اگر کوئی شخص برصغیر کے مسلمانوں کی اس عظیم پناہ گاہ کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس سے مفاہمت نہیں ہو سکتی۔

اخبارات اگر ایسے لوگوں یا ایسی جماعتوں کو پروجیکٹ کرتے ہیں تو وہ گناہ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک شخص کتے کی زنجیر تھامے بازار سے گزر رہا تھا اس کے ایک واقف نے اسے روکا اور کہا ''یہ کتا مجھے خاصی گھٹیا نسل کا لگتا ہے؟'' کتے والے صاحب نے کہا ''نہیں، یہ بہت اعلیٰ نسل کا کتا ہے'' واقف کار نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ''اے ڈاگ از نون بائی دی کمپنی ہی کیپس''

اب یہ کام قوم کا ہے کہ وہ دیکھے کہ کس کے گلے میں کس کا پٹا ہے، ابھی گزشتہ ہفتے لندن میں، میں نے سلیم قریشی کی کتاب ''غداروں کے خطوط'' پڑھی ہے۔ اس میں جنگ آزادی کے ان غداروں کے خطوط شامل ہیں جو باقاعدہ حکومت میں شامل تھے اور انگریز فوجیوں کو حریت پسندوں کی فہرستیں فراہم کرتے تھے جس کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سو سال بعد اقبالؒ اور قائدِاعظم کی کوششوں سے ایک بار پھر ہمیں اس خطے میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا موقع ملا ہے۔ خدا کے لیے اب غداروں سے ہوشیار رہیں، ان کے چہرے کی پلاسٹک سرجری پر نہ جائیں ان کی چکنی چپڑی باتوں پر کان نہ دھریں صرف یہ دیکھیں کہ انہوں نے ماضی میں کیا کیا ہے اور ان دنوں کیا کر رہے ہیں اگر تحریک آزادی کشمیر سبوتاژ ہوتی ہے، ایٹمی پلانٹ کو کچھ ہوتا ہے، پاکستان کے خلاف کوئی سازش ہوتی ہے تو پاکستانی قوم اب اپنے غداروں کو معاف نہیں کرے گی۔ مجھے قاضی حسین احمد کی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ ملکی سلامتی کی سو فیصد ذمہ داری فوج پر عائد ہوگی۔ چنانچہ اگر ان کی موجودگی میں کوئی گڑبڑ کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی سو فیصد فوج پر عائد ہوگی۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا ہے تو یاد رکھیں پورے برصغیر میں کوئی ایسی دیوار گریہ نہیں ہے جس سے لپٹ کر ہم روسکیں۔ شانِ کریمی بے غیرتی کے آنسو موتی سمجھ کر نہیں چنا کرتی، انہیں کھولتے ہوئے پانیوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور جہنم کے اس تالاب میں گناہ گار اور ان کی آنے والی نسلیں ابد تک قیام کرتی ہیں۔ وما علینا الا البلاغ

(مرکزیہ مجلس اقبالؒ کے زیر اہتمام لاہور میں منعقدہ یوم اقبالؒ کے جلسے میں پڑھا گیا)

بس ذرا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے!

''یار تم نے کبھی بلیک کافی پی ہے؟''
''لاحول ولا، بھلا یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟''
''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، صرف ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے۔ خود مجھے شروع میں زہر لگتی تھی، اب اس میں دودھ کی ملاوٹ کروں تو منہ کڑوا ہو جاتا ہے''
''ایک دفعہ میں نے ایک ڈرامے میں اطہر شاہ خان کو دیکھا، موصوف چائے میں مولی ڈبو کر کھا رہے تھے اور چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ خاصا انجوائے بھی کر رہے ہیں، یقیناً انہوں نے بھی اس ضمن میں اپنا ٹیسٹ ڈویلپ کیا ہوگا۔''
''کیوں نہیں، آپ خود کو جس چیز کا چاہیں عادی بنا سکتے ہیں، حتیٰ کہ شکلیں سہنے کی عادت پڑ جائے تو وہ بھی آسان ہو جاتی ہیں''
''یہ ہم کس بحث میں پڑ گئے؟ تم یہ بتاؤ آج کل اخبارات پڑھ رہے ہو؟''
''اس کے بغیر تو میری صبح ہی نہیں ہوتی، لیکن کیا بات ہے؟''
''یہ سیاست دان ایک دوسرے کے لیے بازاری زبان کیوں استعمال کر رہے ہیں؟''
''تو اس میں کیا حرج ہے؟''
''ہمارے قائداعظم اور ان کے بعد آنے والے لیڈر تو یہ زبان استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اب تو خواتین سیاستدان بھی ایسی زبان استعمال کرتی ہے کہ کان کی لویں

سرخ ہو جاتی ہیں!"

"تمہیں یہ سب کچھ عجیب کیوں لگتا ہے؟"

"بھئی اس لیے عجیب لگتا ہے کہ یہ سب کچھ عجیب ہے"

"اس میں کچھ بھی عجیب نہیں، صرف ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی بات ہے، اس کے بعد تم یہ گالیاں سنا کر بے مزہ نہیں ہو گے، غالب کے رقیب نے اس ضمن میں اپنا ٹیسٹ خاصا ڈویلپ کیا تھا، تبھی تو غالب نے کہا تھا ؎

کتنے شیریں ہیں ان کے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

"اور یہ جو سیاست میں لوٹا پارٹی آ گئی ہے؟"

"یہ تمہیں کیا کہتی ہے؟"

"کہتی تو کچھ نہیں، صرف منہ پر چپت مارتی ہے کہ تم نے ووٹ مجھے کسی اور پارٹی کے لیے دیے تھے، میں تمہارے مخالفوں سے نوٹ لے کر ان کی پارٹی میں چلا گیا ہوں، کیا قومی نقطہ نظر سے یہ بات شرمناک نہیں"

"ہاں شروع شروع میں لگتی ہے!"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد قوم کا جب ٹیسٹ ڈویلپ ہو گا، انہیں نہ صرف یہ کہ ان لوٹوں پر پیار آنے لگے گا بلکہ قوم کا ہر فرد لوٹا بننے کی کوشش کرے گا"

"کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

"میں نے تمہیں کہا نا کہ اچھی یا بری کوئی چیز نہیں ہوتی، تمہیں یاد ہے جب تم نے پہلی دفعہ میرے سامنے کوکا کولا پی تھی، اس بدمزہ مشروب کی وجہ سے تمہیں اچھو لگ گیا تھا، اب دن میں تم دس دس بوتلیں پی جاتے ہو، صرف ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی بات ہے!"

''یہ جمعیت مشائخ والے بھی لوٹوں کے ضمن میں قوم کا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''کل اخباروں میں ان کے احتجاجی جلوس کی تصویریں شائع ہوئی ہیں جو انہوں نے لوٹوں کی بے حرمتی کے خلاف نکالا۔ان کے اخباری لیڈر نے تو یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر لوٹے جیسی مقدس چیز کی توہین کا سلسلہ جاری رہا تو جمعیت المشائخ اس رویے کے خلاف ایجی ٹیشن کا آغاز کرے گی۔جلوس میں شامل ''مشائخ'' نے اپنے سینوں کے ساتھ لوٹے چمٹائے ہوئے تھے''

''اب یہ تم اپنے مسخرے پن کا مظاہرہ کرر ہے ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ اخبار تمہارے سامنے پڑا ہے،خود دیکھ لو اور مجھے بتاؤ کہ ہمارے مشائخ کبھی ایسے بھی ہوتے تھے''

''ہوتے تو نہیں تھے لیکن آج کل بازار میں ایسے ہی آ رہے ہیں، ویسے آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا''

''وہ کیسے؟''

''جب مشائخ کے ضمن میں قوم کا ٹیسٹ ڈویلپ ہوگا۔اب دیکھو نا شروع شروع میں کسی قریبی مسجد کے لاؤڈ سپیکر خلق خدا کو کس درجہ آزار دیتے تھے، نہ تم سکون سے کھانا کھا سکتے تھے، نہ تلاوت کر سکتے تھے نہ پڑھائی کر سکتے تھے، نہ آپس میں بات چیت کر سکتے تھے، نہ سو سکتے تھے اور نہ جاگ سکتے تھے''

''تو کیا اب یہ سب کچھ کر سکتے ہیں'؟''

''نہیں کر سکتے ، یہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں، لیکن اس سلسلے میں قوم کا ٹیسٹ اتنا ڈویلپ ہو گیا ہے کہ اب اگر کبھی مسجد کے لاؤڈ سپیکر چیخنا بند کر دیں تو لوگ گھبرا کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں کہ اللہ خیر کرے! مولوی صاحب تو خیریت سے ہیں؟ اب تم دیکھ لو

ہماری قوم نے ملاوٹ شدہ اشیائے خوردنی کے ضمن میں ٹیسٹ اتنا ڈویلپ کیا ہے کہ خالص خوراک ہضم ہی نہیں کرسکتی" دودھ میں نلکے کے پانی کی ملاوٹ بھی راس نہیں آتی جب تک اس میں چھپڑ کا پانی نہ ملا ہو یہ ہضم ہی نہیں ہوتا، ایک دفعہ میرے ایک دوست نے داتا صاحبؒ کے لنگر سے ایک گلاس خالص دودھ پی لیا، امراض معدہ کا اس بری طرح شکار ہوا کہ ایک مہینہ ڈاکٹر سعید کھوکھر کے پاس جاتا رہا، لہٰذا ہمارے مشائخ اگر لوٹوں کا دفاع کررہے ہیں تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، کل کو تم ان کے شکرگزار نظر آؤ گے، صرف ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے!"

"اور یہ جو مولانا فضل الرحمٰن ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"یہ تم مولانا کو کہاں درمیان میں لے آئے، وہ نہ لوٹے ہیں، نہ مشائخ میں سے ہیں بلکہ ان کے حریفوں کے بقول وہ تو مولانا ہی نہیں ہیں۔"

"موصوف نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ پاکستان فراڈ اعظم ہے اور اگلے روز انہیں پاکستان کے امور خارجہ کی کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔"

"تو اس سے کیا ثابت ہوا؟"

"ثابت کیا ہونا تھا، مایوسی ہوتی ہے اور غصہ آتا ہے کہ جو شخص پاکستان کے وجود کو فراڈ کہتا ہے، اسے پاکستان کے مفادات کی رکھوالی پر رکھ لیا جاتا ہے۔"

"غلام مصطفیٰ کھر پر را کی ایجنٹی کا الزام نہیں تھا؟"

"وہ ان دنوں وفاقی وزیر ہیں، جام صادق بھی مشکوک آدمی تھے، وہ سندھ کے وزیراعلیٰ رہے، ارباب نیاز احمد راولپنڈی سازش کیس میں شامل تھے، وہ مرکزی وزیر رہے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ دراصل پاکستانی قوم کی اکثریت ان فروعی مسائل سے بہت بالا ہو چکی ہے۔ اب یہ بات طے ہے کہ پاکستان پر حکومت کرنے کے لیے پاکستان کا وفادار ہونا ضروری نہیں۔ اس ضمن میں ہم جیسے لوگوں کو بھی اپنا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے، پھر تمہیں بھی یہ سب رہنما اچھے لگیں گے۔"

''ہم نے ۱۹۷۰ء میں اپنا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں ملک ٹوٹ گیا تھا، آج پھر سیاست کی باگیں ان عناصر کے ہاتھوں میں ہیں جن پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا!''

''کیا تم اپنے آپ کو فوج سے زیادہ محب وطن سمجھتے ہو؟''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''کیا فوج جس پر ملکی سالمیت کی ذمہ داری ہے، نہیں جانتی کہ ملک خطرے میں ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ اب سیاست دان نئی طرز کے ہیں، علماء وکھری ٹائپ کے ہیں، مشائخ اور طرح کے ہیں، صاحبان اقتدار نئے رنگ کے ہیں، مقتدر طبقہ کچھ اور طرح کی سوچ کا ہے۔ ان سب میں کوئی عیب نہیں، صرف اپنا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ باقی ملک بھی ٹوٹ جائے گا۔ شروع شروع میں تمہیں یہ سانحہ محسوس ہوگا مگر ذرا ٹیسٹ ڈویلپ کرنے کی بات ہے، آخر ۱۹۷۰ء میں بھارتی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی تو ہم زندہ ہیں، بائی دی وے اس سانحے سے ہماری صحتوں پر کیا فرق پڑا تھا جو، اب پڑے گا؟''

وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی!

''یار مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم کسی زمانے میں خاصے خوددار شخص ہوا کرتے تھے''
''ہاں تھوڑا تھوڑا مجھے بھی یاد ہے''
''لیکن اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''
''ہونا کیا ہے؟ عقل آ گئی ہے۔ تم نے محمود سرحدی کا وہ شعر نہیں سنا؟

جھکنے والوں نے رفعتیں پا لیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

''تو گویا ان دنوں پھر رفعت کے چکر میں ہو!''
''یہ رفعت وہ نہیں، یہ بلندی کے معنوں میں ہے، وہ رفعت تو میرے زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے جب میں عشق کے چکروں میں پڑا ہوتا تھا۔ یار میں بھی کتنا بے وقوف تھا، اُن کاموں میں وقت ضائع کرتا تھا جن میں دھیلے کا فائدہ نہیں تھا''
''اب اگر کہیں عشق کرو تو ایسی جگہ کرنا جہاں چار پیسے بھی بچ سکتے ہوں''
''یہ تم نے اپنی طرف سے طنز کیا ہو گا؟''
''میری کیا مجال ہے کہ میں تم پر طنز کروں، میں نے تو تمہارے خیالات سے فقط نتیجہ اخذ کیا ہے''
''تم نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے، یہ شاعری، یہ ادب، یہ مصوری، یہ فنون لطیفہ سب واہیات چیزیں ہیں، اب تم خود ہی بتاؤ جن دنوں میں ان لغویات میں اُلجھا ہوا تھا،

سوائے دن رات جاگنے کے مجھے ان سے کیا حاصل ہوتا تھا؟''

''لوگ عزت کرتے تھے''

''اب لوگ میری عزت نہیں کرتے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑا؟''

''اس کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے!''

''تمہارے پاس میری کسی بات کا بھی جواب نہیں ہے، اب میں عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوں، قیمتی کار میرے نیچے ہے، بینک بیلنس ہے، جدھر سے گزرتا ہوں لوگ سلام کرتے ہیں''

''میں نے عزت کی بات کی تھی!''

''پھر وہی عزت عزت، یہ تم جیسے احمقوں کا مسئلہ ہے۔ چلو تم مجھے ایک بات بتاؤ''

''پوچھو''

''ایک عزت دار شخص جب دفتر جانے کے لیے ویگن میں بکری بن کر سفر کرتا ہے، اس کی کیا عزت رہ جاتی ہے؟ جب وہ تھانے جاتا ہے اور اسے کرسی ملنے کی بجائے جھاڑیں پڑتی ہیں تو کیا وہ پھر بھی معزز رہتا ہے؟ جب اس کا بچہ بیمار ہو تو کیا وہ عزت سے دوا خرید سکتا ہے؟ کیا دو ہزار روپے ماہوار میں دس روپے کی عزت ڈال کر گھر کا خرچ چلایا جا سکتا ہے؟ کیا عزت سے......؟''

''بس کرو، میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں، تمہارا مطلب یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے انسان کو تمام اصول اور اخلاقی قدریں پسِ پشت ڈال کر وہ کچھ کرنا چاہیے جو اس وقت ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے؟''

''بالکل!''

''کیا اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ خوش ہے؟''

''یہ خوشی کیا ہوتی ہے؟''

''خوشی اس چیز کو کہتے ہیں جس سے تم محروم ہو چکے ہو''

''یہ سب لفظی ڈھکوسلے ہیں اور غریب غرباء کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ فرسودہ اور بے معنی فلسفے بھی میرے جیسے لوگوں نے گھڑے ہیں کہ ایک اصلی خوشی ہوتی ہے، ایک نقلی خوشی ہوتی ہے۔ تمہاری اصلی خوشی کے حصول کے لیے میں رفعت کے والدین کی منتیں کرتا رہا کہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو مگر ان کا جواب تھا کہ تمہارے پاس تو اپنا گھر تک نہیں ہے۔ اب رفعت میری زندگی میں نہیں ہے لیکن اس سے مجھے کیا فرق پڑا؟ میں بہت خوش ہوں۔''

''تم خوش نہیں ہو اور نہ وہ طبقہ خوش ہے جس سے تم نے اپنا ناتہ جوڑ لیا ہے۔ اس کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں، جب پورا معاشرہ مال و دولت اور سہولتوں کے حصول کے لیے مار دھاڑ میں مشغول ہو جاتا ہے، اخلاقی اور روحانی قدروں کو پامال کرنے لگتا ہے، زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے ایک دوسرے کو پاؤں تلے کچلنا شروع کر دیتا ہے تو اس کا خمیازہ تو سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک معاشرے کے افراد تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں اور ان کے جسم اور روحیں زخمی نہ ہوں، تم نے ظفر اقبال کا وہ شعر نہیں سنا ؎

یہ شہر وہ ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں
داد ستم نہ دے کہ ستم گر بھی خوش نہیں

''سنا ہوا ہے یہ شعر اور اس شعر پر خود ستم گروں کو داد دیتے بھی دیکھا ہے لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ غیر منصفانہ نظام میں سچی خوشی نہ غریب کو حاصل ہوتی ہے اور نہ امیر کو۔ ایک غریب آدمی ہزار سختیاں سہنے کے باوجود گناہ آلود زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے ضمیر کا اطمینان اور اس کے حوالے سے سچی خوشی کے چند لمحات بھی حاصل کرسکتا ہے لیکن امیر آدمی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ اس امیر آدمی کی دولت پر مختلف محکموں کے ان اہلکاروں کی نظریں ہیں جو اسی کی طرح تمام اخلاقی و

روحانی اقدار کو پامال کر کے خود امیر بننا چاہتے ہیں چنانچہ اسے اپنی دولت کی حفاظت اور اس کی افزائش کے لیے ایک ایسے حمام میں داخل ہونا پڑتا ہے جس میں کپڑے باہر اُتارنا پڑتے ہیں۔ دولت کی ہوس انسان کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں ہر جھوٹ کو سچ اور ہر سچ کو جھوٹ ماننا پڑتا ہے، جہاں ظالموں کا ساتھ دینا ہوتا ہے اور مظلوموں کو تسلیاں دینا ہوتی ہیں، جہاں وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو غریبوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو اس طبقے کے محسنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے غیر انسانی ماحول میں کوئی پیشہ ور قاتل ہی خوش رہ سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم پیشہ ور قاتل نہیں ہو۔''

''میں قاتل کہاں ہوں، میں تو خود مقتول ہوں، مجھے رفعت کے والدین نے......''

''تم تو رونے لگ گئے ہو، میں نہیں جانتا یہ آنسو اس مشروب کا نتیجہ ہیں جو تم اب دن کو بھی پینے لگے ہو یا تمہیں ان کامیابیوں پر رونا آ رہا ہے جو تم نے لاکھوں زندگیوں کو ناکام بنا کر حاصل کی ہیں۔''

''مجھے رفعت یاد آ رہی ہے۔''

''رفعت تم سے اور تم رفعت سے بہت دور نکل چکے ہو، اس کے باوجود میرے دوست، یہ آنسو سنبھال کر رکھنا، یہ تمہاری زندگی کی بہترین متاع ہیں، جس دن تم ان آنسوؤں سے بھی محروم ہو گئے، اس دن تم بالکل کنگلے ہو جاؤ گے اور ہو سکے تو اپنی زندگی کے اس رُخ کو بھی یاد کرو جب تم اپنے اندر کی دنیا کو روشن کرنے کے لیے ایسے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے جو دوسروں کی دنیا بھی روشن کر دیتے ہیں، جن چراغوں کو تم حقیر سمجھ کر بجھا چکے ہو، تمہاری زندگی میں انہیں چراغوں سے روشنی ہو گی!''

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

✧ ✧ ✧

یا اللہ، صبح عید ہو جائے!

ایک میراثی نے لوگوں کے اصرار پر پہلا روزہ رکھ تو لیا مگر اس کے بعد نباہنا مشکل ہو گیا، لوگ سارا دن اسے تسلی دیتے رہے، مولوی صاحب نے بھی اسے سمجھایا کہ روزے کی بہت برکات ہوتی ہیں جن میں سے ایک یہ کہ افطار کے وقت جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔ شام کو افطار کے بعد میراثی نے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی اور دعا مانگی ''یا اللہ صبح عید ہو جائے!''

میرے ایک دوست نے جو میراثی نہیں، خیر سے نیازی ہیں، اس ماہ رمضان میں پہلا روزہ رکھا، میرا مطلب ہے اپنی ۴۵ سالہ زندگی میں پہلا روزہ رکھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتے تھے۔ خیر جیسے تیسے دن گزرا، افطاری کی ساعت سعید آن پہنچی، اس کے بعد لمبی تان کر سو گئے اب وہ روزے کے قریب نہیں پھٹکتے تاہم وضعدار مسلمان ہیں، اس کی توجیہہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ گھر میں سب روزہ دار ہیں، افطاری کے لیے چاٹ بنائی جائے یا کھانا پکایا جائے تو نمک مرچ چکھنے والا کوئی نہیں ہوتا چنانچہ جس روز انہوں نے روزہ رکھا، اس روز سب کو بدمزہ کھانا زہر مار کرنا پڑا، لہٰذا وہ روزہ داروں کی خاطر روزہ نہیں رکھتے۔ ان کا یہ بیان سننے کے بعد میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، انہیں سیاست میں جانا چاہیے کیونکہ ہمارے سیاست دان بھی جو کرتے ہیں، وہ قوم کی فلاح و بہبود کی نیت ہی سے کرتے ہیں، ہم لوگ ان بچاروں کو رخواہ مخواہ الزام دینے میں لگے رہتے ہیں!

ایک اور دوست جو پچاس کے پیٹے میں ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے بچے روزہ رکھتے ہیں لیکن وہ نہیں رکھتے، ان کے ایک بچے نے انہیں کہا ''ابو آپ چڑی روزہ ہی رکھ لیا کریں'' مگر انہیں یہ گوارہ نہیں کہ جو سہولت صرف بچوں کے لیے ہے، وہ اس سے استفادہ کریں چنانچہ وہ صرف اسی سہولت کو اپنے لیے روا سمجھتے ہیں جو نیازی صاحب نے پہلے روزے کے بعد سے اپنے لیے مستقلاً روا رکھی ہوئی ہے!

روزہ داروں کی ایک اور قسم بھی ہے۔ یہ لوگ روزے بھی رکھتے ہیں، پنج وقت نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن تجارت کے فروغ کے لیے مختلف محکموں کے اہلکاروں کے جو ماہانے انہوں نے مقرر کر رکھے ہیں، وہ بھی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اگر مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں مکس کر کے بیچتی ہیں تو یہ سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، بلیک کرنے میں بھی لگے رہتے ہیں۔ اگر سمگلنگ کا شوق ہے تو یہ بھی پورا ہوتا رہتا ہے تاہم ان میں سے جو زیادہ دیندار ہیں وہ یہ سب کام افطاری کے بعد کرتے ہیں۔

میں تو ان دنوں اخباروں میں ایک فیچر تلاش کر رہا ہوں جو ہر ماہ رمضان میں باقاعدگی سے اور بڑی بڑی رنگین دیدہ زیب تصویروں کے ساتھ شائع ہوتا ہے، یہ فلمی ایکٹرسوں کے حوالے سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے اخبار کے لیے بطور روزہ دار ماڈلنگ کی ہوتی ہے، سر پر دوپٹہ، آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر لپ اسٹک ہوتی ہے، افطاری کا سامان سامنے سجا ہوتا ہے اور کھجور لب لعلیں کے قریب لے جا کر تصویر کھنچوائی ہوتی ہے، اللہ جانے ان اداکاروں کا روزہ کیمرے کے سامنے دن کے کتنے بجے کھلتا ہے یا ان کا مقصد صرف دوسروں کا روزہ مکروہ کرنا ہوتا ہے، نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے البتہ یہ فلمی حسینائیں ماہ محرم میں بھی کالے کپڑے پہن کر، گورے گورے ہاتھ ماتمی انداز میں سینے پر رکھے سر پر کالا سیاہ دوپٹہ اوڑھے جو تصویریں کھنچواتی ہیں، میں نے اس سے بہت سے سوگواروں کو بہت زیادہ سوگوار ہوتے دیکھا ہے!

ہمارے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ خود روزہ نہیں رکھتے لیکن دونوں

ہاتھوں سے نیکیاں کمانے میں لگے رہتے ہیں، انہوں نے کسی سے سن لیا ہے کہ روزہ دار کو روزے کے دوران جتنی زیادہ سختیاں اُٹھانا پڑیں، اس کے ثواب میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے چنانچہ یہ ان کی سختیوں میں اضافہ کرنے اور ان کے ثواب میں حصے دار بننے کے لیے رضا کارانہ طور پر اشیائے خورد ونوش کی قیمتوں میں اضافہ کردیتے ہیں جس سے اس موسم سرما میں بھی روزہ داروں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مثبت کردار پھل فروشوں کا ہے جنہوں نے پھل کی قیمتوں میں کم از کم تین گناہ اضافہ کردیا ہے اور یوں ان دکانداروں کے لیے نیکیاں کمانے کے حوالے سے رمضان کا مہینہ ''لوٹ سیل'' کا مہینہ ہے۔ یہ دردمند دکاندار افسر شاہی کے سخت خلاف ہیں چنانچہ جو افسر قیمتوں پر کنٹرول کے ذمہ دار ہیں انہیں ثواب سے محروم رکھنے کے لیے پھلوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے ان کی ڈیوڑھی میں بھیج دیتے ہیں اور اس کی زیادہ تو کیا، سرے سے کوئی قیمت ہی وصول نہیں کرتے!

نیکیاں کمانے کا یہ رجحان صرف پھل فروشوں تک محدود نہیں بلکہ روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے کے لیے عام دکانداروں کے علاوہ سیاسی دکاندار بھی پوری طرح سرگرم عمل ہیں، ان کے بیانات، ان کا عمل اور ان کے رویے روزہ داروں کو اذیت دینے کا سبب بن رہے ہیں جس سے روزہ داروں کے ثواب میں دھڑا دھڑ اضافہ ہورہا ہے۔ تاہم ہر طبقے میں کچھ بے صبرے بھی ہوتے ہیں، کل میں نے اسی قسم کے ایک بے صبرے کو افطاری کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگتے دیکھا، وہ کہہ رہا تھا ''یا اللہ صبح عید ہو جائے'' لیکن اس طرح کی دعائیں کہاں قبول ہوتی ہیں، گزشتہ ۴۵ برس سے ہم لوگ سچی عید کو ترسے ہوئے ہیں، ہماری قوم ''روزِ عید'' کی دعا مانگتی ہے اور اس کی تعبیر ''شبِ عاشورہ'' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

✧ ✧ ✧

تصویریں!

تصویریں انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ کسی اُداس لمحے میں آپ اپنی البم کی ورق گردانی کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ گزرے برسوں میں، میں نے کیا کھویا کیا پایا؟ کیا بڑھاپے کی ایک تصویر جس میں آپ وزیراعظم سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے اپنی بتیسی کو بھی باہر گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہوں، جوانی کی اس تصویر سے بہتر قرار دی جاسکتی ہے جس میں آپ گنے کی گانٹھیں چوستے ہوئے ہنس ہنس کر کسی دوست سے باتیں کر رہے ہوں؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ لوگ اس کا جواب ہاں میں بھی دے سکتے ہیں مگر یہ وہ لوگ ہوں گے جو زندگی کی مصنوعی خوشیوں سے خوش ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔ میں نے گزشتہ روز ایک دفعہ پھر اپنے بچپن کی وہ مضحکہ خیز تصویر دیکھی جس میں، میں باورچی خانے میں دودھ پر سے ملائی اُتار کر کھا رہا ہوں، عین اس موقع پر میری یہ تصویر اُتار لی گئی تھی جو آج بھی گھر میں مجھے ''بلیک میل'' کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ میں کبھی بھی اس تصویر سے ''بلیک میل'' نہیں ہوا بلکہ یہ تصویر دیکھ کر میرے چہرے پر ہمیشہ ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

میرے ایک بزرگ دوست ہیں، ان سے کبھی سر راہے ملاقات ہو یا فون پر ان سے گفتگو ہو تو میں ان سے رسماً پوچھتا ہوں ''کیا حال ہے؟'' ماشاء اللہ میرا مقصد ان کی خیریت دریافت کرنا نہیں ہوتا لیکن وہ ہمیشہ جواب میں یہی کہتے ''پہلے سے بہتر ہوں''

اس پر مجھے ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ''پہلے'' آپ کو کیا تھا، جس پر وہ ایک تفصیلی ''ہیلتھ بلیٹن'' جاری کرتے ہیں اور اپنے حوالے سے ایسی ایسی بیماریوں کا انکشاف کرتے ہیں جن میں بیشتر کو صیغہ راز میں رکھنا شرفاء کے نزدیک احسن فعل ہے۔ ایک روز میں نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اپنی جوانی کے دور کی البم دکھائیں، وہ بہت خوش خوش اندر گئے اور البم اُٹھا لائے۔ انہوں نے پہلا ورق اُلٹا اور بتایا کہ یہ ان کی سولہ سال کی عمر کی تصویر ہے جب انہیں پہلی دفعہ دمے کا دورہ پڑا تھا تاہم یہ ان کا اپنا اندازہ تھا کیونکہ ڈاکٹروں کے مطابق جلدی میں کوئی چیز نگلنے کی کوشش میں انہیں صرف اچھو ہوا تھا۔ ان کی دوسری تصویر بیس برس کی عمر کی تھی، اس میں وہ جوان رعنا لگ رہے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ دیکھنے میں ایسے لگ رہے ہیں ورنہ آئینے میں روزانہ وہ خود کو بیمار محسوس کرتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک تصویر دکھائی یہ تصویر ان کے پچیسویں سال کی یاد دلاتی تھی، اس میں وہ بہت پلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے مگر انہوں نے بتایا کہ اس عمر میں ان کے بازو پر ایک گلٹی نکلی جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ یہ کینسر ہے، یہ گلٹی آج بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر آج بھی اسے ایک بے ضرر گلٹی قرار دیتے ہیں، یہ بزرگ آج بھی اپنی رائے پر قائم ہیں کہ یہ کینسر ہے اور ایک نہ ایک دن یہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوگا۔ میں نے انہیں ایک گلوکارہ کا واقعہ سنایا جو اپنے کسی مہمان کو اپنے پرانے گانوں کی کیسٹ سنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھی کہ یہ گانا اس نے اس وقت گایا جب اس کا فلاں بچہ اس کے پیٹ میں تھا اور یہ گانا اس وقت جب فلاں بچی پیٹ میں تھی جب گلوکارہ چار گانوں کے حوالے سے چار بچوں کے پیٹ میں ہونے کا احوال بیان کر چکی تو مہمان نے اگلا گانا سننے سے پیشتر گلوکارہ سے کہا ''آپ براہِ کرم مجھے کوئی ایسا گانا سنائیں جو آپ نے خالی پیٹ گایا ہو!'' یہ واقعہ سن کر بزرگ بہت ہنسے مگر میں نے ساتھ ہی عرض کیا کہ آپ بھی براہِ کرم مجھے اپنی جوانی کی کوئی ایسی تصویر دکھائیں جس کے ساتھ آپ کی کوئی خوشگوار یاد وابستہ ہو، یہ سن کر وہ اندر گئے اور اپنی شادی کی تصویر اُٹھا لائے حالانکہ میں

نے ان سے واضح طور پر کسی خوشگوار لمحے کی فرمائش کی تھی۔ جب میں ان سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہونے لگا تو انہوں نے میری آمد کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''تمہارے آنے سے میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں'' میں نے قطعاً نہیں پوچھا کہ اس سے پہلے آپ کیا محسوس کر رہے تھے کہ مجھے ذرا جلدی ایک جگہ پہنچنا تھا جبکہ ان کے ہیلتھ بلیٹن کا دورانیہ ایک گھنٹے سے کم نہیں ہوتا!

یہ بزرگ کا احوال تو یونہی درمیان میں آ گیا ورنہ تصویریں بہت کچھ بتاتی ہیں تصویریں آپ کو ''یادِ ایامِ عشرت فانی'' کی کہانی سناتی ہیں، تصویریں آپ کو ؎

غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

والا شعر بھی یاد دلاتی ہیں دراصل ماضی کی تصویریں حال سے منسلک ہوتی ہیں اور حال کی مستقبل سے اور یوں میرے نزدیک البم انسان کے اُستاد کا درجہ رکھتی ہے۔ خوشیوں اور غموں کے بارے میں صحیح فیصلوں اور غلط فیصلوں کے بارے میں صحت اور بیماریوں کے بارے میں اور زندگی سے متعلق، ہر چیز کے بارے میں آپ کی اپروچ سب سے اہم چیز ہے۔ یہ اپروچ اُداسیوں میں خوش رنگ تصویریں بناتی ہے اور یہ اپروچ خوشگوار لمحوں کو موت کی ناخوشگوار تصویروں میں بدل دیتی ہے۔ تصویریں زندگی کا سرمایہ بھی ہیں اور زندگی کا پچھتاوا بھی، یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے پاس کون سی تصویروں کا البم رکھنا چاہتے ہیں؟

⟡ ⟡ ⟡

وزیرِ اطلاعات کی گرم گرم جلیبیاں!

مجاہد اُردو ''ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری'' نے مجھے پیشکش کی ہے کہ اگر وہ پاکستان کے صدر منتخب ہو گئے تو مجھے مرکزی وزیر اطلاعات مقرر کریں گے لیکن اس کے لیے انہوں نے شرط عائد کی ہے میں ان کی انتخابی مہم کے دوران ان کی حمایت میں مسلسل کالم لکھوں۔ یہ انتخابی مہم وہ گزشتہ ایک ہفتے سے شروع کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ایم اے او کالج کا دورہ بھی کیا جہاں انہوں نے صدر شعبہ اُردو کے علاوہ دیگر اساتذہ اور فرسٹ ایئر کے متعدد طالب علموں سے فرداً فرداً ملاقاتیں کیں۔ میرے ساتھ ان کی ملاقات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس میں انہوں نے مجھے وزارت اطلاعات کی پیشکش کی تاہم میں نے انکار کر دیا۔ انکار اس وجہ سے نہیں کیا کہ وزارت کی مطلوبہ شرط مجھے منظور نہیں تھی کیونکہ مجاہد اُردو کی حمایت میں پہلا کالم تو آپ کی نظر سے بھی گزر رہا ہے۔ انکار میں نے اس لیے کیا کہ مجاہد اُردو نے منو بھائی کو ایک کالم کے عوض ڈیڑھ پاؤ گرم گرم جلیبیاں کھلائیں۔ جبکہ مجھے وہ وزارت پر ٹرخانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے مجاہد اُردو کو بتایا کہ جس کے پاس وزارت اطلاعات کا قلمدان ہوتا ہے اس پر:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

والی بات صادق آتی ہے۔ اپوزیشن والے تو خیر مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ وزیراعظم کے سوا حزب اقتدار کے پیشتر ارکان بھی وزیر اطلاعات سے ناخوش رہتے ہیں کہ خبرنامے میں انہیں بیوٹی پارلر کا افتتاح کرتے تو دکھایا گیا ہے لیکن ان کے بڑے

بھائی کے چھوٹے بیٹے کی رسم ختنہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی، خبرنامے میں اسے بلیک آوٹ کر دیا گیا۔ اس کے برعکس ڈیڑھ پاؤ گرم گرم جلیبیوں کی افادیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ مجاہد اُردو نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ اس کے جواب میں انہوں نے وزارت کے ایسے فوائد گنوائے جو ان کے نزدیک دودھ جلیبی سے زیادہ ''مقوی'' تھے۔ بہرحال مذاکرات جاری ہیں اُمید ہے کہ مجاہد اُردو وزارت کی بجائے نقد ڈیڑھ پاؤ جلیبیوں پر راضی ہو جائیں گے!

مجاہد اُردو سے ایک مسئلے پر یہ اختلاف ہو گیا بلکہ سچی بات ہے فضا کچھ تلخ بھی ہو گئی، موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ قائداعظمؒ کی تعلیمات کے سچے وارث ہیں، چلیں یہ دعویٰ تو ہر سیاست دان کرتا ہے مگر اگلی بات مجاہد اُردو نے یہ کہی کہ ان کی قائداعظمؒ سے مشابہت بھی ہے۔ اس پر میرا پارہ چڑھ گیا مگر مجاہد اُردو نے بہت اعتماد اور سکون کے ساتھ کہا کہ وہ یہ بات پورے افتخار کے ساتھ کہہ رہے ہیں '' کیونکہ میرا بدن بھی اکہرا ہے، غزالی آنکھیں ہیں، پتلی پتلی اُنگلیاں ہیں اور کتابی چہرہ ہے۔'' تاہم میرا موڈ دیکھ کر موصوف نے اپنے حسن کا قصیدہ پڑھنا بند کر دیا۔

یوں تو مجھے مجاہد اُردو میں ایسے بہت سے اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی سیاستدان میں ہونے چاہئیں لیکن صدارتی اُمیدوار بننے کے ضمن میں ان کی ایک ڈس کوالیفکیشن بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے منہ میں دانت ہیں۔ صدر کے منہ میں دانت ضرور ہونے چاہئیں خواہ وہ آٹھویں ترمیم کی صورت میں کیوں نہ ہوں جبکہ مجاہد اُردو کے صدر بننے کی صورت میں آٹھویں ترمیم کا تو کیا ذکر، آئین ہی میں ترمیم کرنا پڑے گی۔ اب تک آئین میں صدر کے لیے دماغی طور پر درست ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے جبکہ مجاہد اُردو کی صورت میں یہ شرط ختم کرنا پڑے گی کیونکہ ہمیں اب تک فرزانوں نے کچھ نہیں دیا۔ اب ہمیں کسی دیوانے کی ضرورت ہے اور مجاہد اُردو کی دیوانگی میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں ہے بلکہ میں تو کسی روز انہیں سائیکالوجسٹ کے پاس لے جانے کی سوچ رہا ہوں تا کہ وہ مجاہد اُردو کی دیوانگی کو

قدرے کم کرنے کی کوشش کرے۔ صدارت کا عہدہ ایسا ہے کہ اس کے لیے کم از کم ابتدا میں "سین" ہونا ضروری ہے۔ بعد میں اس کا نشہ جس کو جو چاہے بنا دے!

ان دِنوں جس تعداد میں صدارتی اُمیدوار سامنے آئے ہیں اور جس معیار کے سامنے آئے ہیں اس سے مجاہد اُردو کو خاصا سخت مقابلہ درپیش ہوگا۔ فرض کریں اگر مجاہد اُردو صدر منتخب نہ ہوسکیں بلکہ ان کی جگہ قومی نمائندے اداکار حبیب کو منتخب کرلیں یا ایم پی خان کی سنی جائے تو بھی مجاہد اُردو کو کوئی فرق نہیں پڑے گا اور یہ مجاہد اُردو کا "پلس پوائنٹ" ہے۔ اس ضمن میں موصوف کی سیر چشمی کی کئی وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہی ہے کہ وہ سیر چشم واقع ہوئے ہیں، دوسری وجہ یہ کہ موصوف میں جو خدمت خلق کا جذبہ ہے وہ کئی دوسرے طریقوں سے پورا ہوسکتا ہے جن میں ادارہ خدمت خلق میں شمولیت اختیار کرنا بھی شامل ہے لیکن بالفرض اگر ان کا کوئی مداح ضد کرے کہ مجاہد اُردو کو صدر ضرور ہونا چاہیے تو اس کا جواب بھی موجود ہے کیونکہ موصوف یعنی ڈاکٹر فضل الرحمٰن رحمانی گزشتہ سال ہا سال سے انجمن بقائے اُردو شاد باغ لاہور کے صدر چلے آ رہے ہیں اور میرے خیال میں انجمن بقائے اُردو شاد باغ کا صدر ہونا کوئی معمولی بات نہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس انجمن کے لیے کسی اور کو صدارتی اُمیدوار بننے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ بقائے اُردو کی صدارت کی موجودگی میں مجاہد اُردو کے دل میں پاکستان کا صدر بننے کی خواہش کیسے پیدا ہوگئی۔ میری رائے میں یہ مجاہد اُردو کی بدقسمتی ہے اور یا پھر ملک و قوم کی بدقسمتی ہے! تاہم آخر میں، میں اس عزم کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر مجاہد اُردو نے انجمن بقائے اُردو کی صدارت پر دوسری صدارت کو ترجیح دی تو میں اپنی رائے سے رجوع کر کے، ان کی انتخابی مہم میں ان کا مکمل طور پر ساتھ دوں گا۔ بس اس کے سلسلے میں انہیں اپنی پیشکش پر پرنظر ثانی کرنا ہوگی کیونکہ میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں گرم گرم جلیبیوں پر وزارت اطلاعات کو ترجیح دوں، ورنہ میں جشن انکار وزارت مناؤں گا۔ اپنے بزرگ سیّد احمد سعید کرمانی کی طرح اور اس کا بل مجاہد اُردو کو بھجوا دوں گا۔ یہ جرمانہ انہیں ادا کرنا ہوگا۔

ملکۂ ترنم اور لوڈ شیڈنگ!

ملکہ ترنم نور جہاں نے حکومت کو گزارش یا ''ہدایت'' فرمائی ہے کہ جس روز پی ٹی وی سے ان کے گانوں کا پروگرام ترنم نشر ہوتا ہے، اس روز پورے پاکستان میں لوڈ شیڈنگ کی پابندی ختم کر دی جائے۔ بہت سے دوستوں نے ملکہ ترنم کے اس بیان کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ حالانکہ یہ ایک سنجیدہ بیان ہے اور اس کا سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔ دراصل چیزوں کو سطحی نظروں سے دیکھنے والوں نے اس بیان کو بھی سطحی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے خیال میں ملکہ ترنم خود کو اس مقام پر سمجھنے لگی ہیں جہاں سے آگے کوئی مقام نہیں ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ملکہ ترنم نے یہ بیان اپنے لیے نہیں دیا بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوڈ شیڈنگ کی پابندی اپنی جگہ لیکن جہاں کوئی اعلیٰ قومی مفاد درپیش ہو وہاں لوڈ شیڈنگ کے شیڈول میں لچک پیدا کر دینی چاہیے۔ اگرچہ ملکہ ترنم کے بیان میں اس قسم کی کوئی بات نہیں جو میں نے ابھی عرض کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے مداح بھی ان کے بیان سے کوئی معقول قسم کی بات نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ اب دیکھیں نا صدر مملکت پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہیں، ملک و قوم کے حوالے سے انہوں نے کئی اہم باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان اوقات میں پورے ملک میں لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے یا وزیراعظم قوم سے خطاب فرماتے ہیں تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے لوڈ شیڈنگ نہ کی جائے لیکن واپڈا والے صدر کی پرواہ کرتے ہیں نہ وزیراعظم کی اور نہ ملکہ ترنم کی۔ اس طرح ملک کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے

ضروری ہے کہ ہماری ملیں چوبیس گھنٹے کام کرتی رہیں۔لیکن واپڈا والوں کو اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے۔ مگر ہمارے دیہات روزانہ کئی کئی گھنٹے لوڈشیڈنگ کی زد میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے ٹیوب ویل نہیں چلتے اور ہمارے کھیتوں کے ہونٹ خشک رہ جاتے ہیں۔اب ملکہ ترنم نے ایک اہم قومی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ہے یعنی وہ ٹی وی سے گانا گایا کریں گی۔مگر واپڈا والوں کے نزدیک یہ بھی کوئی ایسا کام نہیں جس کے لیے ان اہم اوقات میں لوڈشیڈنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے۔ میں تو سخت پریشان ہوں کہ آخر اس قوم کا بنے گا کیا؟

گزشتہ ماہ اظہر لودھی پی ٹی وی کی نئی سہ ماہی کے پروگرام لے کر لاہور آئے تو لاہور ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر اور میرے دوست ایس ایم انور نے ان پروگراموں کی جھلک دیکھنے کے لیے آنے والے صحافیوں سے اپنی افتتاحی تقریر میں درخواست کی کہ انہیں جو پروگرام پسند نہ آئے وہ اسے درمیان ہی میں روک سکتے ہیں۔البتہ میڈم نور جہاں کا پروگرام جب چلایا جائے تو براہِ کرم اسے درمیان میں نہ روکا جائے۔ بلکہ اسے شروع سے آخر تک دیکھا جائے۔ میں اس وقت بہت خوش ہوا تھا۔ایس ایم انور کو اس پروگرام کی قومی اہمیت کا اندازہ ہے لیکن یہ اندازہ تو مجھے اب ہوا ہے کہ خود ملکہ ترنم نے انہیں اس طرف متوجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ صحافیوں نے یہ پروگرام پورا چلنے دیا اور اس دوران آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ملکہ ترنم نے اپنے گانوں کے جس پروگرام کے لیے لوڈ شیڈنگ موقوف کرنے کی درخواست یا ہدایت کی ہے، اس میں پہلی غزل جو انہوں نے گائی وہ احمد فراز کی تھی ''مزاحمتی'' شاعری والے احمد فراز کی نہیں بلکہ رومانوی شاعر احمد فراز کی چنانچہ لوگوں کو یہ غزل بہت پسند آئی۔ پروگرام میں ملکہ ترنم جو گیت گائیں گی ان میں وہ گیت بھی شامل ہیں جو وہ فلموں کے لیے گا چکی ہیں۔ان کا ایک گیت مجھے بہت پسند ہے جس کے بول کچھ یوں ہیں:

گھروی خالی میں وی کلی

یا ''میرا حسن مسالے دار وے ذرا چکھ لے سجنا'' مجھے علم نہیں کہ ان کے یہ گیت بھی پروگرام میں شامل ہیں یا نہیں، اگر نہیں ہیں تو شامل کرلیں۔ اس سے پروگرام کی قومی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور لوڈ شیڈنگ کے موقوف کرنے کے مطالبے میں زیادہ وزن پیدا ہوگا۔ ملکہ ترنم کے گانوں کی ایک کیسٹ ایسی بھی ہے جو بازار میں کھلے عام فروخت ہوتی ہے۔ یہ گانے میڈم نے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے گائے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی پسند ہیں۔

اگر چہ ملکہ ترنم نور جہاں کے بیان کو سپورٹ دینے کے لیے یہ دلائل کافی ہیں جو میں نے ابھی پیش کیے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے ملکہ ترنم کی شنوائی نہیں ہوگی۔ اگر ان کا لوڈ شیڈنگ والا مطالبہ پورا نہ ہو تو وہ دل برداشتہ نہ ہوں کہ یہ قوم اپنے محسنوں کے ساتھ ہمیشہ سے یہی سلوک کرتی آئی ہے۔ چنانچہ اس قوم کے بہت سے افراد کا تو خیال یہ ہے کہ اب خود ملکہ ترنم کی لوڈ شیڈنگ ہونی چاہیے۔ یعنی انہیں صرف روپے پیسے کے لیے نہیں گانا چاہیے کہ اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے۔ اب وہ صرف اس وقت گائیں جب گانے کی طلب محسوس ہو کہ ان کی آواز قوم کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ویسے ملکہ ترنم کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لوڈ شیڈنگ کی بڑی ذمہ داری جناب ولی خان پر ہے وہ جب تک چاہیں گے لوڈ شیڈنگ ہوتی رہے گی کہ وہ اور ان کے ساتھی کالا باغ ڈیم نہیں بننے دے رہے۔ جب تک کالا باغ ڈیم نہیں بنے گا یہ لوڈ شیڈنگ نہ صرف رہے گی بلکہ بڑھتی رہے گی۔ مادام چاہیں تو خان صاحب کو گانا سنا کر راضی کرلیں۔ چاہیں تو ناچ کر منا لیں۔ قوم بھی ان کی شکر گزار ہوگی۔

⟡ ⟡ ⟡

مذہبی جنونی!

گوجرانوالہ میں ایک پاکستانی مسلمان حافظ سجاد کے ساتھ پاکستانی مسلمانوں نے جو سلوک کیا، وہ مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں کے لیے گہری سوچ بچار کا متقاضی ہے۔ اس واقعے نے مجھ پر جو جذباتی کیفیت طاری کی میں چاہتا تھا کہ اس سے باہر نکل آؤں تو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس پر اظہار خیال کروں چنانچہ کالم میں تاخیر کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ آپ ایک دفعہ اپنے دماغ میں یہ واقعہ تازہ کریں کہ حافظ سجاد گھر میں تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف ہے، وہ کسی کام کے لیے اُٹھنے لگتا ہے تو قرآن پاک چولہے پر گر جاتا ہے جس سے اس کے ایک دو اوراق شہید ہو جاتے ہیں، ہمسائے شور مچا دیتے ہیں کہ لوگو اس ظالم نے قرآن پاک کو آگ لگا دی ہے، مسجدوں سے اعلان ہونے لگتے ہیں، پولیس حافظ قرآن کو پکڑ کر لے جاتی ہے ''مشتعل'' ہجوم تھانے پر حملہ کر کے ''ملزم'' کو قابو کر لیتا ہے اور اسے سرعام سنگسار کرنا شروع کر دیتا ہے، جب حافظ قرآن، حرمت قرآن کے نام پر لہولہان کر دیا جاتا ہے تو کچھ ''غیرت مند'' نوجوان آگے بڑھتے ہیں اور اس کے جسم پر مٹی کا تیل چھڑکتے ہیں اور اسے آگ لگا دیتے ہیں، جب وہ زندہ آگ میں جل جاتا ہے تو کچھ ''اسلام کے جاں نثار'' اس کی لاش کو موٹر سائیکل کے ساتھ باندھتے ہیں اور اسے شہر کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اخبارات میں دو دن اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور پھر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ کتنا معمولی واقعہ ہے جس پر نہ زمین کا کلیجہ شق ہوا اور نہ آسمان سروں پر آن گرا؟ لیکن زمین بھی شق ہو گی اور

آسمان بھی سروں پر آ گرے گا اگر ہم نے اس سانحہ کے تمام پہلوؤں کا پوری سنجیدگی سے جائزہ نہ لیا اوران محرکات کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جس کے نتیجے میں لوگوں نے قانون اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور قانون نے ان پلید ہاتھوں پر بیعت کر لی ہے!

اس سانحے میں مذہبی لوگوں کے سوچنے کی جو چیز ہے، وہ مذہبی جنون ہے جس میں لوگوں کو بہت بری طرح مبتلا کر دیا گیا ہے اور مجھے انتہائی دکھ سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ اس میں اخبارات کا بھی حصہ ہے بابری مسجد کے سانحے کے بعد جب پاکستان میں مندروں پر حملے شروع ہوئے تو ہمارے ایک اخبار کی شہ سرخی تھی ''لاہور مندروں سے پاک ہو گیا'' جن سے ان ''مجاہدوں'' کے حوصلے بلند ہوئے جنہوں نے یہ ننگ اسلام حرکت کی تھی، یہ اور اسی طرح کی دوسری سرخیاں اسی طرح کی ہوتی ہیں جو کسی قاتل کے سنگدلانہ فعل کی شدت کم کرنے کے لیے عموماً اخبارات میں نظر آتی ہیں مثلاً ''غیرت مند بھائی نے ٹوکے کے وار کر کے اپنی بہن کو ہلاک کر دیا'' ایک معاشرے کو جب جنون میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو پھر اس کے سامنے کوئی انتہا نہیں رہتی، وہ مندروں کے علاوہ مسجدوں کو بھی ''اسلام'' کے نام پر بم کے دھماکوں سے اُڑانے لگتا ہے اور سجدے میں گرے ہوئے نمازیوں کو کلاشنکوف کے ایک برسٹ سے بھون کر رکھ دیتا ہے۔ حافظ سجاد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک مفروضے کے ساتھ ہوا، نہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوا، نہ گواہ عدالت کے سامنے پیش ہوئے، نہ ''ملزم'' کو صفائی کا موقع دیا گیا اوران سب مراحل سے گزرے بغیر وحشت و بہیمت کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ انسانیت ہمیشہ کے لیے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ایک لمحے کے لیے فرض کریں کہ ''ملزم'' واقعی بے دین تھا، اس نے جان بوجھ کر قرآن پاک کو آگ لگائی۔ میں مفتی نہیں ہوں، کسی مفتی سے پوچھا جائے کہ کیا اتنے بڑے گناہ کے مرتکب کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ نے یہی سزا مقرر کی ہے۔ جو ''ملزم'' کو دی گئی؟ نیز یہ کہ اس سزا کے لیے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں اور نیز یہ کہ یہ سزا ریاست کی بجائے جو چاہے دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے ان میں سے کوئی بات بھی

اس طرح نہیں ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہمارے مفتیوں نے اس پر اتنا شور کیوں نہیں مچایا جتنا شور وہ کسی رسالے میں کسی عورت کی تصویر کی اشاعت پر مچاتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے عوام کے علاوہ ہمارے مفتی بھی ان معاملات میں خدا اور اس کے رسولؐ کے مقرر کیے ہوئے انسان کے ضابطوں اور ایسے معاملات میں تجویز کی گئی سزاؤں سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ وہ اس سے آگے جانا چاہتے ہیں اور یہ بات چونکہ وہ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتے لہٰذا اگر رائے عامہ ان کا ساتھ دے تو ایسے خلاف اسلام اقدامات کی حمایت میں کھل کر سامنے آ جاتے ہیں، بصورت دیگر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

کچھ برس قبل ایک مسیحی کو ''غلط فہمی'' کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ قاتل کا ٹارگٹ کوئی گستاخ رسولؐ تھا مگر وہ غلطی سے اسے سمجھ بیٹھا، اسی طرح گزشتہ دنوں ایک مسیحی کو عدالت کے باہر قتل کر دیا گیا جس پر توہین رسالت کا مقدمہ چل رہا تھا اس طرح کے بے شمار واقعات نئے اور پرانے غیر مسلموں کے ساتھ ہو رہے ہیں، کیا اسلام میں قاضی کا کوئی مصرف نہیں، جو شخص چاہے اور جب چاہے وہ قاضی بلکہ قاضی القضاء کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور اپنے طور پر یہ اختیار حاصل کرنے کے بعد اسے قتل و غارت گری کا لائسنس بھی حاصل ہو جاتا ہے، ان معاملات میں چشم پوشی بلکہ داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ''کفار'' کے بعد اب مسلمانوں کی باری بھی آ گئی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مشہور فرقہ دوسرے مشہور فرقے کو ''گستاخ رسول'' قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے ''مشرک'' سمجھتا ہے چنانچہ ایک دوسرے کی مسجدوں پر بموں سے حملے کیے جاتے ہیں اور ''گستاخ رسول'' اور ''مشرک نمازیوں'' کو باری باری سجدے کی حالت میں تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ اب ہر شخص کا اپنا اسلام ہے، اپنے قوانین ہیں اور اپنے فیصلے ہیں جن پر عمل درآمد میں نہ مفتی آڑے آتے ہیں اور نہ ملکی قانون ان کا راستہ روکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں ہم نعوذ باللہ ان سے زیادہ مذہبی ہو گئے ہیں جن کی وساطت سے ہم تک مذہب پہنچا۔ خدا اور اس کے رسول کا فرمان ہے کہ کسی کے گھر میں

دستک اور اس کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی کوشش نہ کرو۔ خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق جب دیوار پھلانگ کر ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں اور گھر میں موجود خاتون سے پوچھتے ہیں کہ تم اتنی اُونچی آواز میں گانا کیوں گا رہی تھیں تو وہ پوچھتی ہے ''تم کون ہو؟'' خلیفہ وقت جواب دیتے ہیں ''میں عمر، امیر المومنین ہوں'' وہ عورت کہتی ہے ''اگر تم امیر المومنین ہو تو کیا تمہیں رسولؐ خدا کا یہ فرمان یاد نہیں کہ کسی چار دیواری میں بغیر اجازت کے داخل ہونا خلاف اسلام ہے؟'' اس پر امیر المومنین کے ماتھے پر عرق ندامت نمودار ہوتا ہے، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہیں ''مجھ سے غلطی ہوئی، خاتون مجھے معاف کر دو!''

آج ہم ذرا شک پڑنے پر گھروں پر ہلہ بول دیتے ہیں، اگلے روز بغیر عدالتی تحقیق کے اخباروں میں ان کی تصویریں شائع ہوتی ہیں اور یوں خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ نیوا ایئر پر ہم ''اسلام'' کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور گنہ گاروں کے لیے وہ سزائیں تجویز کرتے ہیں جو اتفاق سے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں نہیں آتی تھیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے اُوپر بیان کی ہے کہ ہم گنہگاروں کے لیے خدا اور اس کے رسول کی تجویز کی ہوئی سزاؤں اور اس کے طریق کار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم نے اسلام کے خوبصورت چہرے پر مذہبی جنونیت کا تیزاب پھینک کر اسے مسخ کر دیا ہے۔ جن لوگوں نے تنگ دلی کی یہ آگ بھڑکائی ہے، ان سے یہ آگ بجھانے کی توقع نہ کریں بلکہ اسلام کے سچے عاشق آگے بڑھیں اور اسلام سے بیزار ہوتی ہوئی نئی نسل کو بتائیں کہ اصل اسلام وہی ہے جو خدا نے رسولؐ پر اُتارا اور حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جس کی عملی شکل سامنے آئی۔ موجودہ اسلام چند سنگدلوں کی تخلیق ہے اور اب خود ان پر برا وقت آ گیا ہے۔

⟡ ⟡ ⟡

قرعۂ فال!

مجاہد اُردو ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری نے دنیا بھر میں اپنے جیسے مجاہدوں کی ناک کٹوا دی ہے اور خصوصاً مجھے اور منو بھائی کو تو دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، موصوف ایک عرصے سے اپنی صدارتی مہم چلا رہے تھے اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے بارے میں ہم کالم نگاروں کو یقین دلایا کہ وہ پاکستان کے آئندہ صدر ہیں بلکہ مجھے اور منو بھائی کو بالترتیب وزارت تعلیم اور وزارت اطلاعات الاٹ بھی کر دی اور ہم نے حسب توفیق ان کی صدارتی مہم بھی چلائی بلکہ سچی بات پوچھیں تو میں نے محض ان کی وجہ سے ان کے حریفوں معین قریشی اور غلام اسحاق کے خلاف کئی کالم لکھے حالانکہ یہ دونوں بزرگ کسی بھی طور پر مجاہد اُردو سے کم نہیں تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ اکارت گیا کیونکہ آج کے اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں نے کاغذات نامزدگی داخل کرائے ہیں، اگر کسی نے نہیں کرائے تو وہ مجاہد اُردو ہیں۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو!

ویسے ممکن ہے جس چیز کو میں مجاہد اُردو کی کم ہمتی سمجھ بیٹھا ہوں، وہ ان کی کم ہمتی نہ ہو بلکہ ان کی اصول پرستی ہو کیونکہ موصوف محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب نواز شریف پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے کہ یہ دونوں راہنما انہیں متفقہ طور پر اُمیدوار نامزد کریں کہ ملک وقوم کا مفاد اسی میں ہے۔ یہ دباؤ ڈالنے کے لیے انہوں نے خدانخواستہ کوئی اوچھا حربہ استعمال نہیں کیا یعنی ایسا نہیں کہ انہوں نے اس ضمن میں پاک فوج کی مدد لی ہو، امریکی سفیر سے جا کر ملے ہوں یا بے نظیر اور نواز شریف کی پارٹیوں کے سرکردہ افراد کے

ذریعے سلسلہ جنبانی کی ہو بلکہ وہ سارا دباؤ اپنی ریلے سائیکل کے پیڈل پر ڈالتے تھے اور لاہور شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انہیں جو راہگیر شکل وصورت سے دردمند لگتا تھا اسے روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور بیشتر صورتوں میں اسے اپنی صدارت کا قائل کر کے وہاں سے ٹلتے تھے۔ اگر اس مہم کے دوران کسی شرپسند نے ان کے سائیکل کی ہوا نکال دی یا ان کے کتے فیل ہو گئے تو بھی وہ ہمت نہیں ہارے اور اپنی صدارتی مہم میں مگن رہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اتنی تگ و دو اور محنت شاقہ کے باوجود قائد حزب اقتدار بے نظیر بھٹو اور قائد حزب اختلاف نواز شریف انہیں اپنا متفقہ صدارتی اُمیدوار بنانے پر راضی نہیں ہوئے اور اس صورت میں انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ قوم کو امتحان میں ڈالیں۔ چنانچہ اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کی بجائے موصوف میدان سے ہٹ گئے۔

تاہم جو صورت حال میں نے ابھی بیان کی ہے، وہ میرا اندازہ ہے، ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو، مجاہد اُردو نے اگر کاغذات نامزدگی داخل نہیں کروائے تو لازم نہیں کہ وہ صدارتی اُمیدوار بھی نہ ہوں۔ موصوف نے میرے ساتھ تنہائی میں ایک ملاقات کے دوران اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ محاذ آرائی کے خلاف ہیں یعنی انہیں یہ بات پسند ہی نہیں کہ وہ محض ملک کا صدر بننے کے لیے کسی دوسرے اُمیدوار کا مقابلہ کریں چنانچہ متفقہ اُمیدوار کی شرط انہوں نے عائد کی تاکہ اس کے باوجود اگر کوئی سادہ لوح اُمیدوار ان کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے تو متفقہ اُمیدوار ہونے کی وجہ سے انہیں اس کا ''مقابلہ'' نہ کرنا پڑے اور ان کی جیت یقینی ہو مجاہد اُردو نے تو ایک اور تجویز بھی میرے سامنے رکھی تھی بلکہ اسے حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے راہنماؤں تک پہنچانے کی ڈیوٹی بھی میرے ہی سپرد کی تھی اور وہ یہ کہ اگر محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب نواز شریف بضد ہیں کہ انہوں نے اپنا اُمیدوار ضرور کھڑا کرنا ہے تو یہ شوق بھی پورا کر لیں لیکن پولنگ سے ایک دن پہلے ان دو اُمیدواروں کے علاوہ ایک پرچی پر تیسرا نام مجاہد اُردو کا لکھ کر ہوا میں اُچھالیں اور کسی غیر جانبدار بچے سے کہیں کہ وہ بسم اللہ پڑھ کر ان میں سے کوئی ایک

پرچی اُٹھالے۔ بس یہ قرعہ جس کے نام نکلے، دونوں پارٹیاں اس پر متفق ہو جائیں۔ اس سے ان کی انا کو بھی ٹھیس نہیں لگے گی اور مجاہد اُردو کا کام بھی ہو جائے گا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے۔ اس پر میں نے موصوف سے عرض کیا کہ آئین کی رو سے اُمیدوار کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کرانا ضروری ہیں، لہٰذا اس تجویز پر دونوں راہنماؤں کو راضی کرنا میرا کام ہے لیکن آپ کاغذات ضرور جمع کرائیں۔ موصوف نے اس پر کہا تھا ''یہاں پہلے آئین پر کون سا عمل ہوتا ہے جو اس معمولی سی بات کے لیے آئین آڑے آجائے گا، ویسے میں کوشش کروں گا'' لیکن مجھے لگتا ہے انہوں نے کوشش نہیں کی، ورنہ ان کے کاغذات نامزدگی وصول تو کر لیے جاتے کہ آخر ایم پی خان کے کاغذات بھی تو وصول کر لیے گئے ہیں، کاغذات منظور کرانے کا شوق انہیں بھی نہیں۔ ویسے کوئی پتہ نہیں آخری مرحلے پر مجاہد اُردو کی تجویز واقعی منظور کر لی جائے کہ نپولین کی لغات اور ہماری سیاسی بساط میں ناممکن کا لفظ موجود نہیں ہے!

میں یہ کالم ابھی یہیں تک لکھ پایا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے ٹوک دیا، اس نے کہا ''تمہیں اتنا سنجیدہ معاملے پر اتنا غیر سنجیدہ کالم نہیں لکھنا چاہیے'' میں نے جواباً عرض کیا ''اگر یہ معاملہ واقعی اتنا سنجیدہ ہے تو سابق صدر غلام اسحاق خان ایک بار پھر صدارتی اُمیدوار کیوں ہیں؟ جبکہ ملک کی دونوں پارٹیوں کے عوام انہیں سخت ناپسند کرتے ہیں بلکہ پیپلز پارٹی کی رہنما محترمہ بے نظیر بھٹو نے تو ان کی حمایت کے ضمن میں معذرت بھی کر دی ہے'' دوست نے کہا ''تمہارے سارے کالم میں کام کی بات صرف مجاہد اُردو کی تجویز ہے کہ قرعہ اندازی سے صدر کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور تم دیکھنا آخری مرحلے میں پیپلز پارٹی قرعہ فال غلام اسحاق خان کے نام نکالے گی'' میں اپنے اس ''شقی القلب'' دوست سے متفق نہیں ہوں تو اس لیے متفق نہیں ہوں کہ اس صورت میں مجاہد اُردو کا کیا بنے گا اور اس وزارت کا کیا بنے گا جو مجاہد اُردو کے دور صدارت کے ساتھ مشروط ہے؟

معلق موسم!

ان دنوں موسم پینترا بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ گرمی کے چنگل سے آزاد ہو لیکن اس کوشش میں وہ گرمی اور سردی کے درمیان پھنس کر رہ گیا ہے چنانچہ خدشہ ہے کہ کہیں موسم بھی ''گرم سرد'' کا شکار نہ ہو جائے۔ موسم کے اس دوغلے پن کی وجہ سے لوگ بھی دوغلے پن کا شکار ہو رہے ہیں۔ گرمیوں کا لباس پہن کر نکلتے ہیں تو خنکی کا احساس ہوتا ہے اور سردیوں کا لباس پہنتے ہیں تو جسم پر ''پت'' نکل آتی ہے۔ چنانچہ وہ کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی فکر میں ہیں البتہ ایک دوست کو میں نے دیکھا کہ وہ وولن کا سوٹ زیب تن کیے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی فرمانے لگے ''یار ذرا اے سی چلانا، گرمی لگ رہی ہے'' میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کو گرمی محسوس ہو رہی تھی تو پھر سوٹ پہننے کی کیا تک تھی؟ فرمانے لگے ''میں سرکاری ملازم ہوں اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سرکاری طور پر موسم سرما اکتوبر سے شروع ہو چکا ہے'' ایک اور دوست بھی گزشتہ روز سوٹ میں ملبوس دکھائی دیے۔ میں نے اس ''مشکل پسندی'' کی وجہ پوچھی تو بولے ''سردیاں اصولاً اب تک شروع ہو جانا چاہیے تھیں، چنانچہ میں نے ہفتے قبل سوٹ سلا لیا تھا۔ اس کے بعد میں سردی پڑنے کا انتظار کرتا رہا لیکن کب تک کرتا؟ بالآخر آج جان پر کھیل گیا ہوں۔''

خود میں بھی ان دنوں خاصے ''مخمصے'' میں مبتلا ہوں۔ سوچتا ہوں کس حقیقت کو تسلیم کروں؟ ایک حقیقت یہ ہے کہ فضا میں خنکی موجود ہے اور ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ گرمی

اپنی جگہ پر قائم ہے چنانچہ اس ''ہنگ ویدر'' نے خاصا پریشان کیا ہوا ہے۔ تاہم میں نے درمیانی راستہ تلاش کرلیا ہے۔ میں دوپہر کو پینٹ بوشرٹ اور رات کو سفاری سوٹ پہن کر نکلتا ہوں اور یوں حسب توفیق دونوں موسموں کو خوش کرنے کی کوشش میں ہوں۔ جب کبھی ان میں سے کسی موسم کو برا کہنے کو جی چاہتا ہے تو مجھے میرے مولوی صاحب منع کر دیتے ہیں کہ ''موسم کو برا نہ کہو، اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔''

اس ''ہنگ ویدر'' (معلق موسم) سے یاد آیا کہ میرے ایک دوست سیاسی موسموں کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ اکثر چولا بدلتے رہتے ہیں۔ موصوف ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں پی کیپ پہن کر پھرتے تھے، ضیاء الحق کا دور آیا تو انہوں نے یہ پی کیپ ایک دائمی قسم کے جیالے کو دان کر دی اور اس کی جگہ جناح کیپ پہننا شروع کر دی۔ گزشتہ روز ملاقات ہوئی تو موصوف کنپٹی پر پائے جانے والے رسمی بالوں کی نمائش کرتے ننگے سر پھر رہے تھے حالانکہ جو سر پہلے ہی اتنا ننگا ہو، اس پر کچھ نہ کچھ ضرور رکھ لینا چاہیے۔

میں نے اس ''ننگ سر'' کو دیکھا تو کہا ''تمہیں شاید علم نہیں کہ ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کی حکومت ہے اور یوں تمہیں سر پر پی کیپ رکھنی چاہیے'' افسردگی سے بولے ''ایک دن یہ پی کیپ پہن کر میں سیکرٹریٹ گیا تھا۔ وہاں مسلم لیگ چٹھہ گروپ کے کارکنوں نے مجھے پکڑ کر مارا۔ اگلے روز میں جناح کیپ پہن کر وہاں گیا تو پیپلز پارٹی کے جیالوں نے مجھے بہت پیٹا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا پہنوں؟'' میں نے دوست کو دلاسا دیا اور کہا ''ان دنوں یینکی ہیٹ ہمارے قومی لباس میں شامل ہوگا'' ویسے میرے یہ دوست اس طرح کی مصیبت میں پہلی دفعہ گرفتار ہوئے ہیں اور وجہ ظاہر ہے کہ پنجاب میں ان دو پارٹیوں کی مشترکہ حکومت ہے جنہوں نے بالآخر حلیف سے ایک دوسرے کا حریف بننا ہے۔ میرے اس دوست کو پروین شاکر کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

وہ جہاں بھی گیا "لوٹا" تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہر جائی کی

مرا یہ "لوٹا" دوست یونیفارم کا اتنا پابند ہے کہ اگر کبھی ملک میں کنجروں کی حکومت آ جائے تو یہ سر پر "ساتھی" یا فیملی پلاننگ والوں کا منظور شدہ کوئی اور برانڈ سر پر پہن کر نکلے!

میرے ایک عزیز ہیں جو میرے اس دوست کے "ہم سر ہیں"۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ شیو بنانے کے لیے صبح آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں تو دوسروں سے کیا گلہ، ان کا اپنا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ موصوف بہت دھڑلے کے آدمی ہیں۔ چنانچہ وہ پبلک میں بھی اپنا یہ واشگاف سر لیے پھرتے ہیں بلکہ اسی عالم میں خواتین میں بھی جا گھستے ہیں اور وہ شرما کر سروں پر دوپٹہ رکھ لیتی ہیں لیکن موسم کے دوغلے پن سے میرے یہ دوست بھی پریشان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ گرمیوں میں سر پر ڈیڑھ پاؤ دہی لگا کر لیٹ جاتے ہیں کہ سارا دن دھوپ ان کے سر پر براہ راست پڑتی ہے اور سردیوں میں زیتون کی مالش کرتے ہیں لیکن اس معلق موسم نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ مجھ سے مشورہ کرتے تھے کہ وہ کیا کریں؟ میں نے کہا وہ فی الحال تیل دیکھیں اور تیل کی دھار دیکھیں! نیز دریں اثناء یہ سر کسی مستحق سیاسی پارٹی کو مستعار دے دیں جو اس معلق موسم میں "فیس سیونگ" کی فکر میں ہو۔ مگر میرے یہ دوست اس مشورے سے ناراض ہو گئے۔ حالانکہ ناراض اس پارٹی کو ہونا چاہیے تھا جسے یہ سر میں نے بخشش میں دینے کی سفارش کی تھی!

◇ ◇ ◇

ایک بیمار آدمی کی کہانی!

میرے ایک دوست کو اخبار پڑھنے کا بڑا چسکا تھا جس کے نتیجے میں وہ پاگل ہو گیا ہے اس کے ذہن میں عجیب طرح کے خوف اور واہمے جمع ہو گئے ہیں، ایک دن وہ میرے پاس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا کہنے لگا ''مجھے کچھ ہو گیا ہے'' میں نے کہا ''کیا مطلب'' بولا ''ذہن میں عجیب عجیب طرح کے وہم آتے ہیں'' میں نے پوچھا ''کیسے وہم؟'' بولا کوئی ایک ہو تو بتاؤں میں جب اپنے گھر کی گھنٹی بجاتا ہوں اور اگر اندر سے چند منٹ تک جواب نہ ملے تو میرا ذہن وہ تمام کہانیاں تیار کرنے لگتا ہے جو روزانہ شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ میں تصوراتی طور پر دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ٹی وی لاؤنج میں اپنے بچے خون میں لت پت نظر آتے ہیں، ان کی گردنیں تن سے اسی طرح جدا ہوتی ہیں جیسے اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دکھایا گیا ہوتا ہے۔ میں چیختا ہوا گھر سے نکل جاتا ہوں، اہل محلہ مجھے دلاسہ دیتے ہیں، پھر اگلے روز کے اخبارات کی سرخیاں مجھے یاد آتی ہیں، جب سات جنازے اکٹھے اُٹھے تو کہرام مچ گیا۔ برابر برابر پڑی ہوئی سات لاشوں کی تصویر بھی چھ کالم میں چھپی ہوتی ہے۔ بین کرتی ہوئی عورتوں میں کسی خوش شکل خاتون کو آہ وزاری کرتے دکھایا جاتا ہے۔''

''دو منٹ دروازہ نہ کھلنے پر تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے، تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟''

''میں تمہیں اپنے پاگل پن کا حال ہی تو بتا رہا ہوں۔ میری بیٹی ایک دن کالج سے

شام تک گھر واپس نہ پہنچی تو میں نے محسوس کیا جیسے اس کی لاش اگلے روز سڑک پر سے پڑی ملی ہے، اس کی جیب سے جو شناختی کارڈ برآمد ہوا تھا، اس میں لگی تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ ساتھ رپورٹر کی تفصیلی کہانی تھی جس کے مطابق اسے چند روز پیشتر ایک نامی گرامی سمگلر کے ساتھ دیکھا گیا تھا، میری بیٹی کی خالہ کے متعلق اس شبے کا اظہار کیا گیا کہ وہ بدکردار خاتون ہے اور میری بیٹی کی اس سمگلر سے ملاقات اس خالہ کی وساطت سے ہوئی تھی۔''

''یار، تمہاری دماغی حالت تو واقعی قابلِ رحم ہے''

''میں تم سے رحم کی بھیک مانگنے نہیں آیا، میں نے اخباروں میں مظلوموں کی کہانیاں اتنی وافر تعداد میں پڑھی ہیں کہ ہر وقت مریضوں میں رہنے والے ڈاکٹروں کی طرح میں بھی بے حس ہو گیا ہوں چنانچہ نہ اب مجھے خود پہ رحم آتا ہے اور نہ کسی دوسرے پر! جب ظلم کی داستانیں بے نتیجہ شائع ہوں تو پڑھنے والے سنگدل ہو جاتے ہیں، لہٰذا تم اپنی رحمدلی اپنے پاس رکھو''

''تم مجھے غلط سمجھتے ہو، میں تو......''

''چلو چھوڑو اس بات کو کہ کون غلط ہے کون صحیح ہے، سچ اور جھوٹ سب گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں، میں تمہیں بتا رہا تھا کہ بعض اخباروں کی چنگھاڑتی ہوئی سرخیوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ میں جب پولیس کی موبائل گاڑی دیکھتا ہوں تو خوف سے میرا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے، مجھے لگتا ہے ابھی پانچ، چھ سپاہی گاڑی سے اُتریں گے اور مجھے رائفل کے بٹ مارتے ہوئے وین میں بٹھا کر تھانے لے جائیں گے اور اگلے روز میری تصویر کے ساتھ اخبار میں خبر چھپی ہو گی کہ مجرموں کے گروہ کا ایک اور سرکردہ رکن گرفتار کر لیا گیا!''

''مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی، جب تم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تو پھر تمہیں یہ خوف کیوں ہے؟''

''تم عجیب آدمی ہو، کیا تم اخبار میں آئے دن یہ خبر نہیں پڑھتے کہ فلاں ملزم کی گرفتاری کے بعد اس کی جیب سے ٹیلی فون ڈائری برآمد ہوئی، جس میں درج ناموں کو

شامل تفتیش کر لیا گیا ہے، عنقریب ہولناک انکشاف ہوں گے!''

''مجھے واقعی تمہارے بارے میں تشویش شروع ہوگئی ہے''

''تم اپنی تشویش اپنے پاس رہنے دو، فی الحال صرف میری بات سنو ایک اور وہم مجھے دن بدن ہلکان کیے جا رہا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کسی دن سوتے میں مجھے ہارٹ اٹیک ہو اور میں اپنے بستر پر مردہ پایا جاؤں، اس خیال کے ذہن میں آتے ہی ایک پوری فلم میرے دماغ میں چلنے لگتی ہے، صبح کے اخبار میں سرخی چھپی ہوتی ہے۔ فلاں ابن فلاں اپنے بستر پر پراسرار طور پر مردہ پائے گئے، ساتھ تصویر جس میں میری گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوگی۔ اگلے روز کرائم رپورٹر کی سٹوری شائع ہوتی ہے کہ محلے داروں سے پتہ چلا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ایک عرصے سے چپقلش چلی آ رہی تھی، انہیں کئی دفعہ اُونچی آواز میں جھگڑتے بھی سنا گیا، شواہد سے پتا چلتا ہے کہ مرحوم کو زہر دیا گیا، اس خبر کے بعد میرے بیٹے اپنی ماں کے خلاف ہو جائیں گے، سب اہل محلہ بھی میری بیوہ کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیں گے، پھر پولیس والے میرے گھر میں آئیں گے، میری بیوی کو بلیک میل کریں گے، وہ اس سے......''

''بس کرو خدا کے لیے بس کرو، تمہاری دیوانگی خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے، اب تمہارا علاج ضروری ہے، چلو میں تمہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے چلوں!''

''صرف مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے بات نہیں بنے گی، تم سروے کرا کر دیکھ لو، میری طرح لاکھوں لوگ اس نوع کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں''

''لیکن مجھے تو تم سے دلچسپی ہے، اُٹھو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں......''

''تمہیں صرف مجھ سے نہیں، بلکہ پوری قوم سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ اگر قوم اسی طرح ذہنی طور پر مفلوج ہوتی گئی تو قائداعظم اور اقبال کا پاکستان دشمنوں کے لیے تر نوالہ بن جائے گا۔ تمہیں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت نہیں، میں تمہیں بعض اخبارات کے چند رپورٹروں، فیچر رائٹروں اور چند ایڈیٹروں کے ایڈریس دیتا ہوں ہو سکے تو انہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤ!''

گونگے!

اگر دیکھا جائے تو ہم زبان والوں کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں گونگا نہیں بنایا لیکن جب ہم گونگوں کو ہاتھ کے اشاروں سے ایک دوسرے سے پوری روانی کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھتے ہیں تو اپنی زبان دانی خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ ہم زبان دانوں کا تو یہ عالم ہے کہ فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جاتے ہیں یعنی فون ریکارڈ ہو جائے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کوئی ہمارا دم ''تقریر'' بھی تھا؟ جبکہ گونگے اس آزار سے محفوظ ہیں بلکہ ٹیلی فون کے آزار ہی سے محفوظ ہیں، انہیں نہ ٹیلی فون کا غلط بل آتا ہے، نہ رانگ نمبر ملتے ہیں، نہ ہر مہینے لائن مین کی خدمت کرنا پڑتی ہے اور نہ ٹیلی فون والوں کے اتنے پھیرے لگانا پڑتے ہیں کہ لوگ انہیں ''بھائی پھیرو'' کہنا شروع کر دیں۔ گونگوں کو ایک سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ خاصے فاصلے سے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں، اس کے لیے دونوں کی صرف بینائی صحیح ہونی چاہیے، ہم ''اہل زبان'' سر محفل ایک دوسرے کے خلاف سرگوشیوں میں سازش کرنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ گونگے یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ دوسرا گونگا ان کی گفتگو ''دیکھ'' رہا ہوتا ہے۔ ولی دکنی نے کہا تھا ؎

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مگر گونگے تو اس شعر کا بھی احسان نہیں اٹھاتے۔ گزشتہ ہفتے میں ایک گونگے

دوست کی شادی میں شریک ہوا، یہاں باراتیوں میں آدھے سے زیادہ گونگے شامل تھے، دلہا دلہن اسٹیج پر بیٹھے پوری محویت کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھے (دلہن بھی گونگی تھی) اور دور بیٹھے ہوئے گونگے ان کی ساری گفتگو سن رہے تھے، دلہا دلہن کو جب اپنی گفتگو کے نشر ہونے کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً اپنے ہاتھ ''سی'' لیے۔

گونگے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، ان میں سے اگر کسی میں کمینہ پن پایا بھی جاتا ہو تو اس کا واضح اظہار نہیں ہوتا، وہ باہمی طور پر ایک دوسرے کی خامیوں سے آگاہ ہوں گے لیکن ہم لوگ اس سے ایک حد تک باخبر رہتے ہیں اور یوں حسن ظن کا جو رویہ ہمیں تمام انسانوں کے ساتھ روا رکھنا چاہیے اور جس طرح دوسروں کی صرف خوبیوں پر نظر رکھنا چاہیے، وہ رویہ ہم کم از کم گونگوں کے ضمن میں ضرور روا رکھتے ہیں اور اسی طرح ان کی وجہ سے ہمارے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی لکھی جاتی ہے۔ گونگوں کو ہم پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ ہم زبان والے اپنی زبان اظہار کے لیے نہیں اخفاء کے لیے استعمال کرتے ہیں جبکہ گونگوں کی بے زبانی بھی زبان بن جاتی ہے۔

مجھے اچھی طرح علم نہیں کہ گونگوں میں سیاست دان ہوتے ہیں کہ نہیں؟ تاہم امکان غالب یہی ہے کہ نہیں ہوتے ہوں گے کیونکہ وہ اندھیرے میں گفتگو نہیں کر سکتے، ان کی ساری گفتگو روشنی میں ہوتی ہے۔ میں نے کسی گونگے کو اقتدار میں آتے بھی نہیں دیکھا۔ البتہ اکثر لوگ اقتدار میں آنے کے بعد گونگے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے قومی سلامتی کے سودے ہوتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں۔

یوں تو گونگے مجھے بہت پسند ہیں لیکن اس وقت بہت پرابلم پیش آتا ہے جب مجھے ان کے ساتھ براہِ راست گفتگو کرنا پڑتی ہے، اس صورت میں ہم دونوں کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور یوں لگتا ہے جیسے ہم یو این او میں تقریر کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر ہم آخر میں مشترکہ اعلامیہ جاری کر دیتے ہیں کہ ملاقات بہت مفید رہی، ملاقاتوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ گونگوں کو صرف میں ہی پسند نہیں کرتا بلکہ بیشتر لوگ مختلف وجوہ کی بنا پر انہیں پسند کرتے ہیں۔ مثلاً ہر میاں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی گونگی ہو، صنعت کار چاہتے ہیں کہ مزدور گونگے ہوں۔ زمیندار اپنے کاشتکاروں کو گونگا دیکھنا چاہتے ہیں۔ مالک گونگے ملازموں کو ترجیح دیتے ہیں اور سب سے زیادہ اگر کسی کو گونگے پسند ہیں تو وہ صاحبان اقتدار ہوتے ہیں۔ انہیں عوام کے منہ میں زبان اچھی نہیں لگتی۔ انہیں رپورٹ بھی یہی دی جاتی ہے کہ عالی جاہ سب خوش ہیں۔ کوئی نہیں بول رہا اور یہ جو شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تو یہ آپ کی رعایا ہے جو آپ کی جان کی سلامتی اور اقتدار کی درازی کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی ہے۔ اگر کسی سودا کے بالیں پر شور قیامت زیادہ ہو جائے تو خدام ادب ''ابھی آنکھ لگی ہے'' کہہ کر ظل پناہ کی نیند میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔ ایک وقت آتا ہے کہ خود ظلم پناہ قوت گویائی سے محروم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی لے لیتی ہے۔

الحمدللہ!

کچھ عرصہ پہلے تک میں بہت گنہگار مسلمان تھا، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ۔ تاہم کچھ ایسے کام ضرور کرتا تھا جن کے لیے سخت ریاضت کرنا پڑتی تھی کیونکہ میں نے کچھ علماء سے سنا تھا کہ یہ بھی نیکی کے کام ہیں، مثلاً مجھے بتایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلام کرنے میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس ضمن میں مخاطب کا مرتبہ یا مقام بھی نہیں دیکھتے تھے بلکہ راہ چلتے بچوں کو بھی آگے بڑھ کر خود سلام کرتے تھے۔ میں نے حضورؐ کی اس سنت پر عمل کرنے کی کوشش کی تو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے ہی روز جب میں اپنے نئے ماڈل کی مرسڈیز ۶۰۰ سے اُترا اور چپراسی نے آگے بڑھ کر میرا بریف کیس تھامنے کی کوشش کی تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا کہ مجھے یاد آیا کہ حضورؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے بلکہ اپنا پھٹا ہوا جوتا بھی خود گانٹھتے تھے تاہم میں اپنے چپراسی کو سلام کرنے میں سبقت حاصل نہ کر سکا کیونکہ میری کار آتے دیکھ کر دور ہی سے وہ اپنا ہاتھ ماتھے تک لے گیا تھا اور رکوع کی حالت میں چلا گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اپنے چپراسی کو سلام کرنے کے خیال ہی سے مجھے عجیب طرح کی ذلت کا احساس ہو رہا تھا، تاہم دوسرے دن دل پر پتھر رکھ کر میں نے ایک دفعہ پھر ارادہ کیا کہ آج میں یہ کام کر دکھاؤں گا مگر ایک دفعہ پھر ناکامی ہوئی اور ایسا مسلسل کئی دن تک ہوتا رہا، بالآخر ایک روز میں نے چپراسی کو بائی آرڈر سلام کرنے سے منع کر دیا اور یوں اسے سلام کرنے میں سبقت لے جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں یہ جانتا ہوں اس وقت میرا کیا حال ہوا، میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا اور مجھے یوں محسوس

ہو رہا تھا جیسے کسی نے میری چوری پکڑ لی ہو۔

پھر ایک روز میں نے سوچا کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیانت اور امانت کا حکم دیا ہے مگر میرے لیے اس حکم کی تعمیل بہت مشکل تھی، میرے سارے کاروبار کی بنیاد بد دیانتی پر تھی مگر میں نے پکا ارادہ کیا کہ میں ہر صورت میں رزق حلال پر زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے سخت نفس کشی کے بعد یہ مرحلہ بھی طے کر لیا جس سے میرا کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا، میرے کاروباری ساتھی مجھ سے منحرف ہو گئے، میرے دوست احباب پریشان دکھائی دینے لگے، میرے گھر والے مجھ سے بیزار ہو گئے لیکن میں نے اپنے عمل میں کوئی لچک پیدا نہ ہونے دی۔ میں نے ناجائز طریقوں سے لوگوں کی جائیدادوں پر قبضہ کیا ہوا تھا اور اس ضمن میں کئی مقدمے عدالت میں چل رہے تھے جن میں میری جیت یقینی تھی لیکن میں نے اپنے امانت دار رسولؐ کی سنت پر عمل پیرا ہونے کے لیے جس کا جو حق تھا اسے ادا کر دیا۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے، وہ مجھ پر ہنستے تھے لیکن میں مطمئن تھا کہ میں نے وہی کیا جو کرنے کا حکم تھا!

میں نے قرآن میں کہیں پڑھا تھا کہ تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ جو مال ہے وہ اللہ کی راہ میں خیرات کر دو، ایک سیرت کی کتاب میں حضورؐ کے حوالے سے میں نے کئی ایسے واقعات بھی پڑھے کہ حضورؐ کے پاس جو کچھ ہوتا تھا وہ دوسروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کاروبار میں نقصان پہنچنے اور لوگوں کا مال لوگوں کو واپس کرنے کے باوجود میرے پاس جو کچھ ہے، وہ اتنا زیادہ ہے کہ دس نسلوں تک ختم نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک روز میں نے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورت کے لیے کچھ اثاثے اپنے پاس رکھے اور باقی تمام جائیداد غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی۔

مگر ہوا یوں کہ اس کے بعد میرا جینا حرام ہو گیا۔ میرے بچے مجھے پکڑ کر دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے، میں چیختا چلاتا رہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا کے لیے میرے رستے میں مشکلات پیدا نہ کرو مجھے خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام پر عمل کرنے دو مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ دماغی امراض کا ڈاکٹر بہت دین دار شخص تھا اس

نے داڑھی رکھی ہوئی تھی، پنج وقتہ نمازی تھا اور بہت مہربان شخص تھا اس نے میری ساری داستان سنی اور کہا ''تم نے اپنے لیے بہت مشکل راستہ چنا ہے''

میں نے کہا ''یہ حضورؐ کا رستہ ہے اگر مشکل بھی ہے تو اس میں بالآخر میرے لیے آسانیاں پیدا ہوں گی''

ڈاکٹر بولا ''ہمیں حقائق سے اغماض نہیں برتنا چاہیے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے تھے جبکہ ہم گنہ گار ان کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں، لہٰذا ہمیں ان کی برابری کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔''

میں نے کہا ''میں نارِ جہنم سے ڈرتا ہوں''

ڈاکٹر بولا ''تم نماز پڑھتے ہو؟''

میں نے کہا ''نہیں''

''روزے رکھتے ہو؟''

میں نے جواب دیا ''نہیں''

ڈاکٹر نے پوچھا ''کیا تم خود کو گنہ گار محسوس نہیں کرتے؟''

میں نے کہا ''یقیناً لیکن میں پہلے خود کو مشکل کاموں کی عادت ڈال رہا تھا، میں نے آج سے ارکان اسلام پر پابندی سے عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر میرے بچے مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے آئے۔''

یہ سن کر ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں ہوئے اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا ''شکر ہے تم کفر سے بچ گئے'' پھر اس نے میرے بچوں کو مخاطب کر کے کہا ''اپنے والد کو باقاعدگی سے مسجد میں نماز کے لیے لے جایا کرو، یہی ان کا علاج ہے، ویسے میں یہ کچھ گولیاں بھی لکھ دیتا ہوں، آپ ایک ہفتے بعد انہیں پھر میرے پاس لے کر آئیں''

ڈاکٹر نے ایک لمبا لیکچر بھی دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ انسان کو اپنی ہمت سے بڑھ کر کام نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور الرحیم ہے۔ ہمیں ہر نماز کے بعد اس

سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے، نیز اس کے جو پیارے بندے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی خدائے غفور الرحیم کے پاس ہماری سفارش کر سکیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ان باتوں سے مجھے خاصا اطمینان حاصل ہوا، شاید اس لیے بھی کہ میں ایک مشکل راستے پہ چلتا چلتا تھک گیا تھا اور اس باوقار زندگی کے لیے ترس گیا تھا جو کروڑوں بے وقار لوگوں میں ایک خاص طرز زندگی کے طفیل حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کے جن پہلوؤں پر میں نے عمل کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے دوران مجھے یہ شعر رہ رہ کر یاد آتا تھا ؎

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اور مجھ سے اس شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی، چنانچہ میں ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی سابقہ زندگی کی طرف لوٹ گیا۔ میں نے ہیر پھیر اور فراڈ دوبارہ شروع کر دیے۔ البتہ میں نے باقاعدگی سے نماز شروع کر دی، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر بھی عمل پیرا ہوا، میں نے بزرگوں کے مزاروں پر بھی حاضری دینا شروع کر دی، باقاعدگی سے وہاں دیگیں چڑھانے کا سلسلہ شروع کیا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صورت حال یہ ہے کہ میں نے اپنی تمام کھوئی ہوئی جائیداد دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ میری کاروباری ساکھ بھی درست ہوگئی ہے اور میرے بچے بھی مجھ سے راضی ہو گئے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے علماء کے حلقوں میں بھی میری قربانیوں کو بہت سراہا جاتا ہے کہ علاقے کی تمام مسجدیں میرے عطیات سے چلتی ہیں، میں دینی مدرسوں کی بھی دل کھول کر مدد کرتا ہوں، اپنی کمائی میں سے غرباء اور مساکین میں ڈھائی پرسنٹ زکوٰۃ بھی تقسیم کرتا ہوں اور یوں ضمیر کو ایک اطمینان سا نصیب ہوتا ہے۔ پہلے میں خود کو گنہ گار سمجھتا تھا۔ اب الحمدللہ دوسروں کو گنہ گار سمجھتا ہوں!

گورکن!

''یار ذہن پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''دو تین برس پیشتر ایک نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ تم اٹھاون برس کی عمر میں فوت ہو جاؤ گے۔''

''تو تم نے اس بات پر یقین کر لیا؟''

''ہاں، کیونکہ کچھ دنوں سے میں بیمار رہنے لگا ہوں''

''تو کیا اس سے پہلے تم کبھی بیمار نہیں ہوئے تھے؟''

''کئی بار ہوا ہوں، لیکن اس پیشین گوئی کے بعد مجھے ہر مرض، مرض الموت لگتا ہے''

''یار تم اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی ہو، خاصے مذہبی بھی ہو، اس کے باوجو......''

''ہاں تم مجھے توہم پرست کہہ رہے ہو مگر مجھے اپنے اس وہم پر کوئی اختیار نہیں ہے''

''ارے بھائی یہ سب فضول باتیں ہیں، یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟''

''میں جانتا ہوں، مگر انسان اپنے توہمات پر ابھی تک قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا''

''ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، میرے ایک عزیز نے چند برس پیشتر نجومی کو ہاتھ دکھایا اس نے کہا کہ تم پینتیس کراس نہیں کر سکو گے''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ کہ وہ بچارا سہم کر رہ گیا، اس نے فیصلہ کر لیا وہ شادی نہیں کرے گا''

''یہ تو خیر توہم پرستی کی انتہا ہے''

''یہی بات ہم نے بھی اسے سمجھائی لیکن اسے یقین کامل تھا کہ وہ پینتیسویں برس کی عمر میں انتقال کر جائے گا۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ جس دن اس کی پینتیسویں سالگرہ تھی اس دن اسے ہلکا سا بخار ہوا اور وہ مر گیا''

''کیا کہا، مر گیا......؟''

''اصل میں وہ نفسیاتی دباؤ میں آ گیا ہوگا۔ اسے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا اور یقین ایسی چیز ہے جو زندگی اور موت کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ نجومیوں کی باتوں کو اتنا سیریس نہیں لینا چاہیے، تم اٹھاون برس تو کیا انشاء اللہ ایک سو اٹھاون برس زندہ رہو گے''

''خیر مجھے اتنی زندگی بھی درکار نہیں''

''بالکل یہی بات میرے دادا جان بھی کہا کرتے تھے، ایک نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ ساٹھ سال کی عمر میں آپ کی زندگی کو خطرہ ہے اگر آپ ساٹھ کراس کر گئے تو بہت طویل عمر پائیں گے۔ دادا جان نے ہنس کر کہا مجھے زیادہ لمبی عمر بھی نہیں چاہیے!''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر وہ ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گئے''

''یار تم عجیب آدمی ہو تم تو مجھے میرے وہموں سے نکالنا چاہتے تھے کہ نجومی ایسے ہی تکے لگاتے ہیں ان کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ مگر تم مسلسل یہ ثابت کرنے میں بھی لگے ہوئے ہو کہ ان کی پیشین گوئیاں ہمیشہ درست نکلتی ہیں''

''معافی چاہتا ہوں اگر تم نے میری باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کیونکہ میں درحقیقت اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا میری ایک پھوپھی زاد بہن کا ہاتھ دیکھ کر ایک نجومی نے پیشین گوئی کی کہ تم پچیس برس کی عمر میں مر جاؤ گی مگر اس کی پیشین گوئی غلط نکلی''

''واقعی؟''

''بالکل! کیونکہ اس نے چھبیس برس کی عمر میں انتقال کیا''

''اوہ خدایا!''

''یار تم تو ڈر گئے ہو، میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کیونکہ میرے نزدیک زندگی اور موت کا فیصلہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا اپنے فیصلوں سے کسی کو آگاہ نہیں کرتا''

''میں تم سے متفق ہوں، مگر تم نے جو دو تین مثالیں گنوائی ہیں؟''

''وہ محض تکا لگانے والی بات ہے نیز وہی بات جو تم نے خود کہی کہ جب کسی شخص کو اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے بلکہ وہ اگر شبے میں مبتلا بھی ہو تو موت واقعی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس لیے انسان کو اس طرح کے واہموں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''تھینک یو یار، تم نے مجھے کچھ حوصلہ دیا ورنہ یقین کرو تمہاری باتیں سن کر میرا حوصلہ تو بالکل پست ہو گیا تھا''

''میں تو تمہیں بہت بہادر آدمی سمجھتا تھا مگر تم تو بہت کمزور نکلے، اب خدا کے لیے یہ وہم دل سے نکال دو کہ تم اٹھاون برس کی عمر میں انتقال کر جاؤ گے''

''بالکل نکال دیا، اب تم میری طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری باتوں کا اثر لیا تاہم احتیاط بہتر ہوتی ہے ان دنوں معمولی بیماری کو بھی معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا بلکہ اسے سیریس لینا، آخر احتیاط میں کیا حرج ہے؟''

''لعنت ہے تم پر، میں تو تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا مگر تم تو ہمارے ان دانشوروں کی طرح نکلے جو قوم کو ہر وقت اس کی وفات کا یقین دلانے میں لگے رہتے ہیں اور قوم کو ڈپریشن میں مبتلا کر دیتے ہیں، قوم خود اعتمادی سے کام لے کر جب کبھی اس ڈپریشن سے نکلنے میں کامیاب ہوتی ہے ہمارے دانشور اسے ایک دفعہ پھر اس کی موت کا یقین دلانے لگتے ہیں۔ مجھے تم بھی گورکن لگے ہو اور مایوسی پھیلانے والے یہ دانشور اور سیاستدان بھی، جن کے لیے موت زندگی کا پیغام لاتی ہے لیکن اب میں تمہیں زندہ رہ کر دکھاؤں گا تاکہ کالی زبانوں پر سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ سکے۔''

صدارت کے لیے دو موزوں ترین اُمیدوار!

ان دنوں اخباروں میں متوقع صدارتی اُمیدواروں کے ناموں کی فہرستیں شائع ہو رہی ہیں۔ جو نام پورے تواتر سے پڑھنے میں آ رہے ہیں ان میں وسیم سجاد، حامد ناصر چٹھہ، نوابزادہ نصراللہ خان، اصغر خان، مرزا اسلم بیگ اور یادش بخیر معین قریشی اور غلام اسحاق خان وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اخبار والے دو ناموں کے سلسلے میں مسلسل ڈنڈی مار رہے ہیں۔ حالانکہ یہی دو اصلی صدارتی اُمیدوار ہیں باقی ہیر پھیر ہے۔ ان دو اصلی اُمیدواروں میں ایک تو یہ ننگ اسلاف ہے اور دوسرے اپنے مجاہد اُردو ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کے دور میں اپنے علاوہ کسی کو کچھ سمجھنا بہت مشکل ہے لیکن یہ ننگ اسلاف پوری دیانتداری سے محسوس کرتا ہے کہ اگر فائنل میچ ان دو اُمیدواروں میں پڑ جائے تو مجاہد اُردو کا حق فائق ہے!

مجاہد اُردو ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری بھی گزشتہ ہفتے اسلام آباد کا تین روزہ دورہ مکمل کر کے واپس لاہور پہنچے ہیں اور سیدھے میرے پاس آ کر رپورٹ کی ہے۔ دو حریفوں میں ایک دوسرے پر اعتماد اور خیر سگالی کے اس قدر جذبات آج کل کہاں پائے جاتے ہیں مگر راقم اور مجاہد اُردو کا دم غنیمت ہے کہ پرانی وضع نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ مجاہد اُردو کا دورہ اسلام آباد صدر اور وزیر اعظم سے ملاقات کے سلسلے میں تھا۔ صدر سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکی چنانچہ موصوف ایوان صدر کے ایک گارڈ سے معانقہ کر کے اور اسے اپنی صدارتی اہلیت کے بارے میں قائل کر کے واپس آ گئے۔ نگران وزیر اعظم معین

قریشی کے کان میں مجاہد اُردو کی بھنک پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے اندر اس مردِ مجاہد کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتے تھے، سو وہ ان کی آمد سے پہلے ہی اپنے سسرالی ملک امریکہ بھاگ گئے۔ مجاہد اُردو کا ارادہ نگران وزیراعظم کی جانشین اور اصلی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات کا تھا مگر وہ کانفرنس میں شرکت کا بہانہ بنا کر قبرص روانہ ہو گئیں تاہم مجاہد اُردو کا دورہ اسلام آباد بالکل رائیگاں نہیں گیا کیونکہ ان کی جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق ''مجاہد اُردو نے وہاں تقریباً تمام ایم این ایز، چند سینیٹروں تک اپنا انتخابی لٹریچر پہنچایا'' یہ انتخابی لٹریچر مجاہد اُردو کی دو گراں بہا تصانیف پر مشتمل ہے جس میں سے ایک کتاب کا نام ''حیران ہوں آخر کیا ہوں میں'' اور دوسری کتاب کا نام ''مخلصین ملک و ملت پارٹی کیوں اور کس لیے قائم ہوئی'' ہے۔ پہلی کتاب کے نام کے حوالے سے احباب کو گلہ ہے کہ مجاہد اُردو نے اس ضمن میں انکسار سے کام لیا ہے کیونکہ صرف وہ نہیں ساری دنیا حیران اور پریشان ہے کہ مجاہد اُردو آخر ہیں کیا؟ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بنایا ہے تو یقیناً ان کا کوئی مصرف بھی ہوگا، یہ مصرف آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، اب وہ صدارتی اُمیدوار بنے ہیں تو سمجھ آیا ہے۔ مگر خاک سمجھ آیا ہے؟

میں اگر مجاہد اُردو کے حوالے سے اس قدر رطب اللسان ہوں تو اس لیے نہیں کہ انہوں نے صدر بننے کی صورت میں مجھ سے کچھ وعدے وعید کیے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ زمانہ تو پیشگی پکڑنے کا ہے۔ مجاہد اُردو کی مدلل مداحی میں صرف ان کی کوالیفیکیشنز کی بنا پر کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک وہ کم از کم غلام اسحاق کی ٹکر کے اُمیدوار ضرور ہیں۔ ان دو بڑی شخصیتوں میں موازنہ مقصود نہیں، صرف اظہارِ حقیقت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ غلام اسحاق خان کے منہ بھی دانت نہیں ہیں، مجاہد اُردو نے بھی حال ہی میں نیا جبڑا لگوایا ہے تاکہ صدر بننے کے بعد کھانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ غلام اسحاق خاں صاحب کی تعلیمی اہلیت کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن مجاہد اُردو کے بارے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انہوں نے بی اے کا امتحان دے رکھا ہے اور انگریزی کے علاوہ باقی تمام مضامین میں پاس بھی ہو چکے ہیں۔ غلام اسحاق خان اسمبلیاں توڑنے کے ماہر ہیں جبکہ اپنے مجاہد اُردو شاعری کے کس بل نکالنے کے ماہر ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے امور

ہیں جن پر مجاہد اُردو کو جناب غلام اسحاق پر فوقیت حاصل ہے مثلاً موصوف سنگر بھی ہیں، گزشتہ روز غریب خانے پر تشریف لائے تو انہوں نے اپنی تین غزلیں راگ ملہار میں سنائیں حالانکہ میں نے عرض بھی کیا کہ موسم خاصا خوشگوار ہے، بارش کی ضرورت نہیں، ادب کے علاوہ مجاہد اُردو ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہیں اور ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب مخلصین ملک وملت پارٹی کے صدر بھی ہیں، علاوہ ازیں انجمن بقائے اُردو (منشور شدہ) کے بھی صدر ہیں اور یوں صدر کا عہدہ ان کے لیے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، یہ تو ملک وقوم کا درد ہے جس کی وجہ سے وہ اس خارزار میں قدم رکھ رہے ہیں، آخر معین قریشی بھی تو انکل سام کے ملک سے وزیٹرویزے پر پاکستان تشریف لائے اور ملک وقوم کو حب الوطنی کا درس دے کر یہ خاک واپس وہیں پہنچ گئی جہاں کا خمیر تھا۔

اور پیارے قارئین! سچی بات یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر ایک نیک آدمی ہوں۔ دھوکہ فریب مجھے آتا نہیں، اگر کبھی کوشش بھی کروں تو اس راستے پر دو گام چلنے کے بعد میرا سانس پھول جاتا ہے اور اس دفعہ بھی یہی ہوا ہے۔ میں نے کالم کے شروع میں یہ تاثر دیا تھا کہ میں مجاہد اُردو کے مقابلے میں دستبردار ہو چکا ہوں اور یہ کہ صدارتی مسند پر ان کا حق فائق ہے جبکہ حقیقت یہ ہے (اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے) کہ میں میدان میں پوری طرح موجود ہوں۔ میری اور مجاہد اُردو کی صرف لابنگ میں فرق ہے۔ یہ معصوم آدمی ایم این ایز، سینیٹرز، صدر اور وزیراعظم کے آستانوں کی خاک چھان رہا ہے جبکہ میری ساری تگ ودو اس طاقت کو قائل کرنے میں صرف ہو رہی ہے جس نے فیصلہ کرنا ہے کہ صدر کون ہوگا؟ اگر آپ یہ بات اپنے تک رکھیں تو میں بہت حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوگیا ہوں چنانچہ اب میدان میں صرف دو اُمیدوار رہ گئے ہیں جن میں سے ایک نے صدارتی مسند پر فائز ہونا ہے ایک معین قریشی اور دوسرے میں! معین قریشی کو صرف ایک معاملے میں مجھ پر ''فضیلت'' حاصل ہے اور وہ یہ کہ موصوف پینتیس سال سے امریکہ میں رہ رہے ہیں اور امریکی شہری ہیں جبکہ میں دو سال امریکہ میں رہنے کے بعد واپس پاکستان آگیا تھا اور بدقسمتی سے پاکستانی شہری ہوں۔

رسید سے مطلع فرمائیں!

آج تک ٹریفک سگنلز کے بارے میں یہی سننے میں آیا ہے کہ ان سے ٹریفک کنٹرول کیا جاتا ہے، عوام الناس کو ڈسپلن سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ سرخ بتی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب آپ چوک کراس نہیں کر سکتے لہٰذا جہاں ہیں وہیں رُک جایئے۔ پیلی بتی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اشارہ تبدیل ہونے والا ہے اور سبز بتی اس امر کی علامت ہے کہ بلا دھڑک سڑک پار کر جائیں! رات کے وقت یا کم رش والے علاقوں میں پیلی بتی جل بجھ رہی ہوتی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ دائیں بائیں دیکھ کر سڑک کراس کریں یا رُک جائیں یعنی فیصلے کا اختیار آپ کو دے دیا جاتا ہے۔

لیکن کچھ ''اشارے'' اس کے علاوہ بھی ہیں جن کے مطابق اہل نظر رُک جانے، آگے بڑھنے یا اِدھر اُدھر دیکھ کر پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں مگر وہ کالم کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے، اس کے لیے محلے والوں کو کنفیڈنس میں لینا پڑتا ہے۔ تاہم اس وقت میں جن اشاروں کی بات کر رہا ہوں وہ عام نوعیت کے معاملات کے حوالے سے ہیں، ماشاء اللہ ہم ایک مہذب ملک کے شہری ہیں چنانچہ ہمارے ہاں بھی وہ تمام اچھے قوانین موجود ہیں جو مہذب ملکوں میں پائے جاتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں یہ سب کے لیے ہیں ہمارے ہاں کچھ کے لیے ہیں، کچھ کے لیے نہیں ہیں۔ عوام الناس کے لیے ہم نے ایک بہت بڑی سرخ بتی جلا رکھی ہے جو آتش پرستوں کی آگ کی طرح ہر وقت جلتی رہتی ہے، اس سرخ بتی کا مطلب ہے آپ اپنی جگہ کھڑے رہیں، دوسری

طرف سبز بتی جل رہی ہوتی ہے جو خواص کے لیے ہوتی ہے اور وہ بلا دھڑک ادھر ادھر سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ رُکنے ہی میں نہیں آتا، جب عوام واویلا مچانا شروع کرتے ہیں اور حالات بے قابو ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے انہیں بھی گزرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے لیکن پھر فوراً ہی سرخ بتی آن ہو جاتی ہے اور خواص ایک دفعہ پھر جوق در جوق اپنے پسندیدہ رستوں سے یوں گزرنا شروع کر دیتے ہیں جیسے بہشتی دروازے سے گزر رہے ہوں۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ دکھاوے کے لیے حکمرانوں کو سرخ بتی جلانی پڑتی ہے لیکن اس سے پہلے وہ طبقہ خواص کو پیلی بتی جلا کر اشارہ دے دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد بتی سرخ ہونے والی ہے چنانچہ وہ اپنا اسٹاک (جو گناہوں کا بھی ہو سکتا ہے) مارکیٹ میں لے آئیں یا اسے روک لیں، سو یہ وہ سلسلہ ہے جو گزشتہ ۴۵ برس سے جاری وساری ہے اور ''باخبر ذرائع کے مطابق'' مستقبل قریب میں بھی جاری رہے گا!

میں نے اپنے ایک دوست سے اس صورت حال کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ اس میں کڑھنے کی کوئی بات نہیں، اس کی دلیل یہ تھی کہ ٹریفک کے قوانین لچک دار ہوتے ہیں یعنی چوک میں کھڑے سپاہی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ٹریفک سگنلز کی موجودگی کے باوصف معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر جدھر سے چاہے ٹریفک گزار دے اور جدھر سے چاہے روک دے۔ کیونکہ اگر قانون پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے تو اس سے کئی طرح کے ''بحران'' پیدا ہو سکتے ہیں، اسی طرح یہ لچکدار رویہ عام قوانین کے ضمن میں بھی برتا جا سکتا ہے، اگر دوسرے مہذب ملکوں میں اس کا رواج نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک اچھا کام اس لیے نہ کریں کہ مہذب ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ مہذب ملکوں کے قوانین سے پابندی کرانے سے اتنے بڑے بڑے سیاسی بحران تو پیدا نہیں ہوتے جتنے ہمارے ہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہمارے ہاں ٹریفک سگنلز کی موجودگی کے باوجود ایک وردی والا معاملات اپنے ہاتھ لے لیتا ہے تو وہ ٹھیک کرتا ہے!

اگر میرے قارئین میں کسی سادہ لوح قاری کا خیال ہے کہ میں نے اپنے اس دوست سے اختلاف کیا ہوگا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے، میں ''دہ'' جماعتیں پاس ہوں، مجھے پتا ہے کہ کہاں اختلاف کرنا ہوتا ہے اور کہاں نہیں کرنا ہوتا، البتہ اس ضمن میں مجھے ایک معمولی سا اختلاف ہے اور اس قسم کے صحت مند اختلاف کی اجازت انتہائی آمرانہ نظام میں بھی ہوتی ہے جبکہ ہمارے ہاں تو ماشاء اللہ جمہوریت ہے، اختلاف یہ ہے کہ عوام اور خواص کے لیے علیحدہ علیحدہ قوانین میں یقیناً کوئی حرج نہیں لیکن رکھ رکھاؤ بھی کوئی چیز ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے چوراہوں میں سگنلز نصب ہیں، یہ سگنلز جن کے کنٹرول میں ہیں ان کے اشارے سے جلتے بجھتے بھی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اشارے بہت واضح ہوتے جارہے ہیں، پہلے تو عوام کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کی باری آنے پر بتی اچانک سرخ کیوں ہو جاتی ہے اور خواص کے لیے یہ مستقل سبز کیوں رہتی ہے لیکن قومی اور بین الاقوامی میڈیا کے پھیلاؤ کی وجہ سے عام لوگوں تک بھی وہ باتیں پہنچنا شروع ہوگئی ہیں جو خواص تک سینہ بہ سینہ پہنچائی جاتی تھیں اور ظاہر ہے یہ بات ملک وقوم کے مفاد میں نہیں چنانچہ اگر ہمارا مقتدر طبقہ چل چلاؤ نہیں چاہتا تو اسے رکھ رکھاؤ کا یہ رویہ اپنانا پڑے گا، خدانخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی بدعنوانیوں پر مشتمل جو نظام ہم نے اتنی ہمت سے اور اتنے طویل عرصے میں نافذ کیا ہوا ہے، اسے درہم برہم کردیا جائے بلکہ میری ان گزارشات کا مطلب صرف یہ ہے کہ احتیاط سے کام لیا جائے عوام کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو مقتدر طبقہ ان کے ساتھ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ سب کچھ اتنا واضح نہ ہو کہ اپنی بدحالی کا جو الزام وہ صدیوں سے مقدروں کو دیتے آئے ہیں، وہ خواہ مخواہ مقتدر طبقے کے کھاتے میں ڈالنا شروع کردیں۔ اُمید ہے میری یہ تجویز مقتدر طبقے کو پسند آئے گی، اس صورت میں مال غنیمت میں کچھ حصہ اس ازلی وفادار کو بھی ملنا چاہیے۔ متعلقہ حلقوں سے درخواست ہے کہ تجویز کی معقول قسم کی ''رسید'' سے براہ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیں، شکریہ!

پھوپھی خدا بخش سے ایک مکالمہ!

''انکل کیا حال ہے آپ کا؟''
''ہائے اللہ، میں تمہیں انکل لگتی ہوں؟''
''سوری، کنفیوژ ہو گیا تھا، کیا حال ہے آنٹی آپ کا؟''
''ہائے ہائے میں تمہیں آنٹی لگتی ہوں، عمر میں تم سے ایک دو سال چھوٹی ہی ہوں گی؟''
''ایک دفعہ پھر معذرت چاہتا ہوں، مس کیسی ہیں آپ؟''
''میں تو ٹھیک ہوں لیکن تمہارے کالم ٹھیک نہیں جا رہے''
''کیوں، کیا ہوا میرے کالموں کو؟''
''تمہیں سارے ملک میں نواز شریف اور بے نظیر ہی نظر آتے ہیں، ہم لوگ نظر نہیں آتے؟''
''کیوں نہیں نظر آتے لیکن ان دنوں الیکشن کی گہما گہمی ہے اس لیے نواز شریف اور بے نظیر ہی کو موضوع بنا رہا ہوں''
''تو کیا الیکشنوں سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے؟''
''کیوں نہیں لیکن آپ ووٹر ہیں، میں اُمیدوار ہوں......''
''یہ تو تمہاری بے خبری کا عالم ہے، ہمارے طبقے کے کتنے ہی لوگ الیکشن میں اُمیدوار ہیں اور تم کو وہ دکھائی نہیں دیتے''
''یہ تو واقعی میرے لیے خبر ہے، آپ مجھے فوراً ان کے نام بتائیں''
''نام بتاؤں، تم نہیں جانتے انہیں؟''

''میں واقعی نہیں جانتا''

''اب اتنے بھولے بھی نہ بنو، روزانہ ان کے اتنے بڑے بڑے بیانات اخباروں میں شائع ہوتے ہیں''

''بیانات اخباروں میں شائع ہوتے ہیں، میں روزانہ قریباً سارے اخبارات پڑھتا ہوں، میری نظروں سے تو ''کسی'' کا بیان نہیں گزرا''

''قربان جاؤں تمہاری سادگی کے۔ گویا تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو ملک میں ہماری آبادی کم کر کے دکھانا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں ہمارے حقوق سے محروم رکھا جا سکے''

''میں سمجھا نہیں''

''میں سمجھاتی ہوں، تمہیں''

''نہیں مس فار گاڈ سیک، ڈیمانسٹریٹ کرنے کی ضرورت نہیں، آپ زبانی بتائیں، مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ اوہ خدایا!''

''آ گیا نا اعتبار، تو ہیجڑے صرف ہم ایسے نہیں ہوتے، ہیجڑے ہزار طرح کے ہوتے ہیں اور تم انہیں مسلسل نظر انداز کر رہے ہو''

''میں سمجھ گیا مس، لیکن آپ کس پارٹی کے ہیجڑوں کی بات کر رہی ہیں؟''

''سبھی پارٹیاں میرے مدنظر ہیں، تم کسی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر رہے''

''میرا خیال ہے میں ایسا نہیں کر رہا، میں نے تو مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی اسمبلی سے مرحوم ضیاء الحق تک کی اسلامی مجلس شوریٰ تک کے ہیجڑوں کے قصیدے لکھے پھر بے نظیر اور نواز شریف کے عہد کے ممتاز اور برگزیدہ ہیجڑے بھی میرے پسندیدہ موضوع رہے ہیں۔ اسی طرح ہماری قوم نے بھی اس طبقے کے ساتھ کبھی بے انصافی نہیں کی چنانچہ ان اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی ان کی کل آبادی کے تناسب سے زیادہ رہی، مجھے تو اس دفعہ بھی اس طبقے کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے، ویسے تمہارا کس پارٹی سے تعلق ہے؟''

''بہت افسوس کی بات ہے۔ پھوپھی خدا بخش......''

''پھر وہی پھوپھی، میں تمہیں پھوپھی لگتی ہوں؟''

''تو اور کیا ہو، ابھی تک تم نے مجھے پہچانا جو نہیں میں تو اتنی دیر سے تمہارے حافظے کو آزما رہی تھی مجھے غور سے دیکھو میں باجی عبدالغفور ہوں''

''ہائے میں صدقے جاؤں، میں واری جاؤں، تمہارے کالم تو میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں، تم نے ہر حکومت جانے کے بعد اس کے بارے میں سخت کالم لکھے ہیں لیکن تم بھولی بہت ہو!''

''وہ کیسے پھوپھی خدا بخش؟''

''نواز شریف برسر اقتدار تھا تو اس نے کہا ملک نے اقتصادی طور پر بہت ترقی کی ہے، تم نے اس پر یقین کر لیا اور لکھا کہ ہاں واقعی ترقی کی ہے۔ امریکہ نے نواز شریف کو ہٹا کر اپنے تحصیلدار قرقی معین قریشی کو بطور وزیراعظم پاکستان بھیجا اور اس نے کہا کہ سابقہ حکومت کی اکنامک پالیسی اچھی تھی ہم جاری رکھیں گے آپ نے یقین کر لیا پھر اس نے کہا نواز شریف حکومت اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو چکی تھی۔ تم نے اس پر بھی یقین کر لیا اور کہا ہاں واقعی دیوالیہ ہو چکی تھی۔ میری جان اتنی آسانی سے لوگوں کی باتوں میں نہ آ جایا کرو، یہ موئے مرد بڑے بے ایمان ہوتے ہیں، ایسے ہی نقصان کرا بیٹھو گی!''

''وہ کیسے پھوپھی خدا بخش؟''

''ہائے اللہ کتنی نا سمجھ ہو تم، اگر نواز شریف پھر برسر اقتدار آ گیا تو؟''

''نا سمجھ باجی عبدالغفور نہیں، پھوپھی خدا بخش تم ہو۔ اگر نواز شریف برسر اقتدار آ گیا تو کیا اسے پھر ہماری ضرورت نہیں پڑے گی۔ گزشتہ ۴۵ برس میں کون سی حکومت ایسی آئی ہے جسے باجی عبدالغفور ایسے کالم نگاروں کی ضرورت نہیں پڑی؟ در در جا کر ڈھول جیسی پھٹی آواز میں مبارک بادیاں گا کر دس دس روپے کی ودھائیاں وصول کرنے سے بہتر ہے کہ تم بھی کالم نگار بن جاؤ۔ آخرت تو خراب ہے ہی، کیوں اپنی دنیا بھی خراب کرتی ہو پھوپھی خدا بخش؟

بچارا تخم ملنگا پینے والا اُمیدوار!

انتخابی سرگرمیاں اگرچہ تاحال عروج پر نہیں پہنچیں تاہم لاہور کے ان علاقوں میں خاصی گہما گہمی پائی جاتی ہے جن کی وجہ سے لاہور زندہ دلوں کا شہر کہلاتا ہے۔ میں نے گوالمنڈی، نسبت روڈ اور اندرون شہر کے کچھ حصوں کا چکر لگایا ہے اور صرف انتخابی نہیں ایک مخصوص ثقافتی فضا کا بھی لطف اُٹھایا ہے۔ اُمیدواروں کے کارکن سرِشام قناتیں لگا کر، کرسیاں بچھا کر اور قمقمے جلا کر بیٹھ جاتے ہیں، خوب گپ شپ ہوتی ہے، راہگیر انہیں اور یہ راہ گیروں کو دو اُنگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر دکھاتے ہیں۔ سیاسی کارکنوں کی انا کو اگر تسکین ہوتی ہے تو وہ بھی انہی دنوں میں ہوتی ہے۔ اُمیدوار ان سے شیر شکر ہو جاتے ہیں، ان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہیں، ان کے بال بچوں کا حال پوچھتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اگر وہ اسمبلی کے ممبر بن گئے تو صرف کاغذوں میں ان کا نام ہوگا۔ ورنہ اصل ممبر تو ان کے یہ کارکن ہوں گے۔ کارکنوں کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ اُمیدوار کو دیکھتے ہی اسے سارے دن کا احوال سنانے لگتے ہیں ان میں سے کچھ اُمید دلاتے ہیں، کچھ مشورے دیتے ہیں، کچھ جوڑ توڑ سکھاتے ہیں اور اُمیدوار جوان سب کا گرو ہوتا ہے ان کی باتیں کچھ اس توجہ سے سنتا ہے جیسے تمام اعضاء میں سے اس کے صرف یہ دو کان چالو حالت میں ہیں۔ کچھ سیاسی کارکن کارروائی ڈالنے کے ماہر ہوتے ہیں، انہوں نے خواہ سارے دن میں تنکا بھی نہ توڑا ہو مگر اُمیدوار کو تاثر یہی دیتے ہیں کہ سارا بوجھ انہی نے اپنے دو سینگوں پر اُٹھایا ہوا ہے۔

ان علاقوں میں کارکنوں کے علاوہ ووٹروں کی بھی خاصی خاطر مدارت ہو رہی ہے۔ ایک اُمیدوار کے ہاں بہت عمدہ قسم کی بریانی دستیاب ہے، دوسرے اُمیدوار کے ہاں بھنا ہوا گوشت ملتا ہے اور تیسرے اُمیدوار نے باقر خوانیوں، کشمیری چائے کی ''سبیل'' لگائی ہوئی ہے اور یوں یہ اُمیدوار، اُمید لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کا نمک حلال کیا جائے گا لیکن وہ یہ بات بھول رہے ہیں کہ علاقے کے خوانچہ فروش ان کے خلاف مہم چلانے کی سوچ رہے ہیں کیونکہ ان مہمان نوازیوں کی وجہ سے ان کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے، چلیں مہم نہ بھی چلائیں لیکن اگر دعاؤں میں اثر ہوسکتا ہے تو بددعائیں بھی تاثیر سے اتنی خالی تو نہیں ہوتیں!

ایک اُمیدوار سے میں نے پوچھا ''جناب والا آپ جو انواع و اقسام کے کھانے اپنے ''مبینہ'' ووٹروں کے لیے تیار کراتے ہیں، اگر انہوں نے پولنگ پر پہنچ کر یہ ''حلال'' نہ کیے تو کیا بنے گا؟ اُمیدوار نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''جناب بننا کیا ہے، بس حساب برابر ہو جائے گا، ہم نے کون سے ان کے ووٹ آج تک حلال کیے ہیں جو ان سے ''نمک حرامی'' کا گلہ کرنے بیٹھیں گے؟'' لاہور کے ایک حلقے میں ہر الیکشن کی طرح اس دفعہ بھی قبلہ ٹونا پیر صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ اور حسب معمول ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں میں نے پوچھا ٹونا پیر صاحب! آپ نے نہ کوئی بینر لگوایا ہے، نہ پوسٹر چھپوائے ہیں اور نہ زبانی کسی کو ووٹ دینے کے لیے کہتے ہیں، آخر ماجرا کیا ہے؟''

بولے ''آپ بھی پیر ہیں اور آپ سے کیا پردہ؟ الیکشن میں، محض اس لیے کھڑا ہو جاتا ہوں کہ کل کلاں فراڈ وغیرہ کے مقدمے میں دھر لیا جاؤں، تو کہہ سکوں کہ مجھ پر یہ کیس سیاسی دشمنوں کی وجہ سے بنایا گیا ہے، ورنہ ہم فقیروں کو دنیاداری کے ان کاموں سے کیا سروکار؟

ایک اور اُمیدوار ان دنوں اپنے ووٹروں کے ثقافتی جذبات کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ وہ گھر سے خالص لاہوری لباس گھٹنوں سے نیچا ریشمی کرتہ اور لاچہ پہن کر باہر نکلتے

ہیں، لمبے حلوائی کی دکان پر کھڑے ہو کر پیڑوں والی لسی کے دو گلاس پیتے ہیں، آدھے گھنٹے بعد ''علی الاعلان'' دودھ جلیبی کا ناشتہ کرتے ہیں، دوپہر کو اپنے حواریوں کے ساتھ لکشمی چوک کا رُخ کرتے ہیں اور چکڑ چھولے، گردے کپورے غرضیکہ جو چیز ہاتھ لگتی ہے کھا جاتے ہیں، سہ پہر کو بھاٹی چوک سے مچھلی کھاتے ہیں اور رات کو کھانے سے پہلے میکلوڈ روڈ پر کشمیری چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مالشیے سے سر پر ''چانپی'' کراتے ہیں۔ موصوف کی ان تمام سرگرمیوں کا مقصد اپنے ووٹروں کو یہ باور کرانا ہے کہ وہ خالص لاہوریے ہیں اور مزید ''یقین دہانی'' کے لیے وہ رات کو منعقد ہونے والے انتخابی جلسوں میں اپنے مخالف اُمیدوار کو ''تڑیاں'' بھی لگاتے ہیں۔ مخالف اُمیدوار سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو اس نے کہا ''مجھے اپنے اس مدمقابل کی طرف سے یقینی طور پر ٹھنڈی ہوا آئے گی کیونکہ وہ جو کچھ کھا پی رہا ہے، اسے ہضم نہیں ہو سکے گا اور وہ ثقافتی موت مارا جائے گا'' مجھے یہ حضرت خاصے سادہ لوح لگے کہ جو لیڈر آبائی طور پر انگریزوں کے زمانے سے ''کھاتے پیتے'' آ رہے ہیں، آج تک ان کی سیاسی موت واقع نہیں ہوئی تو ''تخم ملنگا'' پینے والے بے چارے سادہ لوح اُمیدوار کی موت کیسے واقع ہوگی بلکہ کیوں واقع ہوگی؟

✧ ✧ ✧

اُف یہ نظریاتی لوگ!

میرے ایک دوست نے پوچھا ''کیا تم نظریاتی شخص ہو؟''
میں نے کہا ''خدا نہ کرے ایسا ہو''
اس نے حیران ہو کر پوچھا ''وہ کیوں؟''
میں نے کہا ''نظریات کے نام پر لوگ کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ کسی نے قرآن کی تعلیم کے نام پر بیسیوں ایکڑ زمین الاٹ کرائی ہے، کسی نے حدیث کی تعلیم کے نام پر سرکاری زمین کوڑیوں کے مول خریدی ہے، کوئی نظریاتی تعلیم کے نام پر کاروباری تعلیمی ادارے بناتا جا رہا ہے نظریاتی سیاستدان مسلم لیگ کو چھابڑی میں رکھ کر فروخت کر رہے ہیں، نظریاتی کالم نگار پلازے بنا رہے ہیں، نظریاتی دانشور ڈمی اداروں کے ذریعے حکومت سے کروڑوں روپے بٹور رہے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اتنے سارے ''نظریاتی'' لوگوں کے درمیان کوئی ''غیر نظریاتی'' شخص بھی ہو؟''
دوست میری اس گفتگو سے کچھ پریشان ہوا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا ''اگر کوئی شخص نظریہ کیش کرانا نہیں چاہتا تو اچھی بات ہے لیکن اسے کسی نظریاتی گروپ کے ساتھ ہونا تو چاہیے'' میں نے کہا ''یہ بھی کوئی ضروری نہیں کیونکہ گروپ کے سچ کے علاوہ اس کے جھوٹ میں بھی شامل ہونا پڑتا ہے جبکہ سورج کی کرنوں کی طرح سچائی بھی کئی آنگنوں میں پھیلی ہوتی ہے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی ساری سوچ نہ مثبت ہے اور نہ ساری سوچ منفی ہے۔ کچھ حقیقتیں فرائڈ کے ہاں بھی ہیں، کارل مارکس کے ہاں بھی ہیں اور ان کے ہاں بھی جو انسانی مسائل کو ان مفکروں کی

نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنا گند ہے، وہ نظریاتی گروپوں کی وجہ سے ہے، یہ شیعہ کیا ہیں، یہ سنی کیا ہیں، یہ دیو بندی کیا ہیں، یہ بریلوی کیا ہیں اور ان کی مسلح عسکری تنظیمیں کیا ہیں؟ سیاست میں بھی جتنا گند ہے، اس کی وجہ یہ نظریاتی گروپ ہی ہیں۔ ''لوٹے'' بھی نظریاتی ہیں اور انہیں پوری ڈھٹائی سے ''لوٹا'' کہنے والے ''لوٹے'' بھی نظریاتی گروپوں کے کارکن ہیں۔ الیکشن میں بھی دو نظریاتی گروپ آمنے سامنے ہوتے ہیں اور ان دونوں گروپوں سے ایک جیسے لوگ ہی جیتنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمیں نظریے کے نام پر اپنے گروپ کے جھوٹے کو ووٹ دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ باتیں چھوڑو، کوئی اور بات کرو''

میرا دوست پہلے میری گفتگو سے صرف پریشان ہوا تھا، اس دفعہ وہ ''حیران و پریشان'' ہو گیا اور بولا ''دراصل ہمارے ہاں کوئی نظریاتی گروپ ہے ہی نہیں، مفاد پرستوں کے ٹولے ہیں جنہوں نے اپنی دھڑے بندیوں کو نظریاتی گروپ قرار دے رکھا ہے۔''

میں نے کہا ''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن جہاں خالص نظریاتی جنگ لڑی گئی وہاں آج کیا ہو رہا ہے، میں اور تم افغان جہاد پر نظمیں اور کالم لکھ لکھ کر ہلکان ہو گئے لیکن مجاہدین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، اب اگر وہ کسی معاہدے پر پہنچ بھی جائیں تو ان بے گناہوں کی موت کا تاوان کون ادا کرے گا جو جہاد کے بعد باہمی قتال کی بھینٹ چڑھ گئے؟''

یہ سن کر میرا دوست کچھ چڑ سا گیا اور کہنے لگا ''تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ نظریہ کسی اصول کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔ اس صورت میں نظریہ دھڑے بندی کو جنم نہیں دے گا بلکہ یہ حق اور انصاف تک پہنچنے میں مدد و معاون ثابت ہو گا۔ انسان کو ''نظریاتی'' نہیں اصولی ہونا چاہیے۔''

''اور اگر اصول، مذہب کے ساتھ ٹکراتا ہو؟'' دوست نے پوچھا۔

''کوئی مذہب بے اصولی نہیں سکھاتا'' میں نے کہا ''یہ ہماری اپنی تعبیر ہوتی ہے جو ہم مذہب کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اخذ کرتے ہیں اور پھر بدقسمتی سے اس

تعبیر کو حتمی عقیدہ بنا لیتے ہیں۔ ابلیس نہایت ''مذہبی شخص'' تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ فرشتہ تھا، اس نے کسی اصول سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آگ، مٹی سے افضل ہے لہٰذا وہ آدم کو سجدہ نہیں کرے گا کیونکہ آدم مٹی سے بنا ہے اور اس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ اپنے ''نظریے'' پر سختی سے قائم رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ راندہ درگاہ ہوا اور اسے جنت سے نکال دیا گیا۔ اگر وہ خدا کی اطاعت کے ''اصول'' پر قائم رہتا اور اپنی خود ساختہ تعبیر کو حتمی عقیدہ نہ سمجھتا تو اسے اور اس کے ساتھ ہمیں آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا''

دوست کے چہرے پر ایک اُلجھن سی اُبھری، اس نے کہا ''کیا تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ اگر تمہارا نظریاتی گروپ جھوٹ کے راستے پر چل رہا ہے تو تمہیں آنکھیں بند کر کے اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے؟''

میں نے جواب دیا ''میں یقیناً یہی کہنا چاہتا ہوں اور اس کے علاوہ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے نظریات میں متشدد ہونا ملک، قوم، ملت اور مذہب کے لیے تباہ کن ہے۔ ابوجہل کتنا قابل شخص تھا، اپنے قبیلے کا سردار تھا لیکن اس کے نظریاتی تشدد نے لوگوں کو اس کا اصل نام تک بھلا دیا ہے، اب اسے اس کے ہم خیال بھی ابوجہل ہی کہتے ہیں۔ اس وقت ہمارے تمام سیاسی، مذہبی، سماجی اور ادبی دھڑے اپنے اپنے نظریات میں اتنے متشدد ہو چکے ہیں کہ کسی دوسرے کا نقطہ نظر سننے کے بھی روادار نہیں۔ ہم ابوجہل بنتے جا رہے ہیں۔ ہمیں ابوجہل کی طرح نئے خیال کو محض اس لیے رد نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے بنے ہوئے معتقدات کے خلاف ہے بلکہ ابوبکرؓ اور علیؓ کی طرح اسے خوش آمدید کہنا چاہیے۔''

یہ سن کر میرا دوست غصے سے لال بھبوکا ہو گیا اور پاؤں پٹختا ہوا بولا ''میں نے اپنے نظریات بہت سوچ سمجھ کر قائم کیے ہیں، میرے باپ دادا بھی انہی خیالات کے حامل تھے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری کسی بات سے قائل ہوا ہوں، میں اپنے خیالات پر سختی سے قائم ہوں۔ معاف کرنا میں نظریاتی شخص ہوں''

تو پھر کیا خیال ہے تمہارا؟

''ایک باتونی حجام سے حجامت بنواتے ہوئے پیٹر مسیح نے کہا''یار جوزف مسیح میں ذرا ایک ماہ کے لیے بیرون ملک جا رہا ہوں انشاءاللہ اب واپسی پر ملاقات ہوگی''

''کہاں جا رہے ہو صاحب؟''جوزف نے پوچھا۔

''روم جانے کا ارادہ ہے''

''چھوڑیں صاحب، روم بھی کوئی جگہ ہے، جانا ہے تو پیرس جائیں، لندن جائیں، نیویارک جائیں''

''نہیں بھئی جوزف اب تو پروگرام بن گیا ہے''

''کون سی ایئر لائن سے جا رہے ہیں؟''

''برٹش ایئر ویز سے''

''یہ بھی کوئی ایئر لائن ہے صاحب، ایک سے ایک ایئر لائن پڑی ہے، کسی اچھی سی ایئر لائن سے سفر کریں''

''بھئی میں تو ٹکٹ بھی خرید چکا ہوں''

''آپ کی مرضی، روم میں کہاں قیام کریں گے؟''

''ہلٹن میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے''

''چھوڑیں صاحب، ہلٹن بھی کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے کوئی اور جگہ دیکھیں''

''نہیں بھئی میں وہاں دوستوں کو اطلاع دے چکا ہوں''

''ویسے آپ روم میں کریں گے کیا؟''

''کرنا کیا ہے، کچھ تھوڑی بہت سیر وتفریح ہو جائے گی لیکن اصل مقصد پوپ کی زیارت ہے بس دل میں ایک خواہش ہے کہ ان کے ہاتھ چومنے کا موقع مل جائے''

''پوپ سے آپ کیسے ملیں گے، وہ تو سال چھ مہینے پہلے ملاقاتیوں میں نام لکھوانا پڑتا ہے، پھر بھی ملاقات کا موقع نصیبوں والوں ہی کو ملتا ہے''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''آپ کوشش کر دیکھیں، لیکن ملاقات ناممکن ہے''

ایک ماہ بعد پیٹر واپس پاکستان آیا اور حجامت بنوانے جوزف کے پاس گیا۔

جوزف نے پوچھا ''صاحب آپ باہر سے ہو آئے؟''

''ہاں بھئی کل ہی لوٹا ہوں''

''کہاں گئے تھے؟''

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ روم جانے کا ارادہ ہے''

''تو پھر کیسا لگا روم؟''

''بھئی جوزف کیا کہنے اس شہر کے، میں نے دنیا گھومی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس شہر کا کوئی جواب نہیں''

''آپ کون سی ایئر لائن سے گئے تھے؟'' جوزف نے مایوس ہو کر پوچھا۔

''فلائٹ، برٹش ایئر ویز ہی میں گیا تھا۔ بھئی کیا ایئر لائن ہے اتنی سموتھ فلائٹ بس لگتا ہے جیسے جہاز ہوا میں تیر رہا ہے''

''روم میں قیام کہاں رہا؟''

''ہلٹن میں ٹھہرا تھا بھئی پیسے تو کافی خرچ ہو گئے لیکن مزا آ گیا''

''پوپ سے ملاقات ہوئی؟'' جوزف نے آخر میں سخت مایوسی کے عالم میں پوچھا

''بھئی جوزف کمال ہو گیا، ادھر میں نے درخواست دی اور ادھر پوپ نے مجھے

طلب کر لیا، میں آدھ گھنٹہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہا، البتہ جب میں جاتی دفعہ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے لیے جھکا تو انہوں نے کہا......''

''کیا کہا انہوں نے؟''

''انہوں نے کہا یہ حجامت تم نے کس بدبخت سے بنوائی ہے؟''

گزشتہ روز میری کچھ اسی قسم کی گفتگو ایک دوست سے ہوئی۔ میں نے اسے ڈنر پر بلایا تھا، اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، گریبان کے بٹن کھلے تھے اور جیکٹ اس نے یوں کاندھوں پر ڈالی ہوئی تھی جیسے ابھی کہے گا ''ماں آج پھر نوکری نہیں ملی''

اس نے سوپ کا گھونٹ کڑوے گھونٹ کی طرح حلق میں اُتارتے ہوئے کہا ''یار یہ زندگی کیا ہے؟''

''کیوں کیا ہوا زندگی کو؟ اچھی چیز ہے، اچھی طرح گزارنی چاہیے'' میں نے کہا

''خاک اچھی چیز ہے، آج صبح نہا رہا تھا آنکھوں میں صابن ملا ہوا تھا کہ پانی بند ہو گیا''

''واقعی یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے اس سے تو تمہیں اپنی آدھی زندگی بے کار محسوس ہوئی ہوگی۔''

''اور کیا۔ اُوپر سے دوپہر کو ٹیلی فون ہیلڈ ہو گیا، باہر سے کالیں آتی رہیں، میں کال نہیں کر سکتا تھا''

''اوہو، یہ تو سونے پر سہاگہ ہوا، میرا مطلب ہے ایک کریلا اور دوجا نیم چڑھا معافی چاہتا ہوں کوئی مناسب محاورہ نہیں سوجھ رہا، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بہت افسوس ہوا''

''افسوس ناک باتیں تو اور بھی بہت سی ہیں، ایک محکمے میں دس لاکھ کا بل پھنسا ہوا ہے......''

''بل میں دس لاکھ پھنسے ہوئے ہیں؟''

''مجھے تمہاری اس طرح کی چہلیں اچھی نہیں لگتیں، تم خدا کے لیے زندگی کو

سیریس کرلو"

"زندگی کیا میں تو تمہیں بھی سیریس لیتا ہوں۔ خیر تم بتاؤ تمہارے ساتھ اور کون کون سے افسوس ناک واقعات پیش آئے"

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں بھی، میری ساری زندگی اس طرح کے دکھوں سے بھری پڑی ہے"

"بیچ بیچ، تم کتنے دکھی انسان ہو، زندگی میں کبھی سکھ بھی دیکھا ہے؟"

"کبھی نہیں"

"تمہاری شادی تو ہوئی ہے نا؟"

"ہاں"

"بیوی کیسی ملی؟"

"بس ٹھیک ہے"

"بچے کیسے ہیں؟"

"بس وہ بھی ٹھیک ہیں، پڑھ لکھ کر نوکریوں پر لگے ہوئے ہیں"

"فرمانبردار ہیں؟"

"تو کیا نافرمان ہوں گے؟"

"تمہارا اپنا کاروبار کیسا ہے؟"

"بس دال روٹی چلتی ہے"

"تمہاری آنکھیں، کان، ناک، بازو، ٹانگیں سب صحیح طور پر کام کرتے ہیں؟"

"کرتے ہیں بھئی کرتے ہیں، مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"صرف اس لیے کہ زندگی میں جو چیزیں تمہیں میسر ہیں، وہ نصیبوں والوں کو ملتی ہیں بلکہ صرف اچھی صحت ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے کافی ہے اور تم ہو کہ ہر چیز میں کیڑے نکالتے ہو۔"

''اور یہ جو نہاتے ہوئے پانی بند ہو جاتا ہے، ٹیلی فون ہیلڈ رہتا ہے یہ چھوٹے دکھ ہیں؟ افسوس تم میرے آنسو پونچھنے کی بجائے مجھے لیکچر دینے لگ گئے ہو''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''بس تم میرے لیے دعا کیا کرو''

''یہ تو میں تمہارے کہے بغیر بھی کرتا رہتا ہوں، ایک دفعہ تو اللہ میاں کی طرف سے جواب بھی آیا تھا''

''کیا کہا تھا اللہ میاں نے؟'' دوست نے بے چینی سے پوچھا۔

''اللہ میاں نے کہا تھا تمہارا دوست واقعی بہت دکھی ہے میں اسے اپنے پاس بلا لیتا ہوں۔ میرے ہاں پانی بھی وافر مقدار میں ہے اور ٹیلی فون بھی ہیلڈ نہیں ہوتا۔ پھر کیا خیال ہے تمہارا؟''

صاحب سلام!

میں نے محفل میں موجود چالیس سال سے زیادہ عمر کے کسی ایسے شخص کو سلام کرنا ترک کر دیا ہے جو عینک نہ لگاتا ہو کیونکہ اس سے خاصی ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے کسی جاننے والے شخص سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو چارو نا چار ہاتھ ماتھے تک لے جانا پڑتا ہے تاکہ اسے بیگانگی کا گلہ نہ ہو لیکن موصوف کے چہرے پر بیگانگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دیکھ کر سلام کے لیے ماتھے تک لے جانے والے ہاتھ سے خواہ مخواہ خارش کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بعد موقع پاتے ہی یہ ہاتھ ایک دفعہ پھر حرکت میں آجاتا ہے کہ ممکن ہے پہلی بار اس نے دیکھا نہ ہو۔ لیکن پتا چلتا ہے کہ وہ ہونقوں کی طرح مسلسل میری طرف دیکھے جا رہے ہیں لیکن سلام کا جواب نہیں دیتے۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر اپنی خفت مٹانے کے لیے اس ہاتھ سے خارش کا کام لینا پڑتا ہے۔ تاہم یہ حرکت بار بار نہیں دہرائی جاسکتی کہ دیکھنے والے سمجھیں گے شاید اسے ''کھرک'' پڑی ہوئی ہے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعد میں موصوف اُلٹا گلہ کرتے ہیں کہ میں نے تمہیں تین چار دفعہ سلام کیا لیکن تم نے جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے یہ حضرت ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ بعد میں تھک ہار کر میں نے عینک اُتار دی ہوتی ہے!

میں محفلوں میں فلسفی قسم کے حضرات کو بھی سلام نہیں کرتا کہ یہ خصوصاً بہت شرمندہ کراتے ہیں۔ یہ نہ صرف آپ کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں بلکہ باقاعدہ مسکراتے نظر آتے ہیں جو ایک طرح کی علیک سلیک ہی ہوتی ہے۔ خیر سگالی کے اس اظہار کا جواب نہ

دینا خاصی بداخلاقی ہے۔ چنانچہ میں جوابی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جاتا ہوں۔ان کی مسکراہٹ بدستور قائم رہتی ہے لیکن اس سے یہ اشارہ کہیں نہیں ملتا کہ انہوں نے سلام وصول کیا ہے اور قبول کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ مسکراہٹ خاصی احمقانہ سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ موصوف اپنے دھیان میں، اپنی ہی کسی بات پر مسکرا رہے تھے مگر بعد میں پتہ چلنے کا کیا فائدہ جب اس عرصے میں سینکڑوں لوگ آپ پر مسکرا چکے ہوتے ہیں!

میں نے ایک عرصے سے پریشان حال لوگوں کو بھی سلام کرنا ترک کر دیا ہے خواہ یہ میرے بالکل پاس ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔انہیں سلام کریں تو یہ ایک دم دبک سے جاتے ہیں جیسے ان کے کان کے قریب سے کوئی گولی سن سے گزری ہو۔ان کے لیے سلام اس ''ٹھاہ'' کی طرح ہوتا ہے جو آپ اپنے خیالوں میں مگن کسی دوست کو ڈرانے کے لیے اچانک اس کے قریب جا کر کرتے ہیں یا باتوں میں مصروف لوگوں کو غافل پا کر لفافے میں ہوا بھر کے اس پر مکہ مار دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سلام کر کے خاصی خفت اُٹھانا پڑتی ہے۔ کیونکہ بہت دیر تک ان کا دل دھک دھک کرتا رہتا ہے۔ویسے بھی ان کے کان سلام یا سلامتی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوتے جس کی وجہ سے انہیں اجنبی پن کا احساس ہوتا ہے۔

دو چار دفعہ تلخ تجربے کے بعد میں نے غریب غرباء کو بھی سلام کرنا چھوڑ دیا ہے کہ اگلے روز ہی اُدھار مانگ لیتے ہیں۔انہیں ادھار دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن سود چونکہ اسلام میں حرام ہے اس لیے انہیں اُدھار دینے میں فائدہ بھی کوئی نہیں۔ابن انشاء نے ایک اپنے ممدوح کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بہت مخیّر تھے۔ چنانچہ ان کے پاس ضرورت سے زیادہ جو روپیہ ہوتا تھا وہ اسے اللہ کی راہ میں سود پر دے دیتے تھے۔ غریبوں کو سلام کرنے میں جو خفت کا پہلو ہے وہ یہ ہے کہ کبھی آپ کا کوئی امیر دوست آپ کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا ہے تو اس کی نظروں میں وہ سلام بے وقعت ہو جاتے ہیں جو آپ اسے کرتے رہتے ہیں۔

ویسے ایک عرصے سے میں نے امیروں کو سلام کرنا بھی ترک کر دیا ہے۔ انہیں سلام کریں تو وہ یہ سلام اس طرح وصول کرتے ہیں جیسے خراج وصول کر رہے ہیں۔ چنانچہ سر کی ہلکی سی جنبش سلام کی رسید ہوتی ہے، بعض تو یہ رسید بھی نہیں دیتے، بس ہلکا سا مسکرا دیتے ہیں، بعض جواباً ہنس پڑتے ہیں اور ان کی یہ ہنسی خندہ استہزا محسوس ہوتی ہے۔ منیر نیازی نے ایک دفعہ ایک اسی طرح کے بزرگ صورت شخص کے گھٹنوں کو احتراماً چھوا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے سرپرستانہ انداز میں منیر نیازی کو تھپکی دی بلکہ جب اگلی دفعہ منیر نیازی کوئی چیز اُٹھانے کے لیے ذرا سے جھکے تو اسی بزرگ نے اپنا گھٹنا اُوپر اُٹھالیا۔

بس ایک سلام ایسا ہے جو میں نے ابھی تک ترک نہیں کیا اور وہ صاحب اقتدار لوگوں کا سلام ہے۔ امیر آدمی کو سلام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ وہ آگے سے کچھ نہیں دیتا، جواب تک نہیں دیتا۔ جبکہ صاحب اقتدار کے سلام کا اپنا ہی مزا ہے۔ اس کے لیے صاحب کے پی اے سے روابط بڑھائے جاتے ہیں اور پھر ٹائم لے کر صاحب کی کوٹھی کے برآمدے میں پوری کرسی پر آدھا بیٹھا جاتا ہے۔ چپراسی جب اندر بلاتا ہے تو کلیجہ باہر کو آنے لگتا ہے۔ صاحب اقتدار شخص باقاعدگی سے سلام کی صورت میں بہت کچھ دیتا ہے، وزارت دیتا ہے، مشاورت دیتا ہے، ٹکٹ دیتا ہے اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ دھکے بھی دیتا ہے مگر یہ دھکے برے نہیں لگتے کہ اگر نوالہ سونے کا ہو تو شیر کی آنکھ سے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ صاحبان اقتدار کو نہ صرف یہ کہ سلام کرنے میں مزا ہے بلکہ جب وہ اقتدار میں نہ رہیں تو انہیں سلام نہ کرنے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ حقیقت پسند صاحبان اقتدار اس کا برا نہیں مانتے، وہ جانتے ہیں کہ جب وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں تو سامنے بیٹھے بے شمار عوام انہیں سلام کر رہے ہوتے ہیں جن کا جواب دینا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اس کرسی پر عینک اُتار کر بیٹھتے ہیں اور جب یہ کرسی ان کے نیچے سے کھسکتی ہے تو پھر ''عوام'' اپنی عینک اُتار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جس سابق صاحب اقتدار کے ساتھ لوگ یہ سلوک نہ کریں تو سمجھ لیں اس پر اللہ کی رحمت ہے۔ ہمارے ہاں اللہ کی رحمت حاصل کرنے والے لوگ اتنے کم کیوں ہیں؟

مبلغ ایک عدد معزز روبوٹ

کبھی کبھی اس طرح زندگی گزارنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے کہ گھر کے مین گیٹ پر جب میری گاڑی پہنچے اور باوردی شوفر ہارن دے تو تین چار نوکر ہانپتے کانپتے آئیں اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے گیٹ کھولنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں، دبیز قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا جب میں ڈرائنگ روم میں پہنچوں تو بٹلر نے میز پر کھانا سجایا ہو اور شیف، سفید لمبوتری ٹوپی پہنے کھانے کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے اردگرد موجود ہوں۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے امپورٹ کیے گئے سامان آسائش سے مزین بیڈ روم کے آخری سرے پر بچھے واٹر بیڈ پر لیٹوں تو مجھے یوں لگے جیسے کوئی سوئمنگ پول کے فلوٹنگ رافٹ میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہچکولے لے رہا ہو۔

صبح ناشتے کی میز پر اخبارات کی سمری میرے سامنے دھری ہو جس میں مختصر طور پر قومی و بین الاقوامی صورت حال سے متعلق خبریں درج ہوں، نیز یہ بتایا گیا ہو کہ اہم اخبارات نے کس موضوع پر اداریہ لکھا ہے۔ کسی اہم کالم نگار کے کالم کا نچوڑ کیا ہے، اسٹاک ایکسچینج کی کیا صورت حال ہے۔ گھوڑوں اور گدھوں کی تجارت کیسی جارہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہو۔ ان کی تلاشی یا گہری نظروں سے جائزہ لے کر ایک ایک کر کے انہیں اندر بھیجا جائے۔ ملاقات کے لیے طے شدہ ٹائم پورا ہونے پر سیکرٹری کمرے میں داخل ہو اور جھک کر کہے ''سر آپ کا اگلا پروگرام یہ ہے'' جس پر وہ

ملاقاتی اشارہ سمجھ کر رخصت ہو اور دوسرا ملاقاتی حالت رکوع میں اندر داخل ہو۔ یہ سب لوگ میری باتیں اس طرح سنیں جیسے بولنے کا حق اور سلیقہ قدرت نے صرف مجھے ودیعت کیا ہے۔

ہفتے میں ایک آدھ دن گھر میں پارٹی کا اہتمام ہو جس میں دوست (اور دشمن) ملکوں کے سفیر، اعلیٰ فوجی افسران اور سیاست دان شریک ہوں۔ اس پارٹی کے لیے صرف ممیاہٹ کے انداز میں حکم دینا پڑے کہ فلاں دن اس کا اہتمام کیا جائے!

سیکرٹری آکر اطلاع دے کہ سر آپ فلاں تاریخ کو ہالی ڈے پر تین مہینے کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ امریکہ، اسپین اور سوئٹزر لینڈ کے لیے ٹکٹ اور ہوٹلوں کی بکنگ ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں کوئی خصوصی ہدایات جاری فرمانا چاہیں تو حکم دیں!

یہ اور اسی طرح کی زندگی گزارنے کے باقی لوازمات (جن سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں) مجھے میسر ہوں تاکہ جو زندگی میں اب گزار رہا ہوں اس سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ ان دنوں صبح سویرے جب نہانے کے لیے باتھ روم میں داخل ہوتا ہوں اور خاصے خوشگوار موڈ میں، خاصی خوشگوار آواز میں کوئی گانا گنگناتے ہوئے چہرے پر صابن ملتا ہوں تو نلکے میں پانی آنا بند ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد آنکھوں میں صابن جانا شروع ہو جاتا ہے۔ ہفتے میں دس بارہ دفعہ ٹیلی فون ٹھیک کرانے کے لیے شکایت درج کرانی پڑتی ہے۔

بجلی، گیس اور پانی کا بل جمع کرانے کے لیے لمبی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور گرد و غبار سے اٹی فضاؤں میں سے گزر کر چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے دفتروں کے چکر لگانا پڑتے ہیں۔ معمولی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دو دو سال کی کمیٹی ڈالنا پڑتی ہے۔ بیمار پڑنے پر بھاری فیسوں کا خیال بیماری کی شدت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے مسائل، اس متوسط طبقے کے ہیں جس سے میں تعلق رکھتا ہوں جبکہ عوام "کالانعام" کے لیے تو سانس لینا بھی ناممکن بنا دیا گیا ہے۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ میں جس طبقے سے پھسل کر جس طبقے کی طرف جانا چاہتا

ہوں، اس کے بارے میں ایک بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی اور وہ یہ کہ ان تمام آسائشوں اور پروٹوکول میں جو میں نے کالم کے شروع میں بیان کیں، وہ سب کچھ موجود ہے جس کی میں نے خواہش کی ہے لیکن اس میں میری فیملی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس طبقے میں داخل ہونے کے بعد ایک بیٹا امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے، دوسرا بیٹا آسٹریلیا میں ہوتا ہے، بیٹی لندن میں ہوتی ہے اور بیوی فوٹوگرافروں میں گھری سماجی خدمات میں مشغول دکھائی دیتی ہے۔ اس طبقے میں دوست بھی نہیں ہوتے، مصاحب ہوتے ہیں یا باس ہوتے ہیں۔ رات کو واٹر بیڈ پر ہچکولے کھانے کے باوجود وہ نیند میسر نہیں ہوتی جو دن بھر کی مشقت کے بعد سر کے نیچے بازو کو سرہانہ بنا کر میسر ہوتی ہے۔ شف اور بٹلر، ڈائننگ روم کی زیبائش اور کراکری کا سامان بھی معدے کو اس قابل نہیں بناتا کہ دنیا جہان کی نعمتیں اس کے لیے قابل قبول ہو سکیں۔ اس طبقے میں بے شمار لوگ عزت کرنے والے ہوتے ہیں لیکن محبت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا بلکہ اس طبقے میں شمولیت کے بعد خود اپنی عزت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان دوسروں کی نسبت خود کو زیادہ جانتا ہے۔ مرنے پر جنازے میں لوگ شامل ہوتے ہیں مگر رونے والا کوئی نہیں ہوتا۔ امریکہ، آسٹریلیا اور برطانیہ میں مقیم بچے فون پر ممی سے تعزیت کرتے ہیں اور پھر چند دنوں بعد وطن واپس آ کر جائیداد کے مسئلے حل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

یہ سب باتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں لیکن کوئی بات تو ہے کہ روبوٹ جیسی زندگی گزارنے کے لیے لوگ بھرپور انسانی زندگی اس پر سے تیاگ دیتے ہیں بلکہ اس کے لیے کئی انسانی زندگیاں قربان کر دیتے ہیں۔ انسانوں پر ظلم کرتے ہیں، ملک اور قوم کے مفادات سے غداری کرتے ہیں اور اس کے عوض وہ ایک وسیع و عریض کیپسول میں زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ خواہشوں کے کیپسول میں بند اور روبوٹ کی طرح زندگی بسر کرنے والا کوئی بڑا آدمی میری یہ اُلجھن حل کرے کہ انسانی جذبوں سے عاری ہونے کے بعد اسے انسان کیسے لگنے لگتے ہیں اور وہ دھرتی کیسی لگتی ہے جہاں انہوں نے غیر انسانی جزیرے قائم کر رکھے ہیں؟

کوئی وظیفہ وغیرہ کیا کرو میرے بیٹے!

یہ قریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے لیکن مجھے بھولتا نہیں ہے!

فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف ایک نوجوان تھا ''سر! میرا نام افضال ہے، میں بی اے کا طالب علم ہوں اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ہاکر کا کام کرتا ہوں، میں اس وقت سخت پریشان ہوں، غم اور غصے کی شدت سے میرے دماغ کی نسیں پھٹنے والی ہیں۔ آپ میری مدد کریں!''

اگرچہ یہ نوجوان میرے لیے اجنبی تھا لیکن انسانی ہمدردی کے ناتے مجھے اس کی حالت سے سخت تشویش لاحق ہوئی۔

''کیا بات ہے بیٹے، میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں'' میں نے پوچھا۔

''سر مجھے بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے لیکن آپ کو یہ سب کچھ بتانا بھی ضروری ہے نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا!''

''میں تمہارا دوست ہوں، تم بغیر کسی جھجک کے مجھے ساری بات بتاؤ'' میں نے اسے تسلی دی!

''سر! بات یہ ہے کہ آج میں نے ٹی وی آن کیا تو سی این این پر ایک انگریزی فلم چل رہی تھی، اس وقت میرے پاس میری بہن، میری والدہ اور میرے والد صاحب بیٹھے تھے، پھر یوں ہوا کہ اچانک ایک عریاں سین چلنا شروع ہوگیا، اس قدر واہیات کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے......''

''ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی فلم میں عریاں سین؟ یہ کیسے ممکن ہے!''

''سر! مجھے اسی بات کا تو صدمہ ہے، پھر اس نے سین کی جو تفصیل بتائی اس کے مطابق یہ کوئی نارمل فلم نہیں، بلیو فلم تھی!

''میرے لیے تمہاری بات پر یقین کرنا ممکن نہیں ہے بیٹے، ایسا ہو نہیں سکتا!''

''سر! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا، یہ فلم آج رات کو ڈیڑھ بجے دوبارا دکھائی جائے گی، آپ ضرور دیکھیں اور اس کے خلاف کالم لکھیں، سر! میں ٹیلی ویژن سٹیشن کو بم سے اُڑا دینا چاہتا ہوں، سر! اگر آپ نے اس فلم کے خلاف اپنے کالم میں احتجاج نہ کیا تو میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناؤں گا!''

میں اس نوجوان کی باتوں سے پریشان ہو گیا تھا، تاہم میں نے کہا ''میں فلم دیکھنے کے بعد ہی اس فلم کے بارے میں کوئی رائے دے سکتا ہوں''

''میں رات کو کافی دیر سے سونے کا عادی ہوں مگر اتفاق سے اس روز مجھے بارہ بجے ہی نیند آ گئی اور میں سو گیا، مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں نے اس نوجوان سے فلم دیکھنے کا وعدہ کیا تھا!''

رات کو ٹھیک سوا بجے فون کی گھنٹی بجی، میں آنکھیں ملتا ہوا فون کے پاس گیا۔ دوسری طرف وہی نوجوان تھا ''سر! تھوڑی دیر بعد فلم چلنے والی ہے، آپ ضرور دیکھیں اور پھر اس پر کالم لکھیں۔ اگر آپ نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا تو میں، خواہ کچھ ہی ہو جائے ٹی وی اسٹیشن کو بم سے اُڑا دوں گا، سر! میں اس سے پہلے ایک سینما میں دھماکا کر چکا ہوں! لہٰذا آپ میری بات کو دھمکی نہ سمجھیں۔ اب فحاشی کی وبائی وی تک آ پہنچی ہے، ہم سب کو یہ سلسلہ یہیں تک روکنا ہوگا سر!''

مجھے اس نوجوان کی ذہنی حالت پر مزید تشویش محسوس ہوئی۔ میں ٹی وی لاؤنج میں آیا اور ٹی وی آن کر کے صوفے پر بیٹھ گیا!

یہ جیمز بانڈ ٹائپ فلم تھی۔ میں جب آدھی کے قریب فلم دیکھ چکا تو میں نے محسوس کیا

کہ اس میں تو سرے کوئی قابل اعتراض منظر نہیں ہے، بلکہ جو مناظر سینما میں دکھائے جاتے ہیں، یہاں ٹی وی کی پالیسی کے مطابق وہ منظر ہی حذف کر دیے گئے تھے، مجھے اس نوجوان پر سخت غصہ آیا کہ اس نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے لہجے کی سنگینی یاد آئی اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

اتنے میں ایک دفعہ پھر فون کی گھنٹی بجی، یہ وہی نوجوان تھا ''سر! آپ مجھے کوس رہے ہوں گے کہ اس فلم میں تو ایسی ویسی کوئی بات نہیں لیکن وہ سین اب آنے والا ہے۔ فلم کی ہیروئن ابھی غسل خانے میں داخل ہوگی اور بالکل برہنہ حالت میں غسل کرے گی، آپ پلیز ٹی وی بند نہ کریں، صرف یہ سین دیکھ لیں تا کہ آپ کو یقین آ جائے کہ میں نے جو کہا تھا، سچ کہا تھا''

میں نے ایک دفعہ پھر ٹی وی پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سین آ گیا۔ فلم کی ہیروئن مکمل لباس میں ملبوس غسل خانے میں داخل ہوتی ہے اور غسل خانے کا دروازہ بند کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سین یہاں ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس سے اگلا کوئی سین چلنے لگتا ہے۔

میں نے سوچا اگر یہ نوجوان مجھے اس وقت مل جائے تو میں اس کی گردن دبا دوں، جس نے میری نیند خراب کی اور میرے ساتھ اتنا بدمزہ مذاق کیا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی ''سر! آپ نے دیکھا کہ کس قدر شرمناک منظر تھا؟ کیا ٹی وی حکام کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں، کیا نوجوانوں کے اخلاق پر اسی طرح ڈاکہ ڈالا جاتا رہے گا، کیا فحاشی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا؟'' اور پھر یہ سب کچھ کہتے کہتے اس نوجوان کی آواز بھرا گئی ''سر! کچھ کریں خدا کے لیے کچھ کریں!''

تھوڑی دیر پہلے مجھے اس نوجوان پر جو غصہ آیا تھا وہ ایک دم ختم ہو گیا اور مجھے ایک بار پھر اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔

میں نے کہا ''بیٹے، تم نے جس سین کی بابت مجھے بتایا تھا، وہ تو اس میں تھا ہی نہیں۔تم کس بات پر اتنے پریشان ہو رہے ہو؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر، میں نے ابھی ابھی وہ سین خود دیکھا ہے۔آپ کو نظر نہیں آیا؟'' اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

''نہیں بیٹے مجھے صرف وہی سین نظر آیا جو فلم میں تھا......''

''تو کیا میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں سر!'' وہ سخت پریشان لگ رہا تھا!

میں اس نوجوان کا مسئلہ سمجھ گیا تھا، تم غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے بیٹے! مجھے وہ سین نظر آیا جو فلم میں تھا اور تمہیں وہ سین نظر آیا جو تم دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ سین پہلے تم نے لاشعوری طور پر ذہن میں سوچا اور پھر تمہاری آنکھوں نے اسے دیکھا۔نفسیات کی زبان میں اسے ہیلوسی نیشن کہتے ہیں۔''

''تو کیا میں نفسیاتی مریض ہوں سر!'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہاں مگر تم اکیلے نہیں ہو! ہماری پوری قوم مختلف محرومیوں کی وجہ سے شدید نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو چکی ہے۔ہمیں ہر تصویر وہی تصویر نظر آتی ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے رویوں میں منافقت آ گئی ہے۔ ہم اکیلے میں کچھ اور ہوتے ہیں اور ایک دوسرے شخص کی موجودگی میں کچھ اور۔ہم میں سے ہر شخص نہایت اعلیٰ درجے کی اخلاقی گفتگو کرتا ہے لیکن جتنے ہولناک جنسی جرائم ہمارے اس اخلاقی معاشرے میں ہوتے ہیں، وہ اخلاق باختہ معاشروں میں بھی نہیں ہوتے۔ میں تمہاری ذہنی حالت سے واقف ہوں، یہ تشویش ناک ضرور ہے لیکن اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔تمہاری حالت اس شخص کی سی ہے جو کئی دنوں سے بھوکا ہو اور اس کے چاروں طرف بھوک بڑھانے والے کھانوں کی خوشبو پھیلی ہو۔''

''میں تو آپ کی باتوں سے پریشان ہو گیا ہوں سر، کیا اس فلم میں وہ سین واقعی نہیں تھا، مجھے مشورہ دیں سر! مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہیں یہ نظام تبدیل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے جس میں بچیاں جہیز کی وجہ سے اور بچے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے انتظار میں جوانی کی حدیں بغیر جیون ساتھی کے عبور کر جاتے ہیں اور پھر اس دور کی محرومیاں شادی کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور سوچوں میں زہر گھولتی رہتی ہیں!''

''جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوتا، اس وقت تک میں کیا کروں سر؟'' نوجوان نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

''تزکیہ نفس کے لیے کوئی وظیفہ وغیرہ کیا کرو میرے بیٹے!'' اور پھر میں نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد دیر تک فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر میں اپنے کانوں میں روئی دے کر، بستر پر جا کر لیٹ گیا اور بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا!

✧ ✧ ✧

شہری پاگلوں سے ہوشیار رہیں!

ایک معاصر نے اطلاع دی ہے کہ پاگل خانے سے چودہ پاگل فرار ہوگئے ہیں لہٰذا شہری ہوشیار رہیں۔ یہ خبر پڑھ کر میرے دل سے اس اخبار کے رپورٹر کے لیے بے اختیار دعائیں نکلیں جس نے پاگل خانے سے باہر صرف چودہ پاگلوں کی موجودگی کی اطلاع دی اور یوں مجھے حوصلہ دیا ورنہ میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ پوری قوم پاگل ہو چکی ہے اور صرف وہ لوگ ہوش مند ہیں جو پاگل خانے میں بند ہیں!

اس خبر کی اشاعت کے بعد میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوں مگر اس کا پس منظر یہ تھا کہ مجھے زندگی کے ہر شعبے میں پاگل پن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پاکستان سے معاشی اُونچ نیچ ختم کریں گے لیکن غریب اپنی غربت کے ہاتھوں اور امیر اپنی امارت کے نشے سے پاگل ہو رہے ہیں۔ پورا معاشرہ دولت کے لیے پاگل ہو رہا ہے کہ عزت والا وہی ہے جو پیسے والا ہے۔ ہم نے پاکستان مسلم قومیت کے نظریے کی بنیاد پر بنایا تھا لیکن ہم سب نسلی اور لسانی پاگل پن کا شکار ہو چکے ہیں ہم لوگ پاگل پن کی اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ ہم نے ایشوز کو نان ایشوز اور نان ایشوز کو ایشوز میں تبدیل کر دیا ہے، کسی کو اقتدار نے پاگل کر رکھا ہے اور کسی کو اقتدار کی جدائی نے۔ عوام ہوش و خرد سے اتنے عاری ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی فرقہ پرست، نسل پرست اور اقتدار پرست کھوکھلے نعروں کے ذریعے انہیں اپنے پیچھے لگا سکتا ہے۔ سیاسی اور مذہبی تنگ نظری نے ہمارے دماغوں کے انجر پنجر ہلا دیے ہیں اور ہم تباہی کے راستے پر دیوانہ وار دوڑتے چلے جا

رہے ہیں، یہ وہ خیالات تھے جو مجھے ہر لمحہ پریشان رکھتے اور میں اپنی قوم کی ذہنی حالت کے بارے میں مشکوک ہو چکا تھا مگر اخبار کی خبر پڑھ کر اطمینان ہوا کہ پورا معاشرہ الحمد اللہ بخیریت ہے صرف چودہ پاگل، پاگل خانے سے فرار ہو کر ہمارے درمیان آ گئے ہیں، شہری ان سے ہوشیار رہیں!

پاگل خانے میں بند پاگلوں کے بارے میں میری اچھی رائے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس پاگل پن کا شکار نہیں جس کی تفصیل میں نے اُوپر بیان کی ہے، پاگل خانے میں نسلی فساد نہیں ہوتا، لسانی فساد نہیں ہوتا، مذہبی فساد نہیں ہوتا، دولت کے لیے کوئی پاگل نہیں ہوتا، اقتدار کے لیے کسی کو پاگل پن کا دورہ نہیں پڑتا، پاگل خانے میں عورتیں بھی ہیں لیکن پاگل ان کی اجتماعی آبروریزی نہیں کرتے، کوئی اپنی دولت کی نمائش نہیں کرتا، کسی کو اپنی غربت کا کمپلیکس نہیں ہے، بس سیدھے سادے لوگ ہیں جو بقائے باہمی کے اصولوں کی روشنی میں امن سے زندگی گزار رہے ہیں۔ بلکہ یہ وہ ''پاگل'' ہیں جن کی زبان پر سچی بات بھی آ جاتی ہے۔ میں نے ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک وزیر صاحب پاگل خانے کے دورے پر گئے اور وہاں انہوں نے لچھے دار تقریر کی جس میں عوام کی حالت بدلنے کے دعوے تھے، جب ان کی خطابت زوروں پر تھی، ایک پاگل اپنی جگہ سے اُٹھا اور باآوازِ بلند کہا ''وزیر صاحب آپ جھوٹ بول رہے ہیں!'' اور اس کے بعد وہ مسلسل وزیر صاحب کی تقریر میں مداخلت کرتا رہا، جس پر وزیر صاحب ناراض ہو گئے اور اس وارڈ کے ڈاکٹر کی جواب طلبی کر لی گئی کہ اس نے پاگل کو اس مداخلت سے منع کیوں نہیں کیا؟ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ بطور ڈاکٹر میرے لیے یہ بات ممکن نہیں تھی کیونکہ یہ پاگل گزشتہ تین برس سے میرے زیر علاج تھا اور اس تین سال کے عرصہ میں اس نے ایک دفعہ بھی ہوش مندی کی کوئی بات نہیں کی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے عقل کی کوئی بات کی چنانچہ بطور ڈاکٹر میں اس موقع پر اسے کیسے روک سکتا تھا؟ تاہم اخبار میں رپورٹر کی خبر پڑھ کر میں خاصے تذبذب کا شکار ہو گیا ہوں مخمصے میں مبتلا ہو گیا

ہوں کہ میں پاگل کسے سمجھوں وہ جو پاگل خانے میں بند ہیں یا وہ جو پاگل خانے سے باہر ہیں؟

چند ہفتے قبل اخبار میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے مطابق اس وقت پاکستان میں ایک کروڑ مریض ہیں، پاکستان کی کل آبادی چودہ کروڑ ہے، ان میں سے بچے نکال دیں، بوڑھے نکال دیں اور وہ لوگ نکال دیں جو خود کو پاگل نہیں سمجھتے تو پوری آبادی ذہنی مریض ثابت ہوتی ہے۔ اس ذہنی مرض کی وجہ ہم سب کی دوعملی ہے، ہم بات اسلام کی کرتے ہیں اور اسمگلنگ کرتے ہیں، ٹیکس چوری کرتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور غریبوں کا حق مارتے ہیں، ہم خود کو انقلابی کہلاتے ہیں اور ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہتے ہیں، مزدور دشمنی کرتے ہیں، امریکہ کی ٹاؤٹی کرتے ہیں، اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بننے کے لیے ''مسلح جدوجہد'' کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو مغرب سیٹل کراتے ہیں۔ چنانچہ نظریہ خود سے دغا کرنے والوں سے انتقام لیا کرتا ہے، اپنے نظریے سے دھوکا کرنا آپ سے دھوکا کرنا ہے اور خود سے دھوکا کرنے والا شخص کبھی نارمل نہیں رہ سکتا، ہماری قوم ابنارمل ہو چکی ہے، مجھے ڈر ہے کہ پاگل خانے سے جو چودہ قیدی فرار ہوئے ہیں کہیں وہ بھی ہمارے جیسے نہ ہو جائیں۔ چنانچہ جتنی جلدی ممکن ہو انہیں واپس بھجوا دینا چاہیے۔ موجودہ حالات میں پاگل خانے کشتی نوح ہیں۔ ہم اگر اپنی آئندہ نسلوں کو پاگل پن سے بچانا چاہتے ہیں تو سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان سے ایک ایک جوڑا اس کشتی میں پہنچا دینا چاہیے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میں خود پاگل پن کا شکار ہوتا جا رہا ہوں کیونکہ خبر پڑھ کر تو میں بہت خوش ہوا تھا کہ ملک میں صرف چودہ پاگل ہیں اور یہ وہ ہیں جو پاگل خانے سے فرار ہوئے ہیں، بہر حال صورت حال جو بھی ہے شہری پاگلوں سے ہوشیار رہیں!

✧ ✧ ✧

اللہ تعالیٰ کا ٹیلی فون نمبر

فیصل آباد کی ایک تنظیم جماعت الخیر کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا ہے جس کی سرخی ''اللہ تعالیٰ کا ٹیلی فون نمبر'' ہے اور یہ ٹیلی فون نمبر دو چار چار تین چار تین (۲۴۴۳۴۳) کے ہندسے پر مشتمل ہے۔ یہ ہندسے دراصل بالترتیب فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی فرض رکعتیں ہیں اور آخری تین کا ہندسہ وتر کی رکعتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اشتہار کا باقی مضمون یہ ہے ''روزانہ پابندی وقت سے ڈائلنگ کرتے رہیں، ایمرجنسی کی صورت میں ڈائریکٹ نمبر ۶ تہجد میں رابطہ کیجیے اور اپنی پریشانیاں فوراً حل کرائیں۔

نوٹ: دو آنسوؤں کا ٹوکن ڈالنا نہ بھولیں۔ سنت مؤکدہ اور نوافل کے ذریعے رابطے کو مزید بڑھایا جا سکتا ہے۔ منجانب: جماعت الخیر، افغان آباد فیصل آباد

میرے لیے یہ اشتہار برادرم عمران نقوی نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا تاکہ میں اسے اپنے قارئین تک پہنچا سکوں۔ سو میں یہ فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ مجھے اس اشتہار کے نفس مضمون سے کوئی اختلاف نہیں کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے کہ میں اپنے تابعدار بندوں کی دعائیں سنتا ہوں بلکہ چھوٹی موٹی دعائیں تو مجھ ایسے گناہ گار بندے کی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ البتہ اس ضمن میری ایک اُلجھن ہے جس کا اظہار میں کرنا چاہتا ہوں اور وہ اُلجھن یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمان مسلسل اس نمبر پر اللہ تعالیٰ سے رابطے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہاں سے اُٹھاتا ہی کوئی نہیں، بوسنیا کے مسلمان یہ نمبر ٹرائی کر رہے ہیں بلکہ ان کے ننھے

منے معصوم بچے آنسوؤں کے کتنے ہی ٹوکن ڈال چکے ہیں لیکن ادھر سے کوئی جواب نہیں آتا، فلسطین اور صومالیہ کے مسلمان بھی ایک عرصے سے اس نمبر پر رابطے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی کالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ کئی دفعہ یہ نمبر انگیج ملتا ہے پتہ چلتا ہے کہ امریکی صدر سے بات ہو رہی ہے۔ جاپانی وزیر اعظم بات کر رہے ہیں ہنود یہود کی سنی جا رہی ہے لیکن اگر رابطہ نہیں ہوتا تو مسلمانوں کا نہیں ہوتا۔

آخر کیا وجہ ہے کہ اُمت احمد مرسلؐ زبوں حال ہے اور اغیار پوری دنیا میں دندناتے پھر رہے ہیں؟

میں نے اپنی اس اُلجھن کا اظہار ایک عالم دین سے کیا، انہوں نے فرمایا اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں رہے۔ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارا حج، ہماری زکوٰۃ سب دکھاوے کی حد تک ہے، ہم ان عبادات کی روح کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ شعر بھی پڑھا ؎

میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لیکن مولانا کے اس جواب سے میری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت جو قومیں عروج پر ہیں وہ سب کی سب غیر مسلم ہیں۔ چنانچہ وہ تو دکھاوے کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ اسی طرح مسلمان ایک طویل عرصے تک قوموں کی امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں، اس میں صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا دور ایسا ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ راعی اور رعایا دونوں اسلامی تعلیمات پر پوری طرح کاربند تھے۔ جبکہ مسلمان تو صدیوں تک سپر پاور رہے ہیں۔ اموی، عباسی اور مغل فرماں رواؤں نے پوری دنیا کو آگے لگا رکھا تھا اور ان ادوار میں نہ راعی مثالی مسلمان تھے اور نہ رعایا۔ بلکہ بعض مسلمان بادشاہ تو اتنے فاسق و فاجر گزرے ہیں کہ ہم کوشش کے باوجود اتنے فاسق و فاجر نہیں ہو سکتے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ ہماری سنتا رہا

ہے، آج نہیں سنتا؟ اس دور میں اُمت محمدؐ یہ سر بلند تھی آج سرنگوں ہے؟ سندھ میں ایک مسلم دوشیزہ بے آبرو ہوئی تو محمد بن قاسم ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اس کے سر پر چادر رکھنے آیا تھا۔ آج کشمیر، بوسنیا، اور فلسطین کی بیٹیاں چیخ چیخ کر ہمیں پکار رہی ہیں لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ ہمیں اپنی پڑی ہوئی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبوں حالی کا دور ختم ہو اور ہم دوبارہ قوموں کی امامت کا فریضہ سنبھالیں تو اس کے لیے ہمیں دل و دماغ کے دروازے کھول کر غور و فکر کرنا ہوگا۔ کلیشے قسم کے جوابات اس مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنی آخرت سنوارنے اور دل کی دنیا آباد کرنے کے لیے عبادات کا وہ کورس لازمی ہے جو ہمیں اسلام نے بتایا ہے اور قوموں کی امامت سنبھالنے کے لیے ان مسلمہ اصولوں کو اپنانا ضروری ہے جو مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں اور آج غیر مسلموں نے اپنے دورِ عروج میں اپنا رکھے ہیں اور یہ اصول مختلف قوموں کے لیے مختلف نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ایک ہی ہیں۔ یہ اصول قول و فعل میں ہم آہنگی، عدل، سچائی، ڈسپلن، اتحاد، ملکی قوانین کی پابندی، کشادہ دلی، تحمل، برداشت اور آزادی فکر وغیرہ سے عبارت ہیں۔ جن قوموں نے بھی ترقی کی ہے انہی اصولوں کو اپنا کر کی ہے اور جو قومیں بھی قعر مذلت میں گری ہیں ان اصولوں سے روگرانی کے نتیجے میں گری ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو آسمان سے بھی گرا سکتا تھا لیکن اس نے تخلیق کا ایک نظام وضع کیا۔ بنے بنائے درخت بھی وجود میں آسکتے تھے لیکن اس نظام کو بھی ایک ضابطے کا پابند کیا، اسی طرح قوموں کی ترقی کے کچھ اصول و ضوابط ہیں اور جو قوم ان کی پیروی کرے گی وہ اس دنیا میں فلاح پائے گی۔ روحانی فلاح کے لیے ایک علیحدہ نظام ہے اور وہ اس اشتہار میں درج ہے جو میں نے کالم کے آغاز میں درج کیا ہے اپنے دل کی دنیا آباد کرنے کے لیے اس پر عمل ضروری ہے لیکن اگر ہم نے اس دنیا میں اغیار کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمیں ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا ہوگی۔ غور و فکر کرنا ہوگا۔ ریسرچ کرنا ہوگی، نظام عدل

نافذ کرنا ہوگا اور قوم کو اتحاد تنظیم اور یقین کی دولت سے مالا مال کرنا ہوگا اور ان میں سے کوئی چیز بھی خلاف اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی منشاء کے عین مطابق ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہم اللہ تعالیٰ کا نمبر ڈائل کریں گے تو وہ یقیناً ہماری سنے گا بصورت دیگر یہ رابطہ ممکن نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کے لیے اپنے اصولوں سے روگردانی نہیں کرتا! چنانچہ ان اصولوں پر عمل کیے بغیر ہم یہ نمبر ڈائل کریں گے تو ہمیشہ انگیج ملے گا اور پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ جاپان اور امریکہ کے سربراہوں سے مصروف گفتگو ہے۔

سینئر گدھے!

زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک عمر اس شعبے میں گزارنے کے باوجود اپنے نامہ اعمال میں کوئی نیکی درج نہیں کرا سکے یعنی انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر وہ فخر کر سکیں، وہ صرف اپنی سنیارٹی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناقدری کا رونا بھی بہت روتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی وہ وجوہات بتائیں جن کی بناء پر آپ کی قدر کی جائے تو وہ جواب میں صرف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ گزشتہ اتنے برسوں سے اس شعبے میں کام کر رہے ہیں مگر انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ کچھ ستم ظریفوں نے ایسے لوگوں کے لیے ''خر کہنہ مشق'' کی ترکیب ایجاد کی ہے جسے آسان لفظوں میں ''سینئر گدھے'' کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ روز مختلف شعبوں کے سینئر گدھوں سے میری ملاقات ہوئی جن کا احوال درج ذیل ہے۔ تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کالم صرف ان نام نہاد سینئرز کے بارے میں ہے جو اپنا کام نہیں جانتے۔ اگر کہیں حقیقی سینئرز کی حق تلفی ہو تو یہ واقعی شرمناک فعل ہے کہ یہ لوگ قوم کا سرمایہ ہیں۔

''بھائی صاحب! آپ نے ٹی وی کا مشاعرہ دیکھا؟''

''دیکھا تھا''

''آپ نے دیکھا اس فقیر کے ساتھ کتنی زیادتی کی گئی؟''

''کیوں کیا ہوا؟''

"کمال ہے آپ کو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس ہی نہیں ہوا؟"
"مگر ہوا کیا؟"
"صاحب! بہت سے جونیئر شعرا کی موجودگی میں مجھے سب سے پہلے پڑھایا گیا!"
"یہ تو ٹی وی والوں نے واقعی زیادتی کی حالانکہ آپ کو تو اس سے بھی کچھ پہلے پڑھانا چاہیے تھا"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرا شمار ملک کے سینئر شعراء میں ہوتا ہے!"
"آپ کا کوئی ایسا شعر ہے جو آپ کی پہچان بنا ہو؟"
"صاحب! آپ شعر کو چھوڑیں، میری ڈیٹ آف برتھ دیکھیں۔ یہ جو بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں میرے سامنے کل کے لونڈے ہیں۔ افسوس ہم جیسے لوگوں کی قدر ہی نہیں جنھوں نے ایک عمر اس شعبے میں گزار دی ہے۔"

"یہ جو آپ نے ڈرامے کا سین لکھا ہے اس میں تو میں بالکل دب کے رہ جاؤں گا!"
"کیا مطلب؟"
"دیکھیں نا! سین میں میرے مدمقابل جو ایکٹر ہے، وہ اپنی اُچھل کود سے ناظرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالے گا۔ ہم سینئر لوگ اس طرح کے کام تو نہیں کر سکتے جو یہ کل کے لونڈے کر لیتے ہیں، ایسے سین میں میری موجودگی سے میرا وقار مجروح ہوگا!"
"ماشاءاللہ ویسے آپ کتنے عرصے سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں؟"
"جب سے پاکستان میں ٹیلی ویژن آیا ہے"
"اب تک آپ نے کتنے سیریلز کیے ہیں؟"
"بے شمار، مجھے تو تعداد بھی یاد نہیں"
"کوئی ایسا سیریل جو آپ کی وجہ سے ناظرین میں مقبول ہوا ہو؟"

’’آپ اس بات کو چھوڑیں، صرف میری سینارٹی دیکھیں، میں ٹی وی کا سب سے پرانا اداکار ہوں!‘‘

’’آپ دیکھ رہے ہیں سیاست میں آج کل کن لوگوں کو لفٹ مل رہی ہے؟‘‘

’’کن لوگوں کو مل رہی ہے؟‘‘

’’جو کل تک ہمارے حقے تازہ کرتے تھے‘‘

’’تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟‘‘

’’فرق تو پڑتا ہے جناب! یہ لوگ ہمارے منہ لگ رہے ہیں جن کی ساری عمر سیاست میں گزری ہے جبکہ یہ لونڈے گزشتہ دو چار برس کی پیداوار ہیں!‘‘

’’مگر ان میں خرابی کیا ہے؟‘‘

’’یہ ہم بزرگوں کو چیلنج کرتے ہیں، حالانکہ علامہ نے ان جیسوں کے بارے میں کہا تھا ؎

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اُٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں

’’مگر بزرگوارم، علامہ نے جب یہ شعر کہا تھا، اس وقت آپ ان لوگوں کی عمر کے تھے!‘‘

’’چالیس سال سول سرونٹ کے طور پر قوم کی خدمت کی مگر......‘‘

’’مگر کیا؟‘‘

’’جب سے ریٹائر ہوا ہوں کوئی سلام کرنے ہی نہیں آیا! نہ کبھی حکومت نے جھوٹے منہ کہا کہ ہم تمہارے تجربے سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں‘‘

’’آپ نے ان چالیس برسوں میں حقداروں کی فائلیں روکنے کے علاوہ کیا کام کیا

جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوں اور حکومت آپ کے تجربے سے فائدہ اُٹھائے؟"

"تو کیا ہر حکومت کو ایسے بیوروکریٹس کی ضرورت نہیں ہوتی جو حقداروں کی فائلوں کو راستے ہی میں روک لے؟"

"ہوتی ہے، مگر اس کام کے لیے ان کے پاس نوجوان افسر بھی خاصی تعداد میں موجود ہوتے ہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن روکاوٹیں ڈالنے کا کام جس احسن طریقے سے ہم کر سکتے ہیں۔ وہ آج کے لونڈے کیا جانیں۔ صاحب تجربے کا کوئی بدل نہیں لیکن ہاں سینئر لوگوں کی قدر ہی نہیں"

"آپ کو پتہ ہے وزیراعظم کی عمر کتنی ہے؟"

"وہ شاید فورٹیز میں ہیں"

"اور آپ کو پتا ہے میری عمر کتنی ہے؟"

"آپ تو ماشاءاللہ خاصے کھانگڑ ہیں"

"آپ نے یہ لفظ اچھا استعمال نہیں کیا۔ تاہم شکر ہے کہ آپ کو احساس ہے میں خاصا بزرگ ہوں"

"اس میں کیا شبہ ہے"

"مگر سینارٹی کے باوجود ہر دفعہ ٹرخا دیا جاتا ہوں۔ لگتا ہے اس ملک کو اب تجربہ کار لوگوں کی ضرورت نہیں رہی!"

"آپ گزشتہ ۳۵ برس سے کسی نہ کسی صورت میں برسرِاقتدار طبقے میں شامل رہے ہیں۔ آپ کے تجربے سے ملک اور قوم کو کیا فائدہ پہنچا؟"

"آپ کج بحثی سے کام لے رہے ہیں، میں بزرگی کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ملک وقوم کے مفاد کو لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ افسوس سینئر لوگوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے!"

ڈرائیور کے فائدے اور نقصانات!

آج میں نے اپنی کار ورکشاپ بھیجی تو ایک دوست کی کار مستعار لینا پڑی جو معہ ڈرائیور کے تھی۔ چنانچہ آج میں دن بھر پچھلی سیٹ پر ٹیک لگائے ڈرائیور کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے کہتا رہا اور مجھ پر پہلی دفعہ کھلا کہ ڈرائیور کے کتنے فائدے ہیں؟ سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ انسان اگر شکل سے ڈرائیور لگتا بھی ہو تو پچھلی سیٹ پر دھون اکڑا کر بیٹھنے سے وہ مالک لگنے لگتا ہے۔ کئی دفعہ ٹریفک کا سپاہی مجھے ڈرائیور سمجھ کر ناگوار قسم کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا جس پر اسے سمجھانا پڑتا تھا کہ میاں منہ سنبھال کر بات کرو میں ڈرائیور نہیں کار کا مالک ہوں۔ آج میں کار کا مالک نہیں تھا مگر چوراہے میں کھڑے ٹریفک کانسٹیبل سپاہی نے مجھے مالک کا پروٹوکول دیا۔ ڈرائیور کا دوسرا فائدہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ کئی دنوں سے دوستوں کی جو کتابیں میرے سرہانے دھری تھیں اور انہیں سونگھنے کی نوبت نہیں آتی تھی، آج میں اس فریضے سے بھی عہدہ برا ہو گیا۔ میں نے تین چار گھنٹوں میں چلتی کار میں دس پندرہ کتابوں کی ورق گردانی کی اور یوں اب اس قابل ہوں کہ ان پر سیر حاصل گفتگو کر سکوں۔ ڈرائیور کا ایک فائدہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ چلتی کار میں کتابوں کو سونگھنے کے علاوہ اونگھنے کا بھی خوب موقع ملتا ہے۔ میں کار کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز صاحبوں کو دیکھتا تھا تو بہت مرعوب ہوتا تھا کہ شاید وہ غور وفکر یا گیان دھیان میں مشغول ہیں، آج پتہ چلا کہ قیلولہ فرما رہے ہوتے ہیں۔

تاہم ڈرائیور کے فوائد میں سے سب سے بڑا فائدہ جو میں گنوانے لگا ہوں، وہ یہ

ہے کہ انسان روزانہ ایک ہی راستے سے گزرنے کی وجہ سے جس اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈرائیور کی موجودگی میں وہ اس اُکتاہٹ سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں روزانہ سبزہ زار میں سے بھی گزروں تو اس سبزہ زار سے اُکتا جاتا ہوں چنانچہ میں رستے بدل بدل کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا مگر یہ راستے تین چار سے زیادہ بہر حال نہیں ہوتے یعنی شرعی حدود ہی میں ہوتے ہیں چنانچہ یہ تین چار راستے بھی زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ پھر سمجھ نہیں آتی کہ ان رستوں کی اُکتاہٹ سے خود کو کیسے محفوظ رکھا جائے؟ یہ مشکل بھی آج ڈرائیور ہی نے دور کی۔ میں جن راستوں سے دن میں تین چار دفعہ گزرتا تھا، ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اُکتاہٹ سے بچ گیا اور دوسرے یہ کہ سامنے سے آنے والی اندھا دُھند ٹریفک کے خوف سے بھی محفوظ ہو گیا!

ڈرائیور کے کچھ فوائد اور بھی ہیں مگر یہ فوائد خود ڈرائیور نے مجھے بتائے ہیں مثلاً یہ کہ ڈرائیور کی موجودگی میں گاڑی صاف ستھری نظر آتی ہے کہ وہ جہاں صاحب کے انتظار میں گاڑی کھڑی کرتا ہے۔ گاڑی سے اُتر کر اسے کپڑا مارنے لگتا ہے۔ سروس کرانے کے لیے خود سروس اسٹیشن نہیں جانا پڑتا۔ گاڑی ورکشاپ میں بھیجنا پڑے تو مکینک کے سرہانے بھی وہ خود ہی کھڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ فوائد اس نے اور بھی بتائے تھے لیکن آپ انہیں بھی اس وغیرہ وغیرہ ہی میں شامل سمجھیں!

تاہم آج ڈرائیور کو ساتھ رکھنے کی وجہ سے جہاں ڈرائیور کے فوائد کا علم ہوا، وہاں اس کے کچھ نقصانات بھی سامنے آئے۔ مثلاً ایک نقصان آنکھیں بند کرنے کی وجہ سے ہوا۔ ڈرائیور گانوں کی کیسٹ سننے میں مگن رہا اور میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہا کہ شاید وہ تمام راستوں سے واقف ہے لیکن پتا چلا کہ کچھ رستے اس کے لیے نئے بھی تھے چنانچہ دو تین بار ایسا ہوا کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پتہ چلا کہ ہم متضاد راستے کی طرف سفر کر رہے تھے چنانچہ گاڑی کو کئی میل واپس لانا پڑا۔ وہ سفر جو بالکل رائیگاں جائے اس

کا بہت افسوس ہوتا ہے!

دوسرا نقصان جو سامنے آیا وہ بھی آنکھیں بند کرنے ہی کی وجہ سے تھا۔ آنکھیں بند رکھنے سے میں رستوں کی تکرار سے پیدا ہونے والی اُکتاہٹ سے تو محفوظ ہو گیا لیکن یہ رستے پرانے ہونے کے باوجود روزانہ آنکھوں میں نئے منظر بھی جگاتے تھے، نیز بعض اوقات یوں بھی ہوا کہ اس اُکتاہٹ اور نئے رستے کی جستجو کے نتیجے میں مجھے منزل کی طرف لے جانے والا کوئی ایسا نیا راستہ مل گیا جس نے میری بہت سی مشکلیں آسان کر دیں۔ آنکھیں بند رکھنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مجھے مسافت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا یعنی مجھے پتہ ہی نہ چلا میں نے آج کتنا رستہ طے کیا ہے۔ شام کو کار کا میٹر دیکھا تو پتا چلا کہ اتنا گھومنے کے باوجود کام کوئی بھی نہیں ہوا، میٹر اور سرکاری اعداد و شمار ایک جیسی چیز ہیں۔ انسان جو رستہ طے کرے اسے وہ نظر بھی آنا چاہیے اور اس کا احساس بھی ہونا چاہیے۔

ڈرائیور کے نقصانات ایک کار کے مالک نے بھی مجھے بتائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈرائیور کو کھلی چھٹی کبھی نہیں دینا چاہیے، اسے مسلسل یہ احساس رہنا چاہیے کہ اسے کوئی چیک کرنے والا بھی ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو امانت میں خیانت کا امکان بہرحال موجود رہے گا یعنی یہ ممکن ہے کہ ڈرائیور نے آپ کو ورکشاپ کا جو بل دیا ہے اس کا آدھا بھی خرچ نہ ہوا ہو بعض ڈرائیور تو محض اپنی ''کمائی'' کی خاطر کار کا انجر پنجر ہلا دیتے ہیں اور مالک کو پتہ اس وقت چلتا ہے جب پتا چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا!

پس ثابت ہوا کہ انسان ڈرائیور کی موجودگی میں ریلیکس ضرور کرے مگر اتنا بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ڈرائیور ریلیکس ہو جائے اور ایسے رستوں پر چل پڑے جو منزل سے دور لے جانے والے ہوں۔ اس طرح کا سفر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، خواہ یہ سفر کوئی فرد کرے یا کوئی قوم، یہ دائروں کا سفر ہے اور اس کا خمیازہ ہم نے پہلے ہی بہت بھگتا ہے!

انڈونیشیا کے بارے میں چند اندازے!

نہ کبھی انڈونیشیا میں مشاعرہ ہوتا تھا اور نہ کبھی انڈونیشیا دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ تو بھلا ہو غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس کا جو جکارتہ میں منعقد ہوئی اور یوں مشرق بعید کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کے لیے وزیراعظم کے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے صرف تین چار دن شیروانی پہننا پڑی مگر یہ ایسی چیز ہے کہ اسے اُتارے ہوئے بھی دس دن ہو گئے ہیں لیکن لگتا ہے ابھی تک پہنی ہوئی ہے چنانچہ بیٹھتے وقت اپنے ہاتھ مشرق اور مغرب میں پھیلاتے ہوئے اس کا گھیرا اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے شیروانی نہیں صرف اس کی دہشت اُٹھائے پھر رہا ہوں۔ میرے نزدیک قومی لباس وہ ہے جو پوری قوم پہنتی ہو چنانچہ اس وقت سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کے عوام متفقہ طور پر شلوار قمیض اور اس پر واسکٹ پہنتے ہیں، یہ لباس خوبصورت بھی ہے، ہمارے موسم کے مطابق بھی ہے اور پوری طرح فنکشنل بھی ہے۔ شیروانی ان دنوں بھارت کا قومی لباس ہے چنانچہ آپ نے نرسیما راؤ سے وی پی سنگھ تک سب کو شیروانی میں ملبوس دیکھا ہوگا۔ وزیراعظم میاں نواز شریف کو چاہیے کہ وہ قومی لباس کے معاملے پر از سرِنو غور و فکر کریں کہ قومی لباس تو وہی ہوتا ہے جو پوری قوم خوش دلی سے پہنتی ہو۔ شیروانی تو زیادہ سے زیادہ ''فارمل ڈریس'' ہونی چاہیے۔ اسے ہر وقت اُٹھائے پھرنا یا پہنے رکھنا عملی طور پر ناممکن ہے۔

بات انڈونیشیا کی ہو رہی تھی، درمیان میں شیروانی آ گئی، میرے پاس انڈونیشیا

کے بارے میں بتانے کی بہت سی باتیں ہیں مگر میں ان میں سے کسی کو بھی حتمی قرار نہیں دے سکتا کہ ایک تو ہم نے پورا انڈونیشیا نہیں دیکھا صرف جکارتہ دیکھا اور دوسرے یہاں ہمارا قیام بھی دنیائے فانی کی طرح چند روزہ تھا اور چند روز کی سیاحت کے نتیجے میں فیصلے نہیں سنائے جاتے، صرف اندازے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ جکارتہ کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ یہ صفائی ستھرائی اور ڈسپلن کے لحاظ سے ہمارے کسی بھی شہر سے بہتر ہے، یہ رقبے میں کراچی سے قدرے چھوٹا اور آبادی میں قریباً برابر ہے۔ اس کی سڑکیں بین الاقوامی معیار کی ہیں اور ٹریفک قاعدے قانون کے مطابق چلتا ہے۔ چنانچہ رش کے اوقات میں ٹریفک آہستہ تو ہو جاتا ہے ہماری طرح جام نہیں ہوتا۔ ٹریفک پولیس بھی ہماری پولیس سے زیادہ چوکس نظر آئی۔ جکارتہ میں ڈیپارٹمنٹل اسٹورز امریکہ اور یورپ کے معیار کے ہیں، ہمارے ہاں ابھی تک اس معیار کا ایک سٹور بھی نہیں ہے، عمارتیں سر بفلک ہیں اور یوں جکارتہ ایک ماڈرن دارالحکومت کی ''لک'' دیتا ہے۔

جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے، وہ بے حد خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں پاکستانیوں کے لیے بہت محبت نظر آئی۔ اس کی وجہ اسلام کے ساتھ ان کا مضبوط تعلق ہے جو مکمل مغربی بودوباش کے باوجود کم نہیں ہوا۔ مرد اور عورتیں سب مغربی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ میں یہاں کی سب سے بڑی مسجد، مسجد استقلال میں عشاء کی نماز ادا کرنے گیا تو قریباً ایک سو نمازی اس وقت مسجد میں موجود تھے، اگلی صفوں میں مرد اور پچھلی صفوں میں عورتیں خدا کے حضور سجدہ ریز تھیں۔ ان میں سے کچھ لڑکیوں نے نماز کے دوران منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھے۔ صرف اتنا تھا کہ رانوں کو ایک کپڑے سے ڈھانپ لیا گیا تھا مگر سلام پھیرتے ہی یہ کپڑا اُتار کر اس طرح پرے رکھ دیا جس طرح ہمارے ہاں خواتین اذان سننے کے بعد دوپٹہ سر سے ہٹا کر واپس اصلی جگہ لے آتی ہیں! مجھے یہ منظر بہت اہم لگا۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے، ایک اسلام کی اس تشریح کا جو انڈونیشیا سمیت بیشتر اسلامی ممالک میں کی جارہی ہے اور جو برصغیر سے بہت مختلف

ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حد تک "لبرل ازم" کے باوجود اسلام دلوں سے نکلا نہیں!

انڈونیشیا میں مسلمان ۸۷ فیصد ہیں لیکن حکمران اس ملک کا اسلامی تشخص نہیں چاہتے، صدر سوہارتو جو گزشتہ ۲۷ برس سے اقتدار سے وابستہ چلے آ رہے ہیں، ملک میں "دینِ اکبری" قسم کا مذہب رائج کرنا چاہتے ہیں چنانچہ مسجد استقلال کے پہلو میں ایک مندر اور ایک گرجا بھی سرکاری طور پر تعمیر کر دیا گیا ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں خنزیر کا گوشت کھلم کھلا "سرو" کیا جاتا ہے۔ فحاشی اس درجہ ہے کہ بڑے ہوٹلوں میں نہ صرف مساج ہاؤس قائم ہیں جہاں لڑکیاں مردوں کے مساج پر مامور ہیں بلکہ "روم سروس" کو فون کر کے یہ لڑکیاں مساج کے لیے اپنے کمرے میں بھی طلب کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح شراب بڑے ہوٹلوں میں بھی سرو ہوتی ہے اور جگہ جگہ بار بھی قائم ہیں۔ ٹی وی پروگرام دیکھ کر اس امر کا شائبہ تک نہیں ہوتا کہ ۸۷ فیصد اکثریت کے مسلمانوں کا ملک ہے۔ یہاں کا مذہبی طبقہ اس صورت حال سے خوش نہیں ہے، میں ایک اپنے تجزیہ نگار دوست کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ یہ صورت حال جوں کی توں قائم رہے گی، مجھے ایک خاموش انقلاب کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے پاکستان میں "ملا" کے اسلام سے میرا دم گھٹتا ہے لیکن جکارتہ میں "مسٹر" کے اسلام سے بھی مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

انڈونیشیا میں دو سو سے زیادہ زبانیں اور بولیاں ہیں، ایک زبان اس کے علاوہ ہے جو باقاعدہ تیار کی گئی ہے، اس کا نام "بھاسا انڈونیشی" ہے۔ یہ یہاں کی رابطے کی زبان ہے۔ مرحوم ایوب خان نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اسی طرح کی ایک کوشش کی تھی جو کامیاب نہیں ہو سکی تھی تاہم لگتا ہے انڈونیشیا میں یہ تجربہ کامیاب رہا ہے اس زبان میں کئی اخبار بھی نکلتے ہیں۔

مجھے جکارتہ میں قیام کے دوران ایک احساس یہ ہوا کہ یہاں بہت چوکس قسم کی آمریت قائم ہے اور لوگوں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ ہم نے مسجد

استقلال میں قدم رکھا ہی تھا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس وائرلیس والوں نے مسجد کے آخری سرے تک ہماری آمد کی خبر پہنچادی جس کے نتیجے میں ہر چالیس پچاس گز کے بعد کوئی دوسرا شخص وائرلیس ہاتھ میں تھامے ہماری راہنمائی اگلے شخص تک کرتا تھا۔ میری اور میرے دوستوں کی خواہش تھی کہ میں زرق برق جکارتہ کے علاوہ اس کا اصلی چہرہ بھی دیکھوں چنانچہ میں نے دو تین دفعہ ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں پرانے جکارتہ کی سیر کے لیے لے جائے لیکن اس نے ہر دفعہ ٹرخا دیا۔ میرے ساتھی انور ساجدی کا کہنا تھا کہ یہ ہمیں کبھی بھی وہاں نہیں لے جائے گا کہ اسے اس کی اجازت نہیں ہے اور ساجدی کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس کے باوجود غربت و افلاس کے مناظر جکارتہ میں چھپائے نہیں چھپتے۔ ٹریفک سگنلز پر گاڑیوں کے رُکتے ہی معصوم بچے ہاتھ پھیلائے سامنے آن کھڑے ہوتے تھے۔ اسی طرح بارش کے دوران بچے کسی ڈیپارٹمنٹ سٹور کے باہر چھتریاں لیے کھڑے ہوتے ہیں اور کاروں سے اُترنے والے گاہکوں کو چھتری کے سائے میں اندر تک لے جاتے ہیں۔ میں نے بہت کم کپڑوں میں ملبوس پاؤں سے ننگے ان بچوں کو سردی سے کانپتے دیکھا۔ ابھی تک کسی بھی اسلامی ملک میں وہ صبح طلوع نہیں ہوئی جسے آج سے چودہ سو برس پیشتر لوگوں نے فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوتے دیکھا تھا۔

◇≈◇≈◇

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

جب راشد حسن رانا اور ڈاکٹر فاروق نے مجھے "زاویے" کے زیر اہتمام اظہار خیال کی دعوت دی اور بتایا کہ بعض دیگر کالم نویسوں کو بھی اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا ہے تو میں سمجھا کہ شاید کالم نویسوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی متحدہ محاذ بنایا جا رہا ہے چنانچہ میں نے یہ تجویز ذہن میں رکھی کہ اس متحدہ محاذ کی صدارت بھی نصراللہ خان صاحب کو سونپی جائے، واضح رہے ہم کالم نویسوں کے پاس بھی ایک نصراللہ خان ہیں، بس ان میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ نوابزادہ نہیں ہیں۔ تاہم جمہوریت کے لیے یہ دونوں نصراللہ سرگرم عمل رہے ہیں۔ البتہ نوابزادہ کو جب "فتح قریب" کی نوید ملنے لگتی ہے تو وہ نروس ہو جاتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں ان کے جمہوری محاذ کا کیا بنے گا چنانچہ بسا اوقات انہیں مارشل لاء کے لیے راہ ہموار کرنا پڑتی ہے تاکہ جمہوریت کے لیے ان کی جدوجہد جاری رہ سکے۔ تاہم میری یہ تجویز دھری کی دھری رہ گئی جب مجھے بتایا گیا کہ موضوع گفتگو کالم نگاروں کے حقوق نہیں بلکہ ان کے قومی فرائض کے حوالے سے ہے۔
اب یہ تو سراسر زیادتی ہے کہ جو لوگ دوسروں کو قومی ذمہ داریاں یاد دلانے میں لگے رہتے ہیں انہیں ان کی اپنی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں لہٰذا میرے نزدیک یہ موضوع کالم نگاروں کی کردار کشی کی ذیل میں آتا ہے اور میں اپنے تمام کالم نویس دوستوں کی طرف سے اس زیادتی پر بھرپور احتجاج کرنا ضروری سمجھتا ہوں! ہمارا ارادہ تو واک آؤٹ کا تھا لیکن مذاکرے کے ساتھ چونکہ ڈنر کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اس لیے یہاں

موجود دائیں اور بائیں بازو کے کالم نگاروں نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک معمولی سی بات پر دائیں اور بائیں بازو کے مل کر کھانے کی روایت کو ختم کیا جائے!

خواتین و حضرات! برادرم انتظار حسین کی طرح میں بھی تقریروں اور مقالوں کے بہت خلاف ہوں چنانچہ ڈاکٹر فاروق اور راشد حسن رانا کی جگہ اگر میں ہوتا تو ''کالم نویسوں کی قومی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر کسی مقرر یا مقالہ نگار کو زحمت کلام نہ دیتا بلکہ بس کالم نگاروں کو یہاں جمع کرتا اور گزارش کرتا کہ اپنی جائیداد کے گوشوارے ساتھ لیتے آئیں، اس کے علاوہ کسی حکومت سے اگر انہوں نے کوئی خصوصی مراعات حاصل کی ہیں اس کی تفصیل بھی یہاں بیان کریں۔ اس آدھ پون گھنٹے کی نشست میں پتا چل جاتا کہ کالم نویس اپنی قومی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے ہیں یا صرف حلوہ پوری کھاتے رہے ہیں۔ دوسرا کام میں یہ کرتا کہ کالم نگاروں سے تقریریں کرانے کی بجائے ان سے گزارش کی جاتی کہ وہ مختلف حکومتوں کے دور میں لکھے گئے کالموں میں سے اپنا ایک ایک کالم پڑھ کر سنائیں تاہم اس میں ایک احتیاط یہ برتی جاتی کہ سامعین میں سے بھی کسی صاحب کو دعوت دی جاتی کہ انہی کالم نگار کے مختلف ادوار میں لکھے گئے کالموں میں سے ایک ایک کالم کا انتخاب وہ بھی کریں اور حاضرین کو سنائیں، اس صورت میں یہ محفل بہت دلچسپ ہو جاتی اور اُردو کے طلباء و طالبات کو شعر گربہ کی نہایت خوبصورت مثالیں ان کالموں میں مل جاتیں نیز صنعت تضاد وغیرہ کے بارے میں بھی انہیں خاصا مواد میسر آجاتا!

میرے نزدیک اس محفل میں ایک چھوٹا سا کام اور بھی کرنے کا تھا۔ محکمہ اطلاعات سے گزارش کی جاتی کہ گزشتہ ۳۰ برس سے جو کالم نگار اور تجزیہ نگاران کے محکمے کی پے لسٹ پہ چلے آرہے ہیں ان کی ایک جامع فہرست مہیا کی جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کون سے کالم نگار ''قومی ذمہ داریاں'' بطریق احسن ادا کرنے میں مشغول ہیں اور کون ہیں جو قومی خزانے سے بھاری رقمیں وصول کرنے کے باوجود ''قومی ذمہ داریاں'' ادا کرنے

میں تساہل برت رہے ہیں؟ ایک چھوٹا سا کام اور بھی ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ خفیہ ایجنسیوں سے بھی رپورٹ طلب کی جاتی کہ ''قومی ذمہ داریاں'' کی ادائیگی کے ضمن میں وہ کن کالم نویسوں کی حوصلہ افزائی کرتے چلے آرہے ہیں؟ اس کام کا دائرہ مزید وسیع ہوسکتا تھا اگر اسے غیر ملکی سفارت خانوں تک پھیلایا جاتا لیکن اس کی ضرورت نہیں کہ جب کوئی شخص ضمیر فروشی کا سلسلہ شروع کردے تو پھر اسے مال کی فروخت کے لیے بیرونی منڈیوں کی تلاش میں بھی نکلنا ہی پڑتا ہے۔ ایک طوائف سے کسی نے کہا ''تم فلموں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟'' اس نے کہا ''فلم میں جانے کی کیا ضرورت ہے، اللہ یہیں عزت کی روٹی دے رہا ہے'' تاہم یہ نقطہ نظر طوائف کا تھا!

خواتین و حضرات ممکن ہے میری ان تجاویز سے کسی کو یہ گمان گزرے کہ میں نے بدگمانی کی حد کردی ہے اور کچھ ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے تمام کالم نویس بازار میں اپنی اپنی قیمتوں کے ٹیگ گلے میں ڈالے کھڑے ہیں۔ اگر میری ان سطور سے یہ تاثر اُبھرا ہے تو بہت بری بات ہے کیونکہ اپنے بارے میں میری رائے ہمیشہ سے بہت اچھی رہی ہے۔ جبکہ تفنن برطرف اصل صورتحال یہ ہے کہ ہمارے کالم نویسوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی بشری کمزوریوں سے قطع نظر، روزِ اوّل سے قومی ذمہ داریاں پوری کرتی چلی آرہی ہے۔ ان میں سے کچھ کو تو میں ولی اللہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہر قسم کی ترغیب و تحریص اور حکومتی جبر کے باوجود اعلائے کلمۃ الحق کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنے اُجلے دامن پر کوئی داغ دھبہ نہیں آنے دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے درمیان کچھ کالی بھیڑیں موجود ہیں جو قومی ذمہ داریاں تو پوری کرتی ہیں لیکن ان کی قوم کوئی اور ہوتی ہے۔ باقی رہا یہ کہ کالم نویس کی ذمہ داری کیا ہے تو وہ صرف اتنی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے اپنے خدا اور ضمیر کو گواہ بنا کر لکھے۔ ہم لوگوں میں خرابی یہ ہے کہ ہم اپنے کرپٹ کالم نویس کو اس دیانت دار کالم نگار پر ترجیح دیتے ہیں جو ہم سے اختلاف رکھتا ہے۔ ہم لوگوں نے یہی رویہ سیاست دانوں کے حوالے سے اپنا رکھا ہے۔ ہم اپنے اپنے ظالموں اور غاصبوں کا دفاع کرتے

ہیں اور فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ شاید پوری دنیا میں ہم سے زیادہ دھڑے بند کہیں نہیں ہے اور پرابلم یہ ہے کہ دونوں طرف کے مظلوم اپنا الگ دھڑا بنانے کی بجائے اپنے قاتل کے دھڑے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کی کامیابی پر سڑکوں پر بھنگڑے ڈالتے ہیں، اسے کاندھوں پر بٹھا کر میلوں لمبے جلوس نکالتے ہیں اور اس کی شان میں گستاخی کرنے پر دوسرے دھڑے کے کسی مظلوم کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہیں۔

خواتین و حضرات! ملزم صرف وہ کالم نویس ہی نہیں جو ظالموں کے ساتھی ہیں۔ ملزم ہم سب ہیں، لگتا ہے ہماری پوری قوم کو ''گڑھتی'' کسی لڑاکے ککے زئی نے دی ہے۔ چنانچہ ہم کھانے پینے کے وقفہ کے دوران کالی ہانڈیاں چھت پر لٹکا کر چلے جاتے ہیں اور واپس آ کر ہانڈیاں اُلٹا کر پھر لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانکنا ہوگا۔ اپنی تباہی کی ذمہ داری کسی ایک طبقے پر ڈالنے سے بات نہیں بنے گی۔ فضا میں اُڑتی ہوئی کوئی بدصورت چیل ہو یا فضا میں منڈلاتا ہوا کوئی گدھ، عوام اگر انہیں شاہین قرار دینا چھوڑ دیں اور ان پر شرطیں لگانا بند کر دیں تو پھر کسی کو کسی سے شکایت نہیں رہے گی، نہ عوام کو کالم نویسوں سے اور نہ کالم نویسوں کو عوام سے۔

(''زاویے'' کے زیر اہتمام لاہور میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

✧ ✧ ✧

''مایوس'' مریض!

برے سے برے حالات میں پر اُمید رہنے کے لیے انسان کا حوصلہ مند ہونا ضروری ہے جبکہ مایوس ہونے کے لیے انسان کو صرف ایک کام کرنا پڑتا ہے اور وہ مایوس ہوتا ہے، مثلاً اگر آپ چاہیں تو اس بات پر بھی سخت دُکھی ہو سکتے ہیں کہ ''قذافی سٹیڈیم میں ہزاروں لوگ میچ دیکھ رہے ہیں، فضا میں پرواز کرتی ہوئی چیل کی بیٹ (وٹھ) صرف مجھی پر کیوں گری؟'' یہ جو ہمارے ہاں گلی گلی اور کوچے کوچے میں ''مایوس مریضوں'' کے ''مسیحا'' نظر آتے ہیں، یہ مسیحا نہیں، مایوسی کے ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ ویسے بھی مایوسی کوئی نیا مرض نہیں، آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے کچھ کتبے دریافت ہوئے ہیں جن پر لکھا ہے ''آج نوجوان بہت گستاخ ہو گئے ہیں، بزرگوں کا احترام نہیں کرتے، زمانہ برائی کی طرف جا رہا ہے، ہائے اللہ کیا بنے گا؟'' ایک اسی طرح کے قنوطی بزرگ بس میں سفر کر رہے تھے، بس میں چند نوجوان بھی سوار تھے، جو ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔

بزرگ نے انہیں ٹوکا اور کہا ''اقبال نے تم جیسے نوجوانوں ہی کے بارے میں کہا تھا:

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اُٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں

اس پر ایک نوجوان نے کہا ''بزرگو! گستاخی معاف، اقبال نے جب یہ شعر کہا تھا تو اس وقت نوجوان آپ تھے، ہم تو پیدا بھی نہیں ہوئے تھے!''

گزشتہ روز ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ اس بات پر گرنبل کر رہے تھے کہ

لوگوں کو موت یاد نہیں رہی۔ جنازوں میں بھی اس طرح شریک ہوتے ہیں جیسے پکنک پہ جارہے ہوں۔ اس پر مجھے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''مردہ بدست زندہ'' یاد آ گیا جو آج سے نصف صدی پیشتر شائع ہوا تھا اور اس میں بھی ہو بہو یہی رونا رویا گیا تھا۔ ایف اے کے نصاب میں ایک مضمون ''سرسیّد کا بچپن'' کے عنوان سے شامل تھا جس میں طالب علموں کو بتایا گیا تھا کہ سرسیّد بچپن میں بہت شریر تھے مگر ان کی شرارتیں بہت پاکیزہ ہوتی تھیں مثلاً یہ کہ اگر کسی کو نالی کے کنارے اکڑوں بیٹھا دیکھتے تو اسے دھکا دے دیتے تھے یا مولانا عبدالحلیم شرر کے ایک مضمون (جو بہت مشکل سے نصاب سے خارج کروایا گیا) کا مفہوم یہ تھا کہ جب ہم جوان تھے تو حسینائیں ہمارے پاس نہیں پھٹکتی تھیں اور اب جب کہ بوڑھے ہو گئے ہیں تو ان کے جھرمٹ ہمارے گرد منڈلاتے رہتے ہیں، لیکن اب کیا فائدہ؟ (یہ تلخیص میں نے خاصے مہذب لفظوں میں بیان کی ہے تا کہ اخبار میں اشاعت کے قابل ہو سکے) اسی طرح آج سے صدیوں پہلے کی تاریخ، شاعری اور ادب کا مطالبہ کر کے دیکھ لیں، انسان کی ساری خوبیاں اور خرابیاں آج بھی ہو بہو وہی ہیں جو ازل سے اس کی سرشت میں چلی آ رہی ہیں۔ شہروں میں رہنے والا انسان آج بھی ''جنگل'' کا مکین ہے، شعیب بن عزیز نے ٹھیک کہا ہے ؎

چلا جو شہر کو انساں کسی نے یہ نہ کہا
یہ تیغ و تیر انہیں جنگلوں میں رہنے دے

وہ جنگل سے شہر میں اپنے ''تیغ و تیر'' سمیت آ رہا ہے۔ ہمیں اس سے تیغ و تیر واپس لینے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مایوس ہونے کی صورت میں تو انسان خود ہتھیار اُٹھالیتا ہے اور اس کے پیچھے تعمیر نہیں، تخریب کا جذبہ ہوتا ہے۔

یہ ساری باتیں مجھے اس لیے یاد آ رہی ہیں کہ آج پوری قوم مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی باتوں سے مایوسی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مایوس ہونے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت دور دور

تک روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آ رہی لیکن رات کے آخری حصے میں جب گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا ہے کیا روشنی ہمارے دروازے پر دستک دینے کے لیے تیار نہیں کھڑی ہوتی؟ کیا غلامی کے بدترین دنوں میں ہمارے درمیان اقبالؒ اور قائداعظمؒ پیدا نہیں ہوتے تھے؟ کیا موجودہ حالات میں اس امر کی رتی بھر اُمید تھی کہ ایک عبدالستار ایدھی ہمارے درمیان پیدا ہوگا؟ کیا انصار برنی، عمران خان اور ان جیسے بیسیوں دوسرے لوگ اندھیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھروں سے نہیں نکلے؟ بات صرف عزم اور حوصلے کی ہے۔ مایوس ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ حالات کا دھارا موڑنے کے لیے عزم اور حوصلے سے کام لیں تو ڈوبتی ناؤ کنارے لگ جائے گی۔ بحران میں مبتلا قومیں بحران کا مقابلہ کرنے سے نئی زندگی پاتی ہیں اور اگر وہ مایوس ہو جائیں تو بحران شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ پر انسان اس سے بھی گر نبل کرتا ہے کہ نوجوان ہنستے کھیلتے کیوں نظر آتے ہیں اور فضا میں اُڑتی ہوئی چیل کی بیٹ سٹیڈیم کے ہزاروں افراد کے مجمع میں سے صرف اسی پر کیوں گری؟

ٹائم نہیں ملتا!

وقت کی جتنی قدر ہم لوگ کرتے ہیں شاید ہی دنیا کی کوئی اور قوم کرتی ہو بس اس کا اظہار قدرے مختلف ہوتا ہے مثلاً کسی ادیب سے پوچھیں کہ برادر آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ وہ کہتا ہے یار لکھنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا، کسی سیاستدان سے پوچھیں کہ عالمی سیاسیات پر فلاں کتاب بہت اچھی آئی ہے، آپ نے پڑھی ہے؟ وہ کہے گا بھائی پڑھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا، کسی عالم دین سے پوچھا جائے کہ ''جناب دنیا کدھر جارہی ہے اور آپ کدھر جارہے ہیں، آپ نے کبھی سوچا؟'' اس کا جواب ہوگا ''حضرت! سوچنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا!'' کسی صاحب اقتدار سے سوال کیا جائے کہ ''سر! آپ کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟'' وہ کہے گا ''سائیں! اللہ سے ڈرنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا''

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ اپنے قیمتی وقت کا ایک ایک لمحہ بھی کسی غیر ضروری کام پر صرف نہیں کرتے، اس کا مزید اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ٹریفک سگنل سرخ ہوتا ہے اور ہم رینگتے رینگتے چوک کے درمیان میں پہنچ جاتے ہیں جس سے دوسری طرف کی ٹریفک بند ہو جاتی ہے اور یوں بتی کے سبز ہونے کا انتظار ہی نہیں کرنا پڑتا۔ وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب قومی ترانے کے اختتام سے پہلے ہی ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمیں وقت کے قیمتی ہونے کا احساس اس وقت ہی ہوتا ہے، جب ویگن، بس، ٹرین حتیٰ کہ جہاز میں سوار ہوتے ہوئے بھی ہم افراتفری کا مظاہرہ کرتے ہیں، جہاز میں چڑھنے کی جلدی ہمیں شاید اس لیے ہوتی ہے

کہ پہلے چڑھنے والے کہیں منزل مقصود پر ہم سے پہلے نہ پہنچ جائیں۔ شادی بیاہ یا عام ضیافتوں میں باب کھانا ''کھلنے'' کی آواز پڑتی ہے تو ایک بھگدڑ سی مچ جاتی ہے، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہماری قوم کو وقت کی قدر و قیمت کا کس قدر احساس ہے!

وقت کے قیمتی ہونے کے احساس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ہم لوگ کسی محفل میں وقت پر نہیں پہنچتے۔ مثلاً اگر ولیمے کی دعوت کا وقت دو بجے ہے تو ہم چار بجے پہنچیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں لوگ وقت کے پابند نہیں ہیں لہٰذا بروقت پہنچ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے اور یہ بات ہم سب عقلمند بیک وقت سوچ رہے ہوتے ہیں۔ وقت ہمارے نزدیک اتنا اہم ہے کہ ہم گھڑی کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے اور اگر کبھی گھڑی گھر بھول آئیں تو بار بار راہ چلتوں کو روک کر پوچھتے ہیں ''بھاجی ٹائم کیہ ہویا جے؟'' تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہم نے جہاں پہنچنا تھا وہاں کتنے گھنٹے لیٹ پہنچ رہے ہیں؟ محض وقت کے قیمتی ہونے کے احساس کی وجہ سے ہم نے بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے، ان کی یاد بہت ستائے تو عید شب برات پر ٹیلی فون پر ہیلو ہیلو کہہ لیتے ہیں، گھر سے نکلتے ہوئے کوئی ضرورت مند روکتا ہے تو ہم دامن چھڑا کر نکل جاتے ہیں کہ کسی ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے، ہم لوگ اتنی جلدی میں ہوتے ہیں کہ راہ میں نظر آنے والے غربت، بے بسی، ظلم اور استحصال کے مناظر بھی ہماری توجہ اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے، ہم اتنی جلدی میں ہیں کہ ہمارے پاس امن، خوشحالی، سکون، استحکام، بے تعصبی اور کشادہ دلی کی منزل کی طرف گامزن ہونے کا وقت بھی نہیں ہے!

ہم لوگ وقت کی قدر و منزلت سے اس قدر آگاہ ہیں کہ بغیر اطلاع کے کسی سے ملاقات کے لیے بھی نہیں جاتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس حوالے سے ایک صاحب سے فون پر میری گفتگو ہوئی:

''ہیلو، عطاء الحق قاسمی صاحب ہیں؟''

''جی بول رہا ہوں، فرمایئے''

''سر! میں آپ کا ایک مداح ہوں، آپ سے ملنا چاہتا ہوں''

''ٹھیک ہے، آپ پرسوں چھ بجے شام غریب خانے پر تشریف لے آئیں''

''سر! میں وقت کا بہت پابند ہوں، چھ بجے کہہ کر اگر وقت پر نہ پہنچوں تو بری بات ہوگی۔''

''تو پھر آپ کتنے بجے آسکتے ہیں؟''

''میں سر، چھ سے نو بجے کے درمیان انشاءاللہ کسی وقت حاضر ہوں گا!''

ان صاحب کو واقعی وقت کے قیمتی ہونے کا احساس تھا ورنہ کئی فون تو ایسے بھی آتے ہیں کہ کل انشاءاللہ کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا، آپ میرا انتظار کریں اس سے ایسے اصحاب کی مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نوع کی مصروفیات اور وقت کے زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کی وجہ سے ہم بروقت مشرقی پاکستان سے مکالمہ نہ کر سکے۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب کو اپوزیشن جماعتوں اور اپوزیشن جماعتوں کو بھٹو صاحب سے مکالمے کا وقت نہ مل سکا اور دس سال کے لیے مارشل لاء ہم پر مسلط ہو گیا۔ کچھ عرصے سے صاحبانِ اقتدار اور صاحبانِ حزبِ اختلاف پھر شدید مصروف ہیں۔ جس طبقے کی پلاننگ سے اس کشمکش کا آغاز ہوا ہے، اس سے کہا جائے کہ

''تمہیں نے درد دیا ہے، تمہی دوا دینا''

یعنی تم نے سیاسی عمل میں رکاوٹ ڈالی تھی، اب سیاسی عمل کو آزاد بھی تم ہی کرو گے تو وہ آگے سے سر کھجاتے ہوئے کہتا ہے ''کیا کریں یار ٹائم ہی نہیں ملتا!''

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں!

آج سے چوبیس سال پہلے جب میں دولہا بنا تو مجھے سمجھایا گیا کہ تمہیں شرمانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، اس کے لیے کچھ کارگر نسخے بھی بتائے گئے مثلاً یہ کہ سفید رومال کی چار تہیں جما کر اسے مسلسل ہونٹوں پر رکھو جس کی وجہ سے بول نہیں سکو گے اور یوں تمہاری اصلیت ظاہر نہیں ہوتی۔ نیز میلے دانتوں کی پردہ پوشی بھی ہو جائے گی اور ''مور اوور'' یہ کہ لوگ تمہیں شرمیلا سمجھیں گے۔ ایک مشورہ یہ بھی دیا گیا کہ دلہن کی سہیلیوں کو کنکھیوں سے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن ایسا کرتے وقت تمہارے چہرے پر حیا کی سرخی ضرور نظر آنی چاہیے۔ اس کے لیے دوستوں نے میرے چہرے پر ایک سرخ رنگ کے محلول کا ہلکا لیپ بھی کیا۔ اسی نوع کے دو چار نسخے اور بھی بتائے گئے جن میں سب سے زیادہ مفید نسخہ یہ تھا کہ شادی سے ایک دن پہلے کوئی پاکستانی فلم دیکھو جس میں ہیروئن کھیتوں میں ہیرو کے ساتھ ''پیلاں'' ڈالنے اور کھل کھیلنے کے بعد گھر آتی ہے اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شرمانے لگتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے دوستوں کی ان ہدایات پر صدق دل سے عمل کیا اور جب اگلے روز ان سے اپنے شرمیلے پن کی رپورٹ مانگی تو ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ تمہارا شرمیلا پن، شرمیلا ٹیگور سے ملتا جلتا تھا۔ جس پر داد، لعنت ملامت کی صورت میں ہی دی جا سکتی ہے۔ مجھے یہ سن کر خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ آپ یقین جانیں میں نے شرمانے کی پوری کوشش کی تھی اور اس میں کامیابی کے لیے اُردو اور پنجابی تو کیا پشتو فلمیں تک دیکھ ڈالی تھیں!

خواتین وحضرات! یہ تفصیل آپ کے سامنے بیان کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ ایشین آرٹس سوسائٹی برطانیہ نے جب اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ سوسائٹی آپ کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر برطانیہ میں ''جشن عطاء الحق قاسمی'' کے عنوان سے ایک بڑی تقریب منعقد کرنا چاہتی ہے تو مجھ پر ''فی البدیہ'' شرمانے کا دورہ پڑ گیا اور آج جب کہ اس جشن میں شرکت کے لیے پاکستان سے برطانیہ آیا ہوں اور آپ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے دل کی باتیں کہنے کی کوشش کر رہا ہوں میں مسلسل اسی کیفیت میں ہوں۔ برادرم اشتیاق میر سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تو انہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، فرمانے لگے آپ آج کی تقریب کے دولہا ہیں۔ میں نے پوچھا دولہا ہوں تو دلہن کون ہے؟ بولے ''دلہن آج کی تقریب ہے'' اس پر میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اس ''دلہن'' کے لیے دعا کی کیونکہ ہمارے ہاں دلہن کے چند دن دولہے کے ساتھ اور پھر باقی عمر چولہے کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ اس ضمن میں کچھ اچھا سلوک دولہے کے ساتھ ہی نہیں ہوتا۔ دلہن تو صرف رُخصتی کے وقت ماں باپ کے گلے لگ کر روتی ہے جبکہ دلہا باقی عمر درودیوار کو چمٹا مار کر روتا ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہید قدرے طویل ہو رہی ہے لیکن تذکرہ چونکہ دلہا بننے کا ہے اس لیے یہ لذیذ حکایت طویل سے طویل تر کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں تو اسی سال کی عمر میں بھی یار لوگ دوسری شادی صرف یہ آواز سننے کے لیے کرتے ہیں کہ ''کڑیو رستہ دیو، منڈا آ ریا جے'' (لڑکیو! راستہ دو، لڑکا آ رہا ہے) تاہم میں نے یہ تذکرہ بنیادی طور پر اس لیے چھیڑا تھا کہ اصلی دلہا بنتے وقت مجھ پر کوئی شرماہٹ طاری نہیں تھی، لیکن آج اس تقریب کا دولہا بنتے ہوئے مجھ پر صرف شرماہٹ ہی نہیں گھبراہٹ بھی طاری ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں تو کسی تقریب میں پہلی صف میں بیٹھنے والوں میں سے بھی نہیں ہوں۔ میں شروع سے ''بیک بنچر'' ہوں اور مجھے عام لوگوں کے درمیان بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی دوست میرے کسی کالم،

ڈرامے، سفرنامے یا شاعری کی تعریف کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے لیکن جب وہ اس سلسلے میں دوسرے سے تیسرا فقرہ بولتا ہے تو مجھ پر شرماہٹ طاری ہو جاتی ہے اور میں گفتگو کا موضوع بدل دیتا ہوں جبکہ آج اتنے بڑے پیمانے پر بین الاقوامی سطح کی تقریب منعقد کی جا رہی ہے جس میں متعدد ملکوں سے دانشوروں کو میرے حوالے سے اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا ہے تو یقین جانیں! میں اندر سے مسمار ہوتا جا رہا ہوں۔ میرے بارے میں ان احباب نے جو اچھی باتیں کی ہیں وہ مجھے شرمسار کرنے کے لیے کافی ہیں تاہم میری دعا ہے کہ میں ان احباب کی توقعات پر پورا اُتروں اور میرا قلم ان خوابوں کی تعبیر میں معاون ثابت ہو جس کے انتظار میں میری اور آپ کی آنکھیں پتھرا سی گئی ہیں۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ وہ خواب کیا ہیں جن کی تعبیر کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں تو مجھے اس سوال پر رونا آ جائے گا کیونکہ یہ خواب بھی کچھ ایسے انوکھے اور انہونے ہیں کہ جن کی تعبیر کے لیے ہمیں ۴۷ سال انتظار کرنا پڑا اور اس کے باوجود ہمارے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ خواتین و حضرات یہ خواب صرف اتنے ہیں کہ جب میں اپنے بچوں کو آئس کریم کھلانے کے لیے جاؤں تو کوئی معصوم سا بچہ اپنے ننھے منے ہاتھوں میں میرے بچوں کے لیے آئس کریم لے کر نہ آئے۔

میں تو جناب والا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی سائل تھانے میں انصاف مانگنے جائے تو اسے گالیاں نہیں! انصاف ملے! ہماری عدالتوں میں عدل جہانگیری ہو اور سب کے لیے ہو۔ ہمیں صاف پانی پینے کو مل سکے، بازار میں جعلی ادویات فروخت نہ ہوں، اشیائے خوردنی میں ملاوٹ نہ ہو۔ کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ کوئی بے گھر نہ ہو، کسی کی بیٹی جہیز کے انتظار میں شباب کی دہلیز پار نہ کرے۔ چھوٹے چھوٹے جائز کاموں کے لیے دفتروں کے چکر نہ کاٹنا پڑیں۔ بیماروں کو دوا ملے، بچوں کو تعلیم ملے، جہیز کا خاتمہ ہو، ہم ملائی پیری کے شکنجے سے نکلیں۔ سیاست دان اور صاحب اقتدار ہمیں اپنی بھیڑ بکریاں نہ سمجھیں۔ ہم امریکہ کے چنگل سے آزاد ہوں، ہمارا مقتدر طبقہ ملکی مفادات پر ذاتی

مفادات کو ترجیح نہ دے۔ خواتین و حضرات! یہ خواب کوئی ایسے خواب تو نہیں ہیں جن کی تعبیر جوئے شیر نکالنے کے مترادف ہو، جب تک ہمارے یہ مسائل حل نہیں ہوں گے، ہمارے لوگ اپنی زمینوں کو خیر باد کہہ کر اجنبی سرزمینوں میں آباد ہوتے رہیں گے اور یوں جس مقصد کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا، اس مقصد تک کبھی ہماری رسائی نہیں ہو سکے گی۔

میں آخر میں ایشین آرٹس سوسائٹی کے کارپردازان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے لیے یہ تقریب منعقد کر کے میری عزت افزائی کی۔ میرا یقین اس امر پر مزید پختہ ہو گیا ہے کہ خلوص دل سے لکھے ہوئے حرف دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں ایک کم مایہ شخص ہوں لیکن میری لفظوں کی اس پذیرائی نے مجھے ایک نیا حوصلہ اور نیا عزم دیا ہے۔ میں وفاقی وزیر برائے سماجی بہبود خصوصی تعلیم جناب شیر افگن کا بھی خصوصی طور پر ممنون ہوں جنہوں نے اس تقریب میں شرکت کے لیے سات سمندر پار کا سفر کیا، اس کے علاوہ ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جو پاکستان، ناروے اور برطانیہ کے مختلف شہروں سے اس تقریب میں اظہارِ خیال کے لیے تشریف لائے اور آپ سب خواتین و حضرات کا بھی کہ برطانیہ کی مصروف زندگی میں سے آپ نے اپنے ایک اہل قلم کے لیے چند لمحے نکالے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرا قلم پہلے بھی آپ کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا ترجمان تھا اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ قلم آپ کے لیے وقف رہے گا۔ بہت بہت شکریہ پاکستان پائندہ باد۔

(برطانیہ میں منعقدہ ''جشن عطاء الحق قاسمی'' کی تقریب میں پڑھا گیا)

بدمعاشی کا سنہری دور!

ان دنوں بدمعاشی پر بہت بری طرح زوال آیا ہوا ہے۔ میں نے بدمعاشی کا سنہری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مجھے یاد ہے علاقے کا جو چوٹی کا بدمعاش ہوتا تھا اس کے پاس صرف گراری والا ایک لمبا سا چاقو ہوتا تھا جس کے لیور کو انگوٹھے سے دبانے سے چاقو ''کرکرکرکر'' کی خوفناک آواز کے ساتھ کھلتا تھا اور اس کی دہشت سے مقابل دم دبا کر بھاگ اُٹھتا تھا اور یوں مقابلے کی نوبت ہی کم کم آتی تھی۔ اس سے کم درجے کے بدمعاش اپنی جیب میں لوہے کا ''پنجہ'' رکھتے تھے جو بوقتِ ضرورت وہ مٹھی پر چڑھا لیتے تھے اور یوں مقابل کے دانت وغیرہ توڑنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس یہ ''ہتھیار'' ہوتے تھے وہ عموماً معاشرے کے دھتکارے ہوئے لوگ ہوتے تھے۔ شریف لوگ اپنے بچوں کو ان کی صحبت میں بیٹھنے نہیں دیتے تھے بلکہ خود ان کے گھر والے انہیں اپنانے سے گریز کرتے تھے۔ اس کے باوجود اگر کسی محلے میں کسی بدمعاش کا گھر ہوتا تو لوگوں کو تحفظ کا احساس بھی ہوتا تھا کہ یہ بدمعاش پورے محلے کی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔

وہ نہ صرف یہ کہ خود محلے میں نظریں نیچے کر کے چلتا تھا بلکہ کسی اور کو بھی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کی عزت و ناموس کو میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کر سکے۔ زیادہ تر لڑائیاں بدمعاشوں کے اپنے گروپوں کے مابین ہوتی تھیں اور عام شہری اس کی زد میں بہت کم آتے تھے اگر کبھی ایسا ہوتا بھی تو گراری والے چاقو اور لوہے کے پنجے سے کشتوں

کے پشتے تو بہر حال نہیں لگ سکتے تھے چنانچہ شدید طور پر متاثر ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی۔ اگر کبھی دو پارٹیوں میں تصادم ہو جاتا تو برف کی دکان پر پڑے ہوئے سوؤں اور پان سگریٹ کی دکان پر بجی سوڈے کی بوتلوں کو بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا جس کے نتیجے میں بسا اوقات بعض راہگیر بھی زخمی ہو جاتے!

جہاں تک چوری چکاری کا تعلق ہے یہ اس زمانے میں بھی ہوتی تھی تاہم چور سارے جسم پر تیل مل کر صرف لنگوٹ پہنے گھر میں داخل ہوتے تھے تاکہ اگر اہل خانہ کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے پکڑنے کی کوشش کریں تو جسم پر ملے تیل کی وجہ سے ان کا ہاتھ پھسل جائے اور یوں وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس زمانے میں ڈاکے بھی پڑتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کسی تاریک گلی میں کسی راہگیر کو چاقو دکھا کر اس سے دس بیس روپے چھین لیے جائیں یا کبھی کبھار کسی سیٹھ کے لوٹے جانے کی خبر سننے میں آتی تھی۔ اس زمانے میں اخباروں میں کرائم رپورٹر نہیں ہوتے تھے چنانچہ یہ واردات شہر میں خوف و ہراس پھیلانے کا باعث نہیں بنتی تھی۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ جرائم میں اضافے کے بعد اخباروں میں کرائم رپورٹر آئے یا کرائم رپورٹوں کے آنے کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا۔ بہر حال جس زمانے کا ذکر میں کر رہا ہوں اس زمانے میں کرائم اور کرائم رپورٹر دونوں نہیں ہوتے تھے۔

اور اب جہاں تک موجودہ زمانے کا تعلق ہے میرے نزدیک یہ بدمعاشی کے زوال کا زمانہ ہے بدمعاشی کی کچھ اپنی اخلاقیات ہوتی تھیں۔ آج کا بدمعاش ان سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ اب بدمعاش کی زد میں اس کے حریف ہی نہیں وہ لوگ بھی آتے ہیں جن سے ان کا کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا۔ اب گراری والے چاقو کی جگہ کلاشنکوف استعمال ہوتی ہے جس کی زد میں ایک نہیں کئی گھرانے آتے ہیں۔ آج کا بدمعاش شرفاء کے گھروں میں دندناتا ہوا داخل ہوتا ہے اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی تشدد کا نشانہ

بنا تا ہے۔ جو بدمعاش، بدمعاشی کے ''سنہری دور'' میں خواتین کی عزت و ناموس کا محافظ ہوتا تھا۔ اب وہ عزت و ناموس کے لٹیرے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ پہلے سڑکوں پر عورتوں کے برہنہ جلوس نہیں نکلتے تھے۔ اب آنکھیں یہ گھناؤنا منظر بھی دیکھتی ہیں۔ پہلے بدمعاش طاقت اور جی داری کے بل بوتے پر بدمعاش کہلاتا تھا۔ اب وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کو کلاشنکوف کے برسٹ میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بدمعاشی کے زوال کی بدترین صورت یہ ہے کہ گزرے زمانے میں جو بدمعاش ہوتے تھے وہ بدمعاش ہی کے روپ میں آتے تھے۔ اب وہ شرفاء کی صورت میں ہمارے درمیان موجود رہتے ہیں۔ افسروں کے بیٹے، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، طالب علم رہنما اور پولیس اہلکار ڈاکو اور لٹیرے بن گئے ہیں چنانچہ انہیں گرفتار کرنا تو کجا انہیں اپنے درمیان تلاش کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ گزشتہ ۴۷ برس میں جہاں دوسرے قومی اداروں پر زوال آیا ہے وہاں بدمعاشی کا ''ادارہ'' بھی زوال کی زد میں ہے۔ کیا پڑھے لکھے سیاسی اور غیر سیاسی بدمعاش اس صورتِ حال پر غور کرنے کی زحمت نہیں فرمائیں گے؟

✧ ✧ ✧

منکہ ایک بھولا بھالا کالم نگار!

مجھے آج یہ اقرار کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں ایک بھولا بھالا کالم نگار ہوں۔ یہ اقرار اس لیے ضروری ہے کہ لوگ مجھے ایک تیز و طرار شخص سمجھتے ہیں۔ یہ وہم انہیں غالباً اس لیے ہوتا ہے کہ میں نے مختلف حکومتوں سے پلاٹ لیے۔ معقول کمیشن پر لوگوں کے کام کرائے لیکن اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ میں ایک بھولا بھالا شخص ہوں اور بہت جلد لوگوں کی باتوں میں آجاتا ہوں اور ایک عرصہ گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں تو خواہ مخواہ غلط فہمی میں مارا گیا تھا!

میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی بات اشاروں کنایوں میں نہیں بہت واضح لفظوں میں بیان کرنا ہوگی تاکہ میرے قارئین کو ایک عرصے سے میرے بارے میں جو غلط فہمی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ میری معصومیت اور بھولپن کا آغاز صدر ایوب خان کے زمانے میں ہوتا ہے۔ صدر صاحب جب برسراقتدار آئے تو انہوں نے بہت مثبت قسم کے اعلانات کیے اور بعض اقدامات تو ایسے کیے جنہیں انقلابی قرار دیا جا سکتا ہے مثلاً انہوں نے کھانے پینے کی دکانوں پر جالیاں لگوادیں اسی طرح مٹھائی جو مجھے بہت پسند ہے ایک دم بہت سستی کردی اور ان کے اس نوع کے احکامات پر مسلسل دو تین مہینے تک عمل ہوا بھی چنانچہ میں ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے ان کی حمایت کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تاکہ اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے میں نے محکمہ اطلاعات کے افسروں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا اتفاق سے یہ لوگ بھی میرے ہم خیال نکلے چنانچہ میں نے

کمرِ ہمت باندھی اور اللہ کا نام لے کر ایوب خان کی حمایت میں کالم لکھنا شروع کر دیے جو محکمہ اطلاعات کے افسروں نے بہت پسند کیے اور اپنی اس پسندیدگی کا اظہار انہوں نے مختلف صورتوں میں کیا۔ انہی دنوں میں نے ایک کالم لکھا جس میں صدر ایوب کو ملک کا بادشاہ بنانے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز صدر ایوب کو بھی بہت پسند آئی اور انہوں نے ایک میٹنگ میں میری حب الوطنی کو سراہا۔ اس زمانے میں کراچی سے پشاور تک جمہوریت کی ٹرین چلائی گئی جس کا مقصد بے وقوف عوام کو بنیادی جمہوریت کے فوائد سے روشناس کرانا تھا۔ میں بھی اس ٹرین میں سوار ہوا بلکہ فرطِ جذبات میں کوئلے سے چلنے والے سیاہ فام انجن پر بیٹھ گیا جس کے نتیجے میں آبلہ پشتی کے علاوہ ستر پشتی کے ضمن میں بھی بعض سنگین نوعیت کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بہر حال میں دس سال تک اس غلط فہمی کا شکار رہا کہ صدر ایوب خان ملک اور قوم کے بہت بڑے محسن ہیں اور اپنے کالموں میں لوگوں کو بھی یہی بتاتا رہا لیکن جب ان کے خلاف عوامی تحریک چلی جس کے نتیجے میں انہیں اقتدار سے الگ ہونا پڑا تو مجھ پر یہ راز آشکار ہوا کہ وہ تو جمہوریت کی چلتی ٹرین میں روڑا اٹکانے والے پہلے شخص تھے، اگر وہ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں ہی میں فوج کو سیاست میں ملوث کرنے کی غلطی نہ کرتے تو ہمارے ہاں جمہوریت کی بنیادیں کب کی مستحکم ہو چکی ہوتیں چنانچہ جب مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تو میں نے جی بھر کے ان کے خلاف لکھا اگرچہ میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ان کی اقتدار سے رُخصتی کے بعد ادا کر دیا لیکن اپنی معصومیت پر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے دورِ حکومت میں ان کے دعووں پر کیوں اعتبار کر بیٹھا؟

اپنے اس نوع کے بھولپن کا جو دوسرا واقعہ مجھے یاد ہے اس کا تعلق صدر یحیٰی خان کے دور سے ہے۔ میں صدر صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ مگر مجھے پہلے ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا چنانچہ ان کی حمایت میں لکھنے سے پہلے ایک نجومی سے مشورہ کیا، اس بدبخت نے ستاروں کا حساب لگا کر بتایا کہ اس شخص کی قسمت کا ستارہ کبھی گردش میں نہیں

آ ئے گا۔ چنانچہ میں احمق شخص اس کی باتوں میں آ گیا اور پے در پے ان کی حمایت میں کالم لکھے، خصوصاً جب انہوں نے روسی صدر کو دھمکی دی کہ میں تم سے نمٹ لوں گا اور اس سے بھی زیادہ خصوصاً جب انہوں نے مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی تو میں نے اپنے کالموں میں ان کی تعریف کے طومار باندھ دیے اور ان کی حب الوطنی اور اسلام دوستی کے وہ قصیدے لکھے کہ حلقہ احباب میں مجھے ''رطب اللسان طومار پوری'' کہا جانے لگا اس بات کا علم تو مجھے ان کی اقتدار سے رُخصتی کے بعد ہوا کہ موصوف کی اس قسم کی حرکتیں پاکستان ٹوٹنے کا باعث بنیں۔ میں نے اپنی سادہ لوحی پر ماتھا پیٹ لیا کہ میں اتنی جلدی دوسروں کی باتوں میں کیوں آ جاتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے عورت نہیں بنایا!

کچھ اس قسم کا ہاتھ میرے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں بھی ہوا۔ میں انہیں ترقی پسند سمجھ کر ان کے مصاحبوں میں شامل ہوا۔ چنانچہ میں نے بیسیوں کالم اس موضوع پر لکھے کہ چی گویرا اور فیڈرل کاسٹرو ان کے بچے ہیں اور فون پر ان سے ہدایتیں لیتے ہیں مگر جب اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں انہوں نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا، شراب پر پابندی عائد کی، اتوار کی بجائے جمعہ کی تعطیل کا اعلان کیا، جوئے پر پابندی لگائی، بازار حسن کی رونقیں ختم کیں اور مولویوں سے پینگیں بڑھائیں تو مجھے بے حد افسوس ہوا تاہم میں نے انہیں وقت دیا کہ شاید وہ ان اقدامات پر نظر ثانی کر کے اپنی ترقی پسندی بحال کریں، لیکن اپنے اقتدار کے خاتمے تک جب وہ اسی روش پر قائم رہے تو پھر میں نے ان کے خوب لتے لیے لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اقتدار سے رُخصت ہو چکے تھے۔ مجھے اپنے وہ دوست بہت یاد آئے جو مجھے ''لائی لگ'' کہا کرتے تھے۔ میں واقعی ''لائی لگ'' ہوں اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں اپنے اس رویے سے کیسے چھٹکارا پاؤں؟

اپنی اس سادہ لوحی کی بنا پر مجھے صدر ضیاء الحق کا دور بھی سنہری دور محسوس ہوا اور میں نے اپنے کالموں میں تجویز پیش کی کہ تاریخ میں تو صدر ضیاء الحق کا نام سنہری لفظوں سے

لکھا ہی جائے گا ان کی زندگی میں بھی جہاں کہیں ان کا ذکر ہو، ان کا نام سنہری لفظوں میں لکھا جائے، اور سنہری رنگ کی روشنائی خریدنے کے لیے بجٹ میں ایک معقول رقم مختص کی جائے۔ میری اس تجویز کو بہت سراہا گیا اور مجھے سونے کا ایک قلم تحفے کے طور پر دیا گیا کہ کم ازکم آپ اپنے کالم سنہری قلم سے لکھیں۔ ان کے دورِ اقتدار کا خاتمہ ہوا تو پھر انکے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں مثلاً یہ کہ انہوں نے مُلّاازم کو فروغ دیا، نیز ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کو پاکستان میں متعارف کرایا، مختلف طبقات کو کرپٹ کیا اور اپنا اقتدار بچانے کے لیے ایسے اقدامات کیے جن کے نتائج قوم کو دیر تک بھگتنا پڑے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں میں نے ان رازوں پر سے پردہ اُٹھایا اور یوں اپنی حماقتوں کا کفارہ ادا کیا!

مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ بے نظیر بھٹو کو جو میں سمجھا تھا وہ اس کے برعکس نکلیں، میرا خیال تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت برطانیہ میں ہوئی ہے وہ ملک کو ترقی کی راہ پر لگائیں گی اور اپنے ذہین باپ ذوالفقار علی بھٹو کی غلطیوں سے سبق سیکھیں گی۔ چنانچہ میں نے ان کے دورِ حکومت میں ہمیشہ اِسی حسنِ ظن سے کام لیا بلکہ میں نے تو یہاں تک لکھا کہ پاکستان ان کی صلاحیتوں کی نسبت بہت چھوٹا ملک ہے چنانچہ انہیں مارگریٹ تھیچر کی جگہ برطانیہ کا وزیرِاعظم مقرر کیا جائے۔ مارگریٹ تھیچر نے میری اس بات کا اتنا برا منایا کہ ایک موقع پر جب میں برطانیہ کا ویزہ لینے کے لیے برطانوی سفارت خانے پہنچا تو ویزہ افسر نے مجھے دیکھا اور ناک سکوڑ کر کہا ''اب ویزہ لینے اس وقت آنا جب بے نظیر برطانیہ کی وزیرِاعظم بنے گی!'' مگر افسوس بے نظیر حکومت کے خاتمے پر مجھے پتا چلا کہ بے نظیر کی صلاحیتیں ان کے اپنے کام بھی نہ آئیں نیز یہ کہ اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے عوام کے لیے ایک دھیلے کا کام بھی نہیں کیا حالانکہ ایک دھیلے کا کام کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا!

بات قدرے لمبی ہوگئی، اس لیے اپنے بھولپن کی داستان کو مختصر کرتے ہوئے عرض

کرتا ہوں کہ میں نے میاں نواز شریف کے دور میں میاں صاحب کے دعووں پر یقین کر کے کالم پر کالم لکھے کہ انہوں نے ملک کی اقتصادیات کو انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا ہے لیکن جب وہ اقتدار سے رُخصت ہوئے اور امریکہ سے بلائے گئے موجودہ نگران وزیراعظم کے نگران اور غیر جانبدار وزیراعظم نے سینٹ میں زاہد سرفراز کے انداز میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ نواز شریف دور میں ملک کو اقتصادی طور پر دیوالیہ کر دیا گیا۔ تو میں نے ان کی بات پر بھی یقین کر لیا چنانچہ ان دنوں میں نواز شریف کے خلاف کالم لکھنے میں مشغول ہوں جناب معین قریشی کی تقریروں سے میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کو پہلی دفعہ ایسا وزیراعظم میسر آیا ہے جو حق گوئی و بے باکی میں اقبال کے خیالی مردمومن سے دو ہاتھ آگے ہے۔ میں تو ہمیشہ سے اس خیال کا حامی تھا کہ پاکستان پر حکومت براہِ راست امریکہ کی ہونی چاہیے، خدا نے میری سن لی۔ چنانچہ ان دنوں میرا ہر دوسرا کالم نگران وزیراعظم کی مدح میں ہوتا ہے چنانچہ حاسدوں نے مجھے ''نگران کالم نگار'' کہنا شروع کر دیا ہے، لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں مجھے تو افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں آج تک اپنی سادہ لوحی کی بناء پر غلط لوگوں کی تعریف کرتا رہا لیکن پردہ غیب سے وہ دیدہ ور آج ظہور میں آیا ہے جس کے لیے نرگس ہزاروں سال روتی رہی ہے۔ میری بیوی نرگس کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اس کی عمر بائیس برس سے زیادہ نہیں تاہم اس کے باوجود میں تادم تحریر اپنی بات پر قائم ہوں۔ میں آج تک خود کو بھولا بھالا کالم نگار سمجھتا رہا لیکن جناب معین قریشی کی صورت میں جو ہیرا میں نے پہچانا ہے، کون کہتا ہے کہ میں بھولا بھالا ہوں۔ مجھے کوئی بھولا کہہ کر تو دیکھے!

◇ ◇ ◇

چاروں طرف فقیر ہی فقیر!

صبح گھر سے نکلیں تو چاروں طرف فقیر ہی فقیر نظر آتے ہیں، کوئی اپنا ٹنڈ دکھا کر بھیک مانگتا ہے، کوئی کسی کم سن بچی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے، کالی عینک لگائے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کوئی گڑگڑاتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کوئی زمین پر گھسٹتا ہوا آتا ہے اور بھیک کا طالب ہوتا ہے۔ کئی عورتیں بڑی بوڑھیوں والا برقعہ پہنے اپنے جوان بازو آپ کے سامنے پھیلا دیتی ہیں۔ کئی بچے ایک میلا سا کپڑا آپ کی کار کی سکرین کے ساتھ لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بھیک مانگتے ہیں۔ کچھ نے ہاتھ میں ایکسرے پکڑا ہوتا ہے اور دوا کے لیے پیسے طلب کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی ''مسافر'' کی جیب کٹی ہوتی ہے اور وہ اپنے گاؤں تک کا کرایہ مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی آپ سے موٹر سائیکل یا کار پر لفٹ مانگتا ہے اور دوران سفر اپنی ''دردبھری داستان'' سنا کر خیرات کا طالب ہوتا ہے۔ کوئی بچہ اپنا خوانچہ سڑک پر اُلٹا دیتا ہے جس میں دس پندرہ روپے کے بسکٹ وغیرہ ہوتے ہیں اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونا شروع کر دیتا ہے اور یوں لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان سے مدد لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، کوئی گھر کی گھنٹی بجاتا ہے اور آپ باہر آتے ہیں تو وہ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ کوئی کاندھوں پر کدال رکھے آپ کے پاس آتا ہے کہ گاؤں سے مزدوری کے لیے آیا تھا لیکن مزدوری نہیں ملی۔ کوئی پورے کنبے کو ساتھ لیے پھرتا ہے کہ یہ صبح سے بھوکے ہیں ان کے لیے ایک وقت کی روٹی کے پیسے دے دیں۔

یہ بھیک مانگنے والے آپ کو صرف گلیوں اور بازاروں ہی میں نظر نہیں آتے یہ لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہیں اور اپنے اپنے انداز میں بھیک مانگتے ہیں۔ یہ فقیر آپ کو سرکاری دفتروں میں بھی مل جائیں گے۔ یہ آپ سے فائل کا پہیہ چلانے کے لیے نوٹ مانگتے ہیں۔ یہ فقیر دانشوروں میں بھی موجود ہیں اور حکومتوں سے نوکریوں کی بھیک مانگتے ہیں۔ اس طبقے کے افراد اخبارات کے دفاتر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اپنی بھیک ''لفافے'' کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ بھکاریوں کی کثیر تعداد مشائخ میں بھی موجود ہے۔ انہیں خفیہ فنڈ سے بھیک ملتی ہے۔ اس کے لیے انہیں صرف سڑک پر حکومت کی حمایت میں ایک بینر کو پکڑ کر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ علماء کی ایک تعداد دوست اور دشمن ممالک سے بھیک وصول کرتی ہے۔ محکمہ خارجہ اور اکنامک ڈویژن کے پالیسی ساز بھی امریکہ کے بھکاری ہیں، انہیں بہت سائنسی طریقے سے بھیک دی جاتی ہے اور یہ اتنے ہی سائنسی طریقے سے پاکستان کی خارجہ اور معاشی پالیسیاں پاکستان کی بجائے امریکہ کے مفاد میں تیار کرتے ہیں۔ وزیر، مشیر اور مقتدر طبقے کے ارکان بھی بھکاریوں میں شامل ہیں، یہ بڑے بڑے سودوں میں اپنی بھیک بطور کمیشن وصول کرتے ہیں۔ یہ تو وہ طبقہ ہے جو گنے کی ایک پور کے لیے کماد کا پورا کھیت اُجاڑ دیتا ہے۔

ان کے بچے امریکہ میں امریکہ کے خرچ پر پڑھتے ہیں ان کی بیویاں امریکہ میں امریکہ کے خرچ پر شاپنگ کرتی ہیں اور یہ خود امریکہ کے خرچ پر پاکستان خرچ کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ محب وطن بھی کہلاتے ہیں۔

بھیک مانگنے والوں میں کئی ایم پی ایز اور ایم این ایز بھی شامل ہیں۔ یہ وزارتوں ٹھیکوں اور قرضوں کی بھیک مانگتے ہیں۔ کوئی سیاسی بحران پیدا ہو تو حکومت یا اپوزیشن سے کروڑ کروڑ کے بدلے اپنا ضمیر فروخت کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ شاید اس لیے ایک صاحب زر نے کہا تھا کہ موجودہ اسمبلی کی قیمت دو ارب روپے سے زیادہ نہیں بہر حال ان اسمبلیوں میں سب نہیں کچھ فقیر ایسے ہیں جو حکومتیں بنانے اور گرانے کے لیے

دستِ طلب اور زبان طمع دراز کرتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی بدنام کرتے ہیں!

بھیک مانگنے والے صاحبانِ اقتدار اور صاحبانِ حزبِ اختلاف بھی ہیں۔ یہ الیکشن کے دنوں میں ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں جب اس بھیک کے نتیجے میں انہیں حکومت ملتی ہے تو یہ بارہ کروڑ عوام کو بھکاری بنا دیتے ہیں۔ انہیں گھی اور آٹے جیسی بنیادی ضرورتوں کے حصول کے لیے قطاروں میں کھڑا کر دیتے ہیں ان کے ہاتھوں میں نوکریوں کی درخواستیں تھما دیتے ہیں اور ان کی زبانوں میں ہکلاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ اتنی خوبصورت قوم کو بدصورت بنانے والے جب قیامت کے روز اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کا اقتدار ان کی پیشانیوں پر داغ دیا جائے گا۔

قوم کو بھکاری بنانے والے یہ لوگ قوم کو ''قومی'' ہی نہیں ''بین الاقوامی'' بھکاری بھی بناتے ہیں۔ یہ کشکول ہاتھ میں پکڑ کر ملکوں ملکوں پھرتے ہیں قوم کے نام پر بھیک مانگتے ہیں، اسے قوم پر خرچ بھی نہیں کرتے اور قوم کو آئی ایم ایف اور عالمی بنک کا غلام بنا دیتے ہیں۔ جب کوئی اللہ کا بندہ یہ کشکول توڑنے کا عزم کرتا ہے تو امریکہ کی بھیک پر پلنے والے ''مقتدر'' طبقے اپنے آقاؤں سے مل کر اس کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ بھکاری سیاست دانوں، بھکاری مولویوں، بھکاری صحافیوں اور بھکاری دانشوروں کا تعاون حاصل کرتے ہیں اور اسے اُٹھا کر اقتدار سے باہر پھینک دیتے ہیں تاکہ ملک کا نقشہ آقاؤں کے دیے ہوئے نقشے سے تبدیل کر دیا جائے۔

سو مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ جو ہمیں چاروں طرف فقیر ہی فقیر نظر آتے ہیں، یہ فقیر ہیں کہ میر جعفر اور میر صادق؟ اگر یہ میر جعفر اور میر صادق ہیں تو پھر یہ ہم لوگوں میں حب الوطنی کی سندیں کس حیثیت سے بانٹتے ہیں اور ہم ان سے یہ سندیں کس حساب میں وصول کرتے ہیں؟

✧ ✧ ✧

ابنارمل!

جب میں نے اپنی گاڑی مزنگ چونگی سے جیل روڈ پر ڈالی تو اچانک مجھے ایک خوفناک ہارن سنائی دیا اور پھر یوں لگا جیسے کسی نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں قدرے گھبرا گیا، میں سمجھا شاید مجھ سے بلنڈر ہو گیا ہے جس پر احتجاج کیا جا رہا ہے، میں نے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا لیکن سوائے ایک گاڑی کے جو مجھ سے کافی فاصلے پر تھی، مجھے کوئی ٹریفک نظر نہیں آئی، اس کے باوجود میں نے سوچا اس گاڑی کو گزرنے دینا چاہیے چنانچہ میں نے گاڑی آہستہ کر دی اور بائیں لین میں آ گیا، میرے پیچھے آنے والی گاڑی نے مجھے اوورٹیک کیا اس میں ایک صاحب قسم کا دینی بابا اور ایک میم قسم کی دیسی مائی بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے راستہ دینے کے باوجود بابا مسلسل ہارن بجائے جا رہا تھا میں نے قیاس کیا کہ بابا اپنی مائی کو خوش کرنے کے لیے ہارن بجا رہا ہے، لیکن مائی کے کھنچے ہوئے چہرے سے لگا کہ اسے ہارن کے بجنے پر کوئی خوشی نہیں ہو رہی۔ دریں اثناء بابے نے تھوڑی دیر کے لیے ہارن سے ہاتھ اُٹھا لیا، اس سے مجھے تسلی ہوئی کہ ہارن میں کوئی خرابی نہیں، اگر کوئی خرابی ہے تو وہ بابے میں ہے۔

اس وقت سڑک پر بہت معمولی ٹریفک تھا۔ میرے پیچھے تو پھر بھی دو ایک گاڑیاں تھیں جبکہ بابے کے سامنے سڑک خالی پڑی تھی، بابے نے ایک دفعہ پھر ہارن پر ہاتھ رکھ دیا، وہ غالباً سڑک کو سامنے سے ہٹنے کے لیے کہہ رہا تھا، خدا کا شکر ہے کہ سڑک نے اس کا کہا نہیں مانا، کیونکہ سڑک اگر تعمیل ارشاد پر اُتر آتی تو بابا بابی تو اپنے وقت پر اس کی

آغوش میں جا گرتے جبکہ میرے بارے میں شائع ہونے والے تعزیتی بیان ''بے وقت موت'' کے الفاظ سے شروع ہوتے!

سڑک نے جب بابے کی بات ماننے سے انکار کردیا تو بابے نے ہارن پر سے ہاتھ اُٹھالیا۔ مجھے اس عجیب وغریب مخلوق سے کچھ دلچسپی سی پیدا ہوگئی تھی اور اب میں اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے گاڑی قدرے تیز کی اور پھر اس کے برابر میں لا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ میں گاڑی کے چونکہ بائیں جانب تھا، اس لیے بابے کی بجائے مائی صاحبہ میری نظروں کی زد پر تھیں۔ مائی کا چہرہ اسی طرح کھنچا ہوا تھا، بابے نے ہارن بجا کر اسے غالباً ایک دفعہ پھر خوش کرنا چاہا لیکن مائی نے ان طفل تسلیوں سے خوش ہونے سے انکار کردیا کیونکہ اب اس نے سامنے کی بجائے سوچتے ہوئے منہ کو میری طرف پھیرلیا۔ مجھے دیکھ کر مائی کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اُبھری، یہ مسکراہٹ اتنی خوفناک اور خطرناک تھی کہ میں نے ڈر کر گاڑی تیز کردی اور بابے کے سامنے آ گیا۔

اب بابے کی گاڑی میرے پیچھے تھی اور میں نے رفتار جان بوجھ کر کافی کم کردی تھی، میں چاہتا تھا کہ بابے کو ایک دفعہ جائز طور پر ہارن بجانے کا موقع ملے اور میں اس کے جواب میں اس کے لیے راستہ چھوڑ دوں مگر لگتا تھا بابے کو سکون سا آ گیا ہے، میں نے گاڑی کی رفتار اور کم کردی، بابا بھی اسی نسبت سے آہستہ ہوگیا، نہ وہ لین بدل رہا تھا اور نہ ہارن بجا رہا تھا، میں نے تنگ آ کر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا!

جب بابے نے سڑک خالی دیکھی تو اس نے ایک بار پھر ہارن بجانا شروع کردیا۔ میں نے یہ سوچا یہ کیسا عجیب شخص ہے، دیکھنے میں بالکل نارمل خاصا معتبر سا لگتا ہے لیکن اس کی دماغ کی ساری چولیں مکمل طور پر ڈھیلی ہیں، میں نے سوچا مجھے اس سے بات کرنا چاہیے، چنانچہ گاڑی سرخ سگنل پر رُکی اور میں اس کی طرف جانے کے لیے ابھی دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی بالکل میرے برابر آن کھڑی ہوئی، اس نے میرے اور

اپنے درمیان اتنی جگہ بھی نہ چھوڑی تھی کہ میں دروازہ کھول سکتا۔ سرخ سگنل کے باوجود بابا ہارن بجائے جا رہا تھا، اس دوران آگے پیچھے اور ارد گرد کافی گاڑیاں جمع ہو گئی تھیں اور ان میں بیٹھے ہوئے لوگ اس بے وقوف بابے کو غصے سے گھور رہے تھے جو بلاوجہ فضا کے شور میں اضافہ کر رہا تھا۔ سگنل سرخ سے پیلا اور پیلے سے سبز ہوا تو گاڑیاں ایک زناٹے سے آگے بڑھ گئیں۔

اس وقت بابے کے آگے پیچھے گاڑیاں تھیں اور اسے راستہ لینے کے لیے جائز طور پر ہارن بجانے کی ضرورت تھی لیکن اب وہ ہارن نہیں بجا رہا تھا بلکہ پورے سکون سے گاڑی چلانے میں مشغول تھا۔ میرے لیے اس مضحکہ خیز صورت حال کو برداشت کرنا اب ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں بابے کو روک کر اس سے بات ضرور کروں گا چنانچہ میں گاڑی بابے کے برابر میں لے گیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کو کہا، میں چونکہ اس کے بائیں جانب تھا اس لیے ایک دفعہ پھر مائی صاحبہ سے میری آنکھیں چار ہو رہی تھیں، موصوف نے مجھے اشارہ کرتے دیکھا تو انہوں نے شرما کر بابے کو کہنی ماری، بابے نے غصے سے میری طرف دیکھا، میں نے اشارے سے اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد سڑک کے ایک طرف ہم دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں!

"کیا بات ہے، آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟" مجھے بابے کی ہارن جیسی آواز سنائی دی۔

"میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہارن کیوں بجائے جا رہے ہیں اور یہ بھی کہ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں آپ ہارن نہیں بجاتے؟"

اس پر بابے کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے کہا "برخوردار! میں تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں، تم نے مجھے روک کر میرا قیمتی وقت ضائع کیا!" اور اس کے ساتھ ہی وہ پاؤں

پہنچتا ہوا اسٹیرنگ پر جا بیٹھا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا، مگر پھر نجانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے گاڑی ریورس کی اور میرے برابر میں لاکر کہا "یہ تمہیں صرف میرے بلاوجہ ہارن بجانے پر کیوں اعتراض ہے، ساری قوم اس مشغلے کو اپنائے ہوئے ہے، روک سکتے ہو تو ان سب کو روکو۔"

اور میں نے سوچا بابا صحیح کہتا ہے، ہم لوگ "ہارن" بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی اور جہاں شور مچانا ضروری ہوتا ہے، وہاں ہم لوگ چپ سادھ لیتے ہیں، ہماری قوم کی اصل بدقسمتی یہی ہے کہ ہم نے ایشوز کو نان ایشوز اور نان ایشوز کو ایشو میں تبدیل کر لیا ہے!

✧ ✧ ✧

تم میری آواز سن رہے ہو خان محمد؟

''صاب! انگریز کا زمانہ بہت یاد آتا ہے، میں نے بیس سال فلپ صاحب کی نوکری کی ہے، میں ان کے پاس خانساماں تھا، صاب کیا بات ہے انگریز ہم لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے۔''

''خان محمد، تم ہر وقت انگریز کے قصیدے پڑھتے رہتے ہو، آخر کیا بات تھی انگریز میں؟''

''صاحب، پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ انگریزی بولتے تھے، حکم چلاتے تھے تو ہمیں برا نہیں لگتا تھا، گالی دیتے تھے تو اچھی لگتی تھی کہ وہ بھی انگریزی میں ہوتی تھی دوسری بات یہ ہے صاب کہ وہ سستا زمانہ تھا۔ لوگوں کو انصاف ملتا تھا۔ وہ لوگ ایماندار بھی تھے، کوئی ایک خوبی تھی ان میں؟''

''میں سن رہا ہوں، تم ان کی ساری خوبیاں آج گنوا دو''

''صاب، باقی خوبیوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن وہ ہم خانساموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔''

''خانساموں کا ہی نہیں، خان بہادروں کا بھی!''

''جی صاب ان کا بھی۔ جو خود کھاتے تھے ہمیں کھلاتے تھے، ہفتے میں ایک چھٹی دیتے تھے۔ ان کی میم صاب ہم سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی۔ مجھے کہتی تھی کھان موھمڈ تم بہت کھراب آدمی ہے!''

''اسے چھوڑو، وہ بچاری تو اب مرکھپ گئی ہوگی، مرے ہوؤں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کیا کرتے''

''صاب آپ بہت مخولیا ہیں، میں تو آپ کو بتارہا تھا......''

''تم جو بھی بتارہے تھے، وہ مجھے سمجھ آ گیا ہے لیکن آج میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو صاب!''

''جس انگریز کے تم قصیدے پڑھتے ہو کیا تمہیں علم نہیں کہ وہ سات سمندر پار سے مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے آیا تھا؟''

''جی صاحب، علم ہے''

''کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اس نے برصغیر کے کروڑوں لوگوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے غلام بنالیا، مقامی حکمرانوں کی کمزوریوں کو اُچھال کر خود حکمران بن گیا؟''

''جی صاب جانتا ہوں''

''کیا تمہیں علم نہیں یہ مردود انگریز ہندوستان کی ساری دولت سمیٹ کر برطانیہ لے گیا؟''

''جی صاب، علم ہے!''

''کیا تم جانتے نہیں کہ اس انگریز نے ہمارے اپنوں کے ساتھ سازش کر کے ٹیپو سلطان کو شہید کرایا، علمائے حق اور آزادی کے دوسرے پروانوں کو درختوں کی شاخوں سے باندھ کر پھانسیاں دیں؟''

''جی صاب جانتا ہوں مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تو تھیں''

''وہ خوبیاں نہیں تھیں کروڑوں لوگوں کو ایک سپر پاور کا غلام بنانے کے لیے یہ اس کی حکمت عملی تھی''

''صاحب، آپ برا نہ مانیں، آپ تو معین قریشی صاحب کے بارے میں بھی انی

طرح کی باتیں کرتے تھے لیکن آپ دیکھ لیں وہ الیکشن کرا کے کیسے چپ چاپ واپس چلے گئے ہیں"

"کہاں گئے ہیں؟"

"امریکہ"

"کہاں سے آئے تھے؟"

"امریکہ سے!"

"ان کے آنے سے چند ماہ پہلے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کس کی حکومت تھی؟"

"نواز شریف کی"

"ان کے جانے کے بعد کس کی حکومت ہے؟"

"بے نظیر کی۔ مگر صاب آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا، تم یہ بتاؤ معین قریشی صاحب تمہیں اتنے کیوں پسند ہیں؟"

"صاب ایک تو وہ انگریزی بولتے تھے اور دوسرے وہ کہتے تھے کہ انہیں اُردو نہیں آتی۔"

"کوئی اور خوبی بتاؤ"

"جن بڑے بڑے لوگوں نے بنکوں سے قرض لے کر واپس نہیں کیے تھے۔ قریشی صاحب نے ان کے نام اخباروں میں چھاپ دیے"

"ان میں سے کتنے قرضے انہوں نے واپس لیے؟"

"پتہ نہیں صاب، انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ انہیں پاکستان کا خزانہ خالی ملا"

"جاتی دفعہ وہ کس کا خزانہ بھر گئے، پاکستان کا یا ورلڈ بنک کا؟ ان کے جانے کے بعد تین خبریں اخبار میں شائع ہوئی ہیں، ایک یہ کہ وہ تین ارب نوٹ چھاپ کر پاکستان

کا خزانہ "بھر" گئے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے جانے کے بعد پاکستان کے پاس صرف دو ہفتے کے لیے زرِ مبادلہ کے ذخائر موجود ہیں اور تیسرے ورلڈ بینک کے صدر مسٹر ڈلیم کا بیان آج اخبار میں چھپا ہے کہ معین قریشی ہمارے آدمی ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ نیز انہوں نے اس اُمید کا اظہار کیا ہے کہ موجودہ حکومت ان کی پالیسیوں کو آگے بڑھائے گی۔"

"صاب! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، ہم غریب لوگ ہیں ہمیں تو اپنی روٹی سے غرض ہوتی ہے، ہمیں اس سے کیا کہ کون آتا ہے کون جاتا ہے لیکن صاحب اللہ کو جان دینی ہے قریشی صاحب بندے بہت اچھے تھے، انہیں دیکھ کر تو مجھے اپنے فلپ صاحب یاد آجاتے تھے۔"

"برا نہ ماننا خان محمد، انگریزی دور کے خانساموں اور خان بہادروں کو اس سے کبھی غرض نہیں رہی کہ ان کا صاب کون ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے ملک کی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ کرنے کے لیے انگریز سات سمندر پار سے ہندوستان میں آیا اور یہ پھولوں کی ڈالیاں لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے" وہ انگریز کو پھولوں کی ڈالیاں پیش کرتے تھے اور انگریز باورچی خانہ خانساموں اور ملک خان بہادروں کے حوالے کر کے صرف اپنے مفادات کی نگرانی کرتا تھا، مجھے کسی سے گلہ نہیں رونا صرف بے حسی کے اس تسلسل پر آتا ہے جو مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کیا تم میری باتیں سن رہے ہو خان محمد؟ شاید میری آواز تم تک نہیں پہنچ رہی، شاید میری آواز کسی تک بھی نہیں پہنچ رہی، شاید میں صحرا میں اذان دے رہا ہوں!"

◇ ◇ ◇

صبح کی سیر!

بچپن میں صبح کی سیر کے موضوع پر کیسے کیسے مضمون لکھا کرتے تھے، ہمیں کیا پتہ تھا یہ اتنی بھیانک چیز ہے، اس کے لیے علی الصبح کارپوریشن کے عملے کے ساتھ بیدار ہونا پڑتا ہے، ٹونٹیوں میں اتنی جلدی پانی نہیں آتا جتنی جلدی سیر کے لیے کسی قریبی گراؤنڈ میں پہنچنا پڑتا ہے جو دس میل کے فاصلے پر بھی ہو سکتی ہے۔ معاملہ یہیں تک محدود ہو تو بھی خیر ہے، صبح صبح ایک دو نہیں، بیسیوں توندیں بیک وقت دیکھنا پڑتی ہیں جنہیں ڈاکٹروں نے سیر پر لگا رکھا ہے اور خود ڈاکٹر ان سے مشورہ فیس بٹورنے پر لگے ہوئے ہیں، صبح سیر کو نکلیں تو لگتا ہے ہسپتال کا راؤنڈ لگا رہے ہیں، نہار منہ شوگر کے مریض، بلڈ پریشر کے مریض اور بڑی بڑی ''گوگڑوں'' والے تاجروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، گنجے ان کے علاوہ ہیں جن کا خیال ہے کہ سیر سے سر پر بال اُگ سکتے ہیں! ان سب کے خیال میں وہ ''سیر سوز'' کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ ان میں سے کچھ کے بارے میں ''سیر سوز'' والی ترکیب کو اُلٹا کر دیا جائے تو مطالب زیادہ بہتر طور پر واضح ہوتے ہیں!''

میرا سیر کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں ہے، بس یوں سمجھیں کہ رنگروٹ بھرتی ہوا ہوں چنانچہ جب کوئی صاحب اچانک نظر پڑتے ہیں اور اس عالم میں کہ ان کی ٹانگیں اُوپر اور سر نیچے ہے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں تو میں دبک سا جاتا ہوں، اخباروں کی وہ سرخیاں یاد آ جاتی ہیں جو ٹارچر سیلوں کے بارے میں شائع ہوتی رہی ہیں یا کسی معزز سے آدمی کو فوں فوں کرتے ہوئے یا یوں کہہ لیں کہ پھنکارتے ہوئے دوڑتے دیکھتا ہوں تو

اللہ کی قدرت یاد آ جاتی ہے کہ وہ جسے چاہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے، گزشتہ روز میں نے ایک بزرگ کو رسی ٹاپتے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیا کی سرخی بھی تھی، میں نے ''غص بصر'' سے کام لیا اور ان کے قریب سے نظریں چرا کر اس طرح گزر گیا جیسے نامحرموں کو گزرنا چاہیے۔

ویسے صبح کی سیر میں خواتین کسی سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ سیر کرتی نظر آتی ہیں تاہم علی الصبح چونکہ بیوٹی پارلر کھلے نہیں ہوتے لہٰذا وہ بغیر کسی اہتمام کے آتی ہیں۔ ایک خاتون نے مجھ سے گلہ کیا کہ وہ روزانہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے سلام کرتی ہیں مگر بے رُخی سے وعلیکم السلام کہہ دیتا ہوں، حالانکہ گزشتہ دس برسوں سے ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا ہے، میں نے انہیں غور سے دیکھا تو پہچان لیا اور معذرت کی۔ کچھ بیوٹی پارلر چوبیس گھنٹے بھی کھلے رہنے چاہئیں جس طرح شہر میں بعض پنکچر کی دکانیں کھلی رہتی ہیں!

میں نے گزشتہ چند دنوں میں نوٹ کیا ہے کہ بزرگوں کی سیر کرنے کا اپنا انداز ہے وہ سیر میں بھی عاقبت کو یاد رکھتے ہیں چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں ان میں سے ایک کھڑا ہو کر نعت پڑھنے لگتا ہے اور دوسرے جھومنے لگتے ہیں، بعض ''ثقافتی'' قسم کے بزرگ ہیر گانے لگتے ہیں، میں نے بعض ''کن ٹٹے'' بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی اور دوسرے کی عمر کا خیال کیے بغیر ایک دوسرے کو ''لانگڑیاں'' بھی دیتے ہیں اور پھر اگلے دو چار روز گراؤنڈ میں نظر نہیں آتے، غالباً ''گراؤنڈ'' ہو جاتے ہیں!

سرکاری افسروں کی سیر کے انداز سب سے جدا ہیں، یہ سیر کے دوران سمریوں کا تبادلہ کرتے ہیں، اپنی نوٹ لکھنے کی مہارت کا ذکر کرتے ہیں لیکن اصل قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس طرح بعض افسران نماز جمعہ کے لیے اتفاق مسجد جاتے ہیں اسی طرح نماز کے علاوہ ان کی سیر بھی بڑے صاحب کے دیدار کے لیے ہوتی ہے، یہ اپنے صاحب کے

''سیر گروپ'' میں شامل ہو جاتے ہیں۔ صاحب کی سیر ہو جاتی ہے اور ان کی مصاجبی! دونوں کو الگ الگ ثواب ملتا ہے!

تاہم میرے نزدیک سیر کا اصل فائدہ غیبت کے لیے بہتر مواقع اور وافر ٹائم ملنا ہے۔ ایک گھنٹے کی سیر میں غیبتیں کرتے کرتے سانس پھول جاتا ہے، غیبتیں ختم ہو جاتی ہیں، ٹائم ختم نہیں ہوتا۔ میری سیر کو آج چھٹا دن ہے، اس دوران میں خود کو صوفی سا محسوس کرنے لگا ہوں چنانچہ دو روز سے سیر کے دوران میں نے کسی کی غیبت نہیں کی۔ وجہ صاف ظاہر ہے غیبتیں ختم ہو گئی ہیں۔ خواتین اگر اپنے دل کا غبار نکالنا چاہیں تو وہ بھی سیر کے نسخے کو استعمال کر سکتی ہیں کہ یہ نسخہ ''اوپن فار آل'' ہے!

✧ ✧ ✧

یہ بچاری چوّنیاں اٹھنّیاں!

ان دنوں بچاری چونی اٹھنیوں کی بڑی مٹی پلید ہو رہی ہے دکاندار سے کوئی چیز خریدیں اور کوئی چونی اٹھنی کم ہو تو وہ بہت آرام سے چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح گاہک کو اپنی چونی اٹھنی کی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ جو چونیاں اٹھنیاں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جیب میں آ جاتی ہیں، انہیں سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور ان کا کچھ مصرف بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہاتھ سے اگر کوئی سکہ گر جاتا اور لڑھکتا لڑھکتا کسی نالی میں جا گرتا تو یار لوگ آستین چڑھا کر نالی میں ہاتھ ڈال دیتے تھے یا اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے کسی سائیکل سے جا ٹکراتے تھے، باراتوں میں تو چھوٹے پیسے تک لٹائے جاتے تھے اور انہیں لوٹنے کے لیے بھی سینکڑوں ننھے منے لٹیرے جمع ہو جاتے تھے لیکن اب پیسے، پانچ پیسے اور دس پیسے والا سکہ یا تو سرے سے تیار ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو سستے انصاف کی طرح کہیں نظر نہیں آتا بلکہ یہ تبدیلی یا بے وقعتی گزشتہ ایک آدھ سال پر محیط ہے۔ مجھے یاد ہے اچھے خاصے "سرمایہ دار" بھی اپنی کار کی ایش ٹرے میں وہ سکے ڈال لیا کرتے تھے جو انہیں خرید و فروخت کے دوران اِدھر اُدھر مل جاتے تھے چنانچہ کہیں گاڑی روک کر وہ ان سے کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید لیتے تھے یا ارد گرد منڈلانے والے فقیروں میں بانٹ دیتے تھے، اب ان چونی اٹھنیوں کا یہ مصرف بھی نہیں رہا۔ کسی فقیر کو دیں تو وہ آگے سے جگتیں کرتا ہے اور دکاندار کو دیں تو وہ گاہک کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے، چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ دکاندار اور گاہک دونوں

حساب کتاب اس طرح کرتے ہیں کہ درمیان میں یہ چونیاں اٹھنیاں نہ آنے پائیں اور اگر آ ہی جائیں تو تعلقات میں بگاڑ کا باعث بہر حال نہ بنیں، جن کے پاس نہ نہ کرتے ہوئے بھی یہ چونیاں اٹھنیاں آ جاتی ہیں وہ پریشان رہتے ہیں کہ اب ان کا کیا کریں، اگر دس بارہ ہوں تو بندہ کہیں چلا دیتا ہے، اگرچہ وہاں یہ جملہ سننا پڑتا ہے کہ باؤ جی داتا درباروں آئے او! تاہم اگر ایک دو ہوں تو ان کے ہاتھ سے گرنے کی تمنا کرتا ہے اور یہ بھی کہ یہ لڑھکتی لڑھکتی ہوئی کسی نالی میں جا گریں کہ اب نالی میں ہاتھ ان چونی اٹھنیوں کے لیے نہیں، پوری ٹیکسال کے لیے ڈالا جاتا ہے!

اور جو ہمیں اپنے چاروں طرف بے وقعت سے چہرے نظر آتے ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں، گھروں، فیکٹریوں، ورکشاپوں اور دکانوں میں اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کام کرنے والے معصوم بچے، ایم اے، ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں جیب میں ڈالے غریب اور بے نوا خاندانوں کے بے روزگار نوجوان، ہسپتالوں کے جنرل وارڈوں میں پڑے ہوئے دوائیوں اور ڈاکٹر کی توجہ سے محروم نادار مریض، عدالتوں کے دھکے کھانے والے بے گناہ اور بے نوا لوگ، جہیز کے انتظار میں بیٹھی جوان بیٹیاں، یہ سب چونیاں اٹھنیاں ہی تو ہیں جنہیں کوئی قبولنے کے لیے تیار نہیں ہے، ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے ہم نے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ، انجمن سپاہ صحابہ، جئے سندھ تحریک، مہاجر قومی موومنٹ اور اس طرح کی بہت سی جماعتیں بنائی ہیں جو ان کے دکھوں کا علاج بہت سائنسی طریقے سے کرتی ہیں یعنی ان چونی اٹھنیوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تم غربت و افلاس ظلم و استحصال کی بات کرتے ہو جبکہ تمہارا ایمان خطرے میں ہے، تمہاری ثقافت خطرے میں ہے چنانچہ یہ چونیاں اٹھنیاں اپنے ایمان کی حفاظت اور اپنی ثقافت کی حفاظت کے لیے میدان میں آ جاتی ہیں اور پہلے سے زیادہ بے وقعت ہو جاتی ہیں لیکن انہیں چلانے والے پہلے سے کہیں زیادہ معتبر نظر آنے لگتے ہیں۔

البتہ یہ چونیاں اور اٹھنیاں انتخابات میں سیاستدانوں کے بہت کام آتی ہیں بلکہ

ان کی وقعت انہی چند دنوں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ جس سیاستدان کی جیب میں ریزگاری زیادہ ہو اسے ملک کا حاکم بنا دیا جاتا ہے اور ریزگاری یہ سمجھتی ہے کہ یہ حاکم اب ان کی عزت بحال کرے گا لیکن حاکم بننے کے بعد اسے اپنے بینک بیلنس کی عزت بحال کرنے کی فکر پڑ جاتی ہے جو الیکشن کے دنوں میں اخراجات کی وجہ سے قدرے کم ہو گیا ہوتا ہے چنانچہ وہ جتنا عرصہ اقتدار میں رہتا ہے اپنے ملکی اور غیر ملکی اکاؤنٹ کا پیٹ بھرنے میں لگا رہتا ہے اور ظاہر ہے وہاں ان چونیوں اٹھنیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ سو اب صورتِ حال یہ ہے کہ چھوٹے سکوں کی قدر و قیمت دن بدن پہلے سے بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی ناقدری دیکھ کر ہم ایسوں کا دل روتا ہے جن کی ساری عمر چونیوں اٹھنیوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے اور زندگی کے آخری سانس تک انشاء اللہ انہی کے ساتھ بسر ہونی ہے۔ ہم سے ان کی بے وقعتی نہیں دیکھی جاتی، خدا کے لیے اپنی ٹکسال میں کوئی ایسا نظام ڈھالیں جس کی کرنسی اتنی بے وقعت نہ ہو کہ لوگ اس کے ہاتھ سے گرنے کی تمنا کرنے لگیں۔

غیر قانونی قصاب

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے ہم گزشتہ ایک ماہ راولپنڈی میں مقیم رہے ہیں اور واپسی پر اپنے قارئین کے لیے ایک تحفہ لائے ہیں۔ یہ تحفہ ایک اشتہار کی صورت میں ہے جو وہاں کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اشتہار کا عنوان ہے ''غیر قانونی طور پر جانوروں کو ذبح کرنے والے قصابوں کو انتباہ'' یہ اشتہار ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز سی ڈی اے اسلام آباد، ڈاکٹر مسز ایم حسین کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اشتہار کا متن یہ ہے ''یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اسلام آباد میں بعض دکاندار کسی مذبح کی تسلیم شدہ مہر کے بغیر گوشت کا کاروبار کر رہے ہیں۔ یہ اقدام اسلام آباد کیپٹل کے علاقے کے میونسپل بائی لاز ۱۹۶۹ء کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ایسے تمام دکانداروں کو جو غیر قانونی طور پر اسلام آباد کی میونسپل حدود میں جانوروں کو ذبح کرتے یا گوشت فروخت کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس نوٹس کے ذریعے متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ غیر قانونی کاروبار بند کر دیں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی اور دکانوں میں پڑا ہوا گوشت ضبط کر لیا جائے گا اور اس کی تمام ذمہ داری دکانداروں پر عائد ہوگی۔ اسلام آباد کے باشندوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس ضمن میں ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز واقع مرکز ۷-ایف فون نمبر ۸۱۱۷۳۳ اور ۸۲۷۰۲۵ پر مطلع کریں اور غیر قانونی طور پر میونسپل میں ذبح کرنے یا مہر کے بغیر گوشت فروخت کرنے والے افراد کے متعلق مطلع فرمائیں۔

ہم نے اس اشتہار کو ''تحفہ'' اس لیے قرار دیا ہے کہ ہم ہوش سنبھالنے سے اب تک اسلام آباد کے غیر قانونی قصابوں کو پورے اطمینان سے اپنا کاروبار چلاتے دیکھ رہے ہیں اور ہماری بڑی شدید خواہش تھی کہ کوئی بندۂ خدا ان غیر قانونی قصابوں کو نوٹس جاری کرے کیونکہ ہمارے اندر یہ حوصلہ نہیں تھا کہ چھریوں کلہاڑیوں سے مسلح ان قصابوں کے خلاف آواز اُٹھا سکیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کی توفیق ایک خاتون یعنی ڈاکٹر مسز ایم حسین کو ہوئی اور انہوں نے ڈائریکٹر ہیلتھ کے طور پر حفظانِ صحت کے منافی سرگرمیوں کا نوٹس لیتے ہوئے ان قصابوں کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی سرگرمیوں سے باز آ جائیں ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی اور دکانوں میں پڑا ہوا گوشت ضبط کر لیا جائے گا اور مزید یہ کہ اس کی تمام تر ذمہ داری بھی ان غیر قانونی قصابوں ہی پر عائد ہو گی۔ ہم اگرچہ اسلام آباد میں نہیں لاہور میں رہتے ہیں مگر جب دارالحکومت میں عین حکومت کی ناک کے نیچے غیر قانونی سرگرمیاں بلا کسی روک ٹوک کے جاری رہیں تو ظاہر ہے لاہور سمیت دوسرے شہر میں تو اس سے کہیں زیادہ دھاندلیاں ہوں گی، چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ اسلام آباد کے غیر قانونی قصابوں کو للکارنے کے نتیجے میں پورے ملک کے غیر قانونی قصاب محتاط ہو جائیں گے۔ اس نوٹس پر خوش ہونے کی بس یہی ایک وجہ ہے۔

تاہم اس صورت حال کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ہم جب کسی بازار سے گوشت خریدنے جاتے رہے ہیں، قانونی قصابوں اور غیر قانونی قصابوں میں ہمیں کبھی نمایاں فرق نظر نہیں آیا، شاید اس لیے کہ قصاب، قصاب ہی ہوتا ہے اور یوں جھانسہ دونوں ہی دیتے ہیں، چنانچہ آج سے دس برس پہلے اسلام آباد میں گوشت خریدنے کا اتفاق ہوا تو ہم نے دیکھا کہ کنڈے سے لٹکے ہوئے بکروں پر محکمہ صحت کی مہر لگی ہوئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ قانونی قصاب ہے، مگر ہمیں تو اس نے بھی دھوکہ دیا یعنی نہایت ناقص سودا فروخت کیا۔ تاہم اس کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ غیر قانونی

قصابوں سے قانونی قصاب بہر حال غنیمت ہیں، کیونکہ انہوں نے مروجہ قانون کی کچھ نہ کچھ پاسداری تو بہر حال کی ہوتی ہے۔

یہاں تک تو ایک کالم میں ہم نے قصاب کو قصاب کے معنوں ہی میں لیا، لیکن اگر ہم اس لفظ کو علامتی مفہوم پہنائیں تو بھی جس اشتہار کو ہم نے موضوع بحث بنایا، وہ نہایت خوش آئند ہے، کیونکہ ہر شعبۂ زندگی میں غیر قانونی قصابوں نے مذبح کھولے ہوئے ہیں۔ جہاں وہ ہر چیز کو کند چھری سے ذبح کرنے میں مشغول ہیں، چنانچہ اگر ''اسلام آباد'' ان غیر قانونی قصابوں کو تنبیہ کرنے میں واقعی سنجیدہ ہے۔ تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں سب سے بڑا غیر قانونی قصاب تو ہمارا نظام تعلیم ہے جو ایسے انجینئر، سیاست دان، صاحبان اقتدار، صحافی، دانشور اور تاجر پیدا کرتا ہے، جن کے ہاتھوں میں برکت نہیں ہے، اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

یوں قتل سے لڑکوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

چنانچہ فرعون اگر ''قانونی مذبح'' یعنی کالج کھول لیتا تو کوئی موسیٰ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اور یوں ہزاروں بچوں کو قتل کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ہماری اس بات کی صداقت کا واضح ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ اڑتیس برس سے صاحبانِ اقتدار اکبر الٰہ آبادی کے اس نسخے پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں، جس کے نتیجے میں ان برسوں کے دوران ایک موسیٰ بھی پیدا نہیں ہوا، جو ان کے بنائے ہوئے ڈھانچوں کو چیلنج کر سکے۔

اب جبکہ یہ کالم قریب الاختتام ہے، ہم خیر خواہی کے طور پر اپنے اسلام آباد کے قارئین کو ایک مشورہ دینا چاہتے ہیں اور وہ مشورہ یہ ہے کہ متذکرہ اشتہار پڑھ کر وہ کہیں ''چوڑ'' نہ ہو جائیں اور اس میں درج ٹیلی فون نمبروں پر اپنے اپنے علاقوں کے غیر قانونی قصابوں کے بارے میں مطلع کرنا نہ شروع کر دیں کیونکہ اس امر کا قوی امکان

موجود ہے کہ جہاں دوسری شکایات پر کوئی کان نہیں دھرتا، اسی طرح غیر قانونی قصابوں کے بارے میں شکایات پر بھی کوئی کان نہ دھرے بلکہ اُلٹا بیٹھے بٹھائے قصابوں سے خواہ مخواہ کی دشمنی شروع ہو جائے۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ چنانچہ قارئین اس اشتہار کے مندرجات کو سنجیدہ لینے کے بجائے بس یہی سمجھیں کہ قدرت نے یہ اشتہار صرف ہمارے کالم کی خوراک بننے کے لیے ''پیدا'' کیا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح ہم زندگی کے تمام شعبوں میں موجود غیر قانونی قصابوں کی خوراک بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

آج اور کل

یہ پھل اور سبزیاں جنہیں ہم آج پورے تیقن اور اعتماد کے ساتھ نوشِ جاں کرتے ہیں کہ ان کے ذائقوں اور ان کے طریقہ استعمال سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ ایک وقت ہو گا جب انسان پر ان کی ماہیت پوری طرح واضح نہیں ہو گی اور وہ ان کے بارے میں خاصی مختلف قسم کی ''رائے'' رکھتا ہو گا۔ ہمارا خیال ہے کہ آج جو چیزیں جس انداز سے ہم استعمال کرتے ہیں، پرانا انسان انہیں کسی اور طرح استعمال میں لاتا ہو گا اور پھر مختلف النوع تجربوں کے بعد ان پھلوں اور سبزیوں کی موجودہ ''حیثیت'' وجود میں آئی ہو گی۔

یہ خیال یونہی بیٹھے بیٹھے ہمارے ذہن میں در آیا ہے، چنانچہ ہم خاصی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً ہم سوچتے ہیں کہ پرانے انسان نے جب پہلے پہل حلوہ کدو دیکھا ہو گا تو خاصا حیران ہوا ہو گا۔ تاہم ہمیں یقین واثق ہے کہ آغاز میں اس نے حلوہ کدو کو بطور سبزی استعمال نہیں کیا ہو گا بلکہ کنبے کے دو افراد اسے اُٹھا کر گھر لے گئے ہوں گے اور پھر بڑی نفاست سے اس کی قاشیں بنا بنا کر انہوں نے بطور پھل اسے نوش جان فرمایا ہو گا۔ ممکن ہے ایسا کرتے وقت اس کے کسیلے ذائقے کی وجہ سے کچھ افراد خانہ نے برا سا منہ بھی بنایا ہو لیکن اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا کیونکہ یار لوگ مالٹوں کی نسل کا ایک پھل ہزاروں سال گزرنے کے بعد آج بھی چٹخارے لے لے کر چوستے ہیں کہ جس کا نام تو ''میٹھا'' ہے لیکن عالم یہ ہے کہ اس کے باعث آدھ گھنٹے تک منہ کوڑا رہتا ہے۔ حلوہ کدو کو پھل تسلیم کرنے کے بعد یقیناً ایسا بھی ہوتا ہو گا کہ پکنک وغیرہ کا پروگرام

بننے کی صورت میں یار لوگ اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کسی ٹھنڈی جھیل میں ڈبو دیتے ہوں گے اور پھر گھنٹے دو گھنٹے بعد چسکے لے لے کر یہ ''پھل'' کھاتے ہوں گے۔

یہ صورت حال صرف حلوہ کدو ہی کے بارے میں ظہور پذیر نہیں ہوئی ہوگی بلکہ دیگر سبزیاں اور پھل بھی اس جاں گسل مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ مثلاً جس پہلے انسان نے پہلی بار کیلا دیکھا ہوگا اس کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ یہ کوئی کھانے کی چیز ہے۔ وہ اسے ''یکے از مطبوعات ادارہ نباتات'' ہی سمجھا ہوگا اور اسے چھلکوں سمیت ہی کھایا ہوگا۔ یہ بھید کافی عرصہ بعد اس پر آشکار ہوا ہوگا کہ کیلا کھانے سے پہلے اس کا چھلکا اُتارنا پڑتا ہے اور جب اس نے پہلی بار چھلکا اُتارا ہوگا تو اللہ کی قدرت پر خاصا حیران ہوا ہوگا۔ یہ صورت حال صرف حلوہ کدو اور کیلے وغیرہ تک ہی محدود نہیں ہوگی بلکہ ہمارا خیال ہے کہ ناریل کے سلسلے میں تو مزید اُلجھنیں پیدا ہوئی ہوں گی چنانچہ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ایک طویل عرصے تک ناریل کا شمار پھلوں میں ہونے کی بجائے ''اسلحے'' میں ہوتا ہوا اور ان دنوں لڑائی جھگڑے کے دوران بوتلوں کی بجائے ناریل چلتے ہوں گے۔ بہر حال یہ سب چیزیں قیاس ہی کے ضمن میں آتی ہیں ورنہ ممکن ہے کہ انسان حلوہ کدو کو پہلے دن بطور حلوہ کدو، ناریل کو بطور ناریل اور کیلے کو بطور کیلا ہی استعمال کرتا رہا ہو۔ تاہم یہ معاملہ ''واللہ اعلم بالصواب'' ہی کی ذیل میں آتا ہے۔

ان امور کے علاوہ ایک اُلجھن ہمیں اور بھی ہے، اُلجھن یہ ہے کہ انسان نے طویل عرصے کے تجربے کے بعد حلوہ کدو، کیلے اور ناریل کا صحیح استعمال تو جان لیا ہے، ان کی افادیت اور ماہیت سے بھی واقف ہوگیا ہے لیکن ابھی خود سے واقف نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ حلوہ کدو انسان سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ کم از کم اس کی تخلیق کا مقصد تو سمجھ میں آ گیا ہے۔ ورنہ ہولناک جنگ کے دہانے پر کھڑی اس دنیا میں انسان ہزاروں سال گزرنے کے بعد آج بھی ناریل کے طور پر استعمال ہوتا ہے جبکہ خود ناریل اب ''اسلحے'' کے ذیل میں نہیں آتا۔

گانے کی کامیابی

میں یہ سطور الیکشن سے ایک دن پہلے یعنی بدھ کی صبح کو دس بجے تحریر کر رہا ہوں، جب آپ یہ سطور پڑھ ہی رہے ہوں گے، اس وقت تک انتخابی نتائج کا غیر سرکاری اعلان ہو چکا ہوگا، جب کہ یہ سطور لکھتے وقت پولنگ سٹیشن پوری طرح آباد بھی نہیں ہوئے، میں جیتنے والی پارٹی کی پیشین گوئی بھی کر سکتا ہوں۔ مگر میں یہ کالم ''غازی منجم'' بننے کے لیے نہیں لکھ رہا بلکہ تھوڑی دیر پہلے اخبار کی ایک خبر نے اتنا انسپائر کیا ہے کہ میں باقی سارے کام چھوڑ کر یہ کالم لکھنے بیٹھ گیا ہوں، اخبار کے مطابق گزشتہ رات گئے بازار حسن میں طوائفوں اور ناچ گانے سے منسلک افراد کا ایک ہنگامی اجلاس انجمن موسیقاران و فنکارانِ بازار حسن کے صدر مسٹر محمود احمد المعروف مودا کنجر کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں انجمن کے عہدیداروں، ارکان اور اہل محلہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی، اس موقع پر صحافیوں کی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ انجمن کے صدر میاں محمود احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ دنوں انتخابی مہم کے دوران مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے ہمارے علاقے کا دورہ کیا ہے، ہم وہ لوگ ہیں جنہیں آپ کنجر کا نام دیتے ہیں، ہم نے تمام مقررین کو سن کر فیصلہ کیا ہے کہ انتخاب میں ہم پیپلز پارٹی کا ساتھ دیں گے۔ اس فیصلے پر جلسے میں موجود بازار حسن کی طوائفوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ انجمن کے صدر نے کہا کہ یہ کوئی انتخابی جلسہ نہیں تھا بلکہ اپنی انجمن کی طرف سے ہم نے مشترکہ طور پر کسی ایک پارٹی کی حمایت کے فیصلے کے لیے اجلاس بلایا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ پیپلز پارٹی

کی کامیابی پر سودیگیں پکائی جائیں گی جبکہ منوں مٹھائی بھی تقسیم ہوگی۔ ٹکسالی چوک میں مستقل طور پر تیر کا ایک یادگار نشان تعمیر کیا جائے گا۔ مقررین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کے آٹھ ہزار ووٹ پیپلز پارٹی کے حق میں کاسٹ ہوں گے۔

اخبار کی یہ دو کالمی خبر دو تصویروں سے بھی سجائی گئی ہے، ایک تصویر چار کالمی ہے جس میں طوائفوں کے رہنما ''رہنماؤں'' میاں محمود احمد تقریر کر رہے ہیں جن کے بقول لوگ انہیں کنجر کا نام دیتے ہیں اور سامنے طوائفیں بطور سامعین سجی بنی بیٹھی ہیں اور ان کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے ہیں۔ دوسری تصویر میں طوائفیں بالکونی پر بیٹھی ہیں، بظاہر لگتا ہے کہ وہ گاہکوں کا انتظار کر رہی ہیں، مگر کیپشن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکونی میں بیٹھ کر اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہی ہیں۔ میرے لیے یہ خبر صرف اس لیے اہم نہیں کہ ایک سیاسی جماعت نے اس جلسے کا انعقاد کروا کر اپنی انتخابی ذہانت کا بالکل نادر مظاہرہ کیا ہے بلکہ اس خبر کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ موجودہ الیکشن میں ووٹروں نے برادری کی بجائے اصولوں کو بنیاد بنایا ہے کیونکہ تصویر میں جتنی بھی طوائفیں نظر آ رہی ہیں، وہ ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی خفیہ ''پرچی'' ہیں جنہیں پیپلز پارٹی اور اتحاد دونوں نے ٹکٹ دیے ہیں، مگر ان طوائفوں نے خون کے رشتے سے بے نیاز ہو کر ووٹ کی حرمت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

میرے نزدیک متذکرہ خبر کی اہمیت ایک اور حوالے سے بھی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی اتحاد اور پیپلز پارٹی، دونوں کے ٹکٹ ہولڈر ماضی میں ضیاء الحق مرحوم کے جاں نثار ساتھی رہے ہیں اور یہ شرح نوے (۹۰) اور ساٹھ (۶۰) کی ہے۔ یوں چند نشستوں کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو دراصل ایک ہی جماعت کے اُمیدوار دوستانہ میچ کھیل رہے ہیں۔ تاہم طوائفوں نے اگر من حیث الجماعت پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے دونوں فریقوں میں سے اپنے لیے بہترین فریق کا انتخاب کرنا تھا، سو ان کی نظر انتخاب پیپلز پارٹی پر پڑی، آپ یقین جانیں کہ یہ ایک بہت اہم سیاسی نکتہ ہے

اور میں نے اسلامی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے اندرونی حلقوں کو نجی محفلوں میں یہ کہتے سنا ہے کہ دونوں دھڑوں کے بیشتر اُمیدواروں کو دیکھتے ہوئے مسئلہ بڑی برائی اور چھوٹی برائی میں سے چھوٹی برائی کے انتخاب کا ہے، دوسرے لفظوں میں اندھوں میں سے کانے کو ووٹ دینا ہے، سولوگوں نے اسی معیار کو سامنے رکھ کر ووٹ دیے ہیں۔ میں یہ سطور یہیں ختم کر رہا ہوں کیونکہ میں نے اپنے کانے یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کو ووٹ دینے جانا ہے، تاہم یہ سطور پڑھتے ہوئے جس جماعت کی کامیابی کی خبر آپ کو موصول ہو چکی ہو، اسے ''کانے'' کی کامیابی سمجھیں اور آئندہ انتخابات کے لیے ''سوجاکھوں'' کی ٹیم ابھی سے تیار کرنا شروع کر دیں کہ ہم لوگ آخر کب تک اندھوں میں سے کانے کا انتخاب کرتے رہیں گے؟ (۱۷نومبر ۱۹۸۸ء)

نورانی آئے گا

جمعیت علمائے پاکستان کے زیر اہتمام فیصل آباد میں منعقد ہونے والے جلسہ عام میں جہاں دوسرے نعرے لگائے گئے، وہاں ایک نعرہ یہ بھی لگایا گیا ''نورانی آئے گا اسلام لائے گا'' قائد اہل سنت حضرت مولانا شاہ احمد نورانی مدظلہ العالی کے ساتھ اس بے تکلفی یعنی ''نورانی آئے گا'' کا مظاہرہ خود حضرت مولانا نورانی کے عقیدت مندوں نے ان کی موجودگی میں کیا اور حضرت مولانا چونکہ کسی مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اجتماع سے خطاب فرما رہے تھے، لہٰذا انہوں نے بھی مائنڈ نہیں کیا کہ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'' بصورت دیگر حضرت مولانا کے بارے میں یہ لہجہ حضرت کے عقیدتمندوں کی بجائے مخالفین نے اختیار کیا ہوتا تو اس کے دوررس نتائج نکلتے تاہم اس نعرے کی جو توجیہہ ہم نے پیش کی ہے، خود ہم بھی اس توجیہہ سے مطمئن نہیں ہیں، کیونکہ ''نورانی آئے گا، اسلام لائے گا'' اپنی ساخت میں نعرہ نہیں، پیروڈی لگتا ہے اور یہ نعرہ سن کر پہلی جماعت کا وہ قاعدہ یاد آ جاتا ہے جس میں ''بابا آئے گا، باجا لائے گا'' والا سبق موجود ہے اور جسے بچے لہک لہک کر پڑھا کرتے ہیں۔

''نورانی آئے گا، اسلام لائے گا'' والا نعرہ ہمیں اس لیے بھی نامناسب سا محسوس ہوا کہ اسے اگر مجسم صورت میں تصور میں لائیں تو کچھ اس قسم کا منظر ذہن میں آتا ہے کہ حضرت مولانا ہاتھ میں تھیلا پکڑ کر اسلام لانے کے لیے گھر سے نکلے ہوئے ہیں، گھر میں بچے بڑے ان کے انتظار میں بیٹھے ہیں، کچھ بچوں نے روں روں بھی شروع کر دی ہے،

جس پر بڑے انہیں پچکار کر چپ کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''نورانی آئے گا، اسلام لائے گا، نورانی آئے گا، اسلام لائے گا!'' اور ظاہر ہے یہ منظر کچھ اتنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے مولانا اور اسلام دونوں Ridicule ہوتے ہیں۔ جمعیت علمائے پاکستان کے کارکن اگر ہم ایسے کسی دانا شخص سے مشورہ کرتے تو وہ اسی نعرے کو ذرا سی ترمیم کے ساتھ بہت بہتر فارم میں پیش کرتا، مثلاً اگر فیصل آباد والے جلسے میں ''نورائے آئے گا، اسلام لائے گا'' والے نعرے کی بجائے ''نورانی آئیں گے، اسلام لائیں گے'' کا نعرہ بلند کیا جاتا تو اس سے نعرے کا مفہوم کہیں بہتر ہو جاتا، مثلاً اس ترمیم کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں مولانا کے لیے صیغہ واحد کی بجائے صیغہ جمع استعمال ہوا ہے جو احترام کی علامت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ترمیم کی موجودگی میں نورانی سے مراد صرف حضرت مولانا شاہ احمد نورانی مدظلہ العالی نہیں بلکہ وہ تمام نورانی لوگ ہوتے ہیں جو اس ملک میں نفاذ اسلام چاہتے ہیں اور ''نور'' کے حوالے سے اس میں وہ برگزیدہ ہستیاں بھی شامل ہیں، جو بظاہر ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

اور یوں اس نعرے کی معنویت میں چار چاند لگ جاتے۔ اسی طرح اس نعرے کے دوسرے حصے یعنی ''اسلام لائے گا'' کو ''اسلام لائیں گے'' میں بدلنے سے بھی نعرے میں ایک مثبت جہت کا اضافہ ہو سکتا تھا۔ سابقہ صورت یعنی ''نورانی آئے گا، اسلام لائے گا'' میں کچھ اس قسم کا تاثر ملتا ہے گویا حضرت مولانا جو ''اسلام'' لائیں گے، وہ بہت خاص قسم کا ہوگا جبکہ ''اسلام'' کے لیے صیغہ جمع استعمال کرنے سے یہ تاثر بھی بدل جاتا ہے۔

تاہم اس گفتگو کے دوران ایک ایسی بات ہے جو ہم نے اب تک نہیں کی۔ مگر اب کہہ اس لیے رہے ہیں کہ ہمارا پراگندہ ذہن جس طرف نکل گیا ہے کہیں دوسروں کا ذہن بھی اس نکتے کی طرف نہ چلا جائے۔ اس نعرے کے حوالے سے جو شیطانی وسوسہ ہمارے ذہن میں آیا ہے، وہ یہ ہے کہ ''اسلام لانا'' کا مطلب اسلام پر ایمان لانا ہے،

چنانچہ ''نورانی آئے گا، اسلام لائے گا'' یا ''نورانی آئیں گے، اسلام لائیں گے'' ایسے ہر دو نعروں میں ذم کا پہلو موجود ہے اور ذم کا پہلو تو اگر شعر میں بھی ہو تو اُستاد شاعر اسے ناپسند کرتے ہیں، یہاں تو دین کا مسئلہ ہے، لہٰذا مولانا کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اسلام لائیں گے، ذہن کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان کے کارکنوں کو اپنے کسی جلسے میں یہ نعرہ نہیں لگانا چاہیے بلکہ جس کسی نے یہ نعرہ دیا ہے، اس کے فقہی عقائد کے بارے میں مکمل چھان بین کرنی چاہیے کہ کہیں کوئی فرقہ پرست جمعیت علمائے پاکستان میں نہ چھپا بیٹھا ہو۔

اس سارے معاملے میں ایک دلچسپ بات ایسی بھی ہے جس کا تذکرہ ہم نے ابھی نہیں کیا اور وہ یہ کہ متذکرہ نعرے میں جو سقم موجود ہیں، وہ صرف مولانا نورانی اور اسلام کا نام درمیان میں آنے کے حوالے سے ہیں، ورنہ یہ نعرہ اپنی ساخت میں بہت کمال کا ہے اور یوں بھی بہت سی جماعتوں کے کام کا ہے، مثلاً ڈی پی والے اپنے جلسوں میں اس نعرے کو ذرا سی ترمیم سے یوں استعمال کر سکتے ہیں کہ ''ولی آئیں گے، کارل لائیں گے'' جی ایم سیّد کے پیروکار یعنی جئے سندھ والے ''سیّد آئیں گے، یزید لائیں گے'' کہہ سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اسی نعرے کی جنس تبدیل کر کے اسے یوں استعمال کر سکتی ہے ''پارٹی آئے گی، کھلونے لائے گی''۔ غرضیکہ ہر جماعت اس نعرے کو معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنے مقاصد کے اعلان اور ترویج کے لیے استعمال کر سکتی ہے، بس اسے جمعیت علمائے پاکستان اور مولانا شاہ احمد نورانی کی خوش قسمتی یا بدقسمتی سمجھ لیجیے کہ یہ نعرہ ان کے کام نہیں آ سکتا۔ ممکن ہے جمعیت علماء والے ہماری اس بات سے اتفاق نہ کریں مگر ہمارا کام تو نیک و بد سمجھانا تھا! سو وہ ہم نے سمجھا دیا ہے!

◇ ◇ ◇

خبردار

آج سے آٹھ دس سال قبل راقم نے ایک کالم لکھا تھا جس میں برادرم روحی کنجاہی کی غزل کے ایک مصرعے.....

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

.....کو کثیر المقاصد قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کسی بھی اخباری بیان یا خبر حتیٰ کہ کسی بھی شعر کے آخر میں یہ مصرعہ فٹ کر دیا جائے تو اس بیان، خبر یا اس شعر کی بالکل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ نمونے کے طور پر دو تین مثالیں تازہ ترین صورتِ حال کے حوالے سے ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ یہ مصرعہ آج بھی سدا بہار ہے۔ ...

''چاروں صوبوں میں اسمبلیاں وجود میں آ گئی ہیں۔''

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

''مہنگائی کم کرنے اور عوام کی شکایات کے خاتمے کے لیے حکومت ہر ممکن قدم اُٹھائے گی۔''

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

''امریکہ پاکستان کے دفاع کے سلسلے میں اپنے وعدے کا پابند ہے۔''

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

''سرحد کابینہ میں سب وزیر نئے ہوں گے۔''

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

''افغانستان میں روسی فوج کی تعداد چار لاکھ کر دی جائے گی۔''

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

اور آپ یقین کریں کہ یہاں تک لکھنے کے بعد ہم نے بمشکل اپنے قلم کو روکا ہے، کیونکہ اخبار کی جس سرخی پر بھی نظر پڑتی ہے اس کے آگے'' حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی'' والا مصرعہ جڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ یہ مصرعہ صرف اخباری بیانات اور خبروں کی ہیئت اور ہیبت ہی زائل نہیں کرتا بلکہ بڑے بڑے شاعروں کے بڑے بڑے شعروں میں موجود سارے فلسفوں اور ساری رومانویت کو بھی ملیامیٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور اقبال کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیں، عام حالات میں ہم ان شعرا کا کلام درج کرتے ہوئے'' نمونہ کلام'' کے الفاظ استعمال کرتے، مگر روحی کنجاہی کے مصرعے کے اضافے کے ساتھ ان عظیم شعراء کا کلام ''نمونہ کلام'' نہیں ''نمونیہ کلام'' کی ڈیل میں آتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہی لگتا ہے کہ'' ان شعروں کو نمونیہ ہو گیا ہے'' بہرحال تمہید کی ضرورت نہیں، آپ یہ دو شعر خود ملاحظہ فرمالیں......

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

☆☆☆

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

اور ایک بار پھر اپنا ہاتھ روکنے پر ہمیں گھٹن کا احساس ہو رہا ہے کیونکہ روحی کنجاہی

کے اس ''آدم خور'' مصرعے کی زد سے کوئی شاعر بچ کر نہیں جا سکتا لیکن ہاتھ ہم روک اس لیے رہے ہیں کہ آج کا کالم ہم اس مصرعے کے حوالے سے نہیں لکھ رہے، اگرچہ متن سے تشریح طولانی ہو گئی ہے، تاہم ہمارا مقصد اپنے قارئین کو آج ایک مصرعے کی بجائے صرف ایک لفظ سے روشناس کرانا تھا اور یہ لفظ اگرچہ متذکرہ مصرعے کا نعم البدل نہیں، لیکن پھر بھی بہت کارآمد ہے۔ یہ لفظ ''خبردار'' ہے۔ ہم نے یہ لفظ بہت سی خبروں اور بیانات کے شروع میں لگا کر وہ خبر یا بیان پڑھا تو یقین جانیں ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خبریں اور بیانات تو چھوڑیں ہم نے گزشتہ دنوں انارکلی کی ایک دکان کے باہر ایک بہت بڑے بینر پر ''یہاں صفدر چیمہ کے کیسٹ دستیاب ہیں'' لکھا ہوا دیکھا تو ہم نے اس کے شروع میں یہ لفظ ''خبردار'' لگا کر پڑھا یعنی ''خبردار یہاں صفدر چیمہ کے کیسٹ دستیاب ہیں'' تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ تاہم فائدہ یہ ہوا کہ لفظ کی نئی نئی جہتیں ہمارے سامنے آئیں چنانچہ ہم نے یہ لفظ ''خبردار'' آج کے اخبار میں شائع ہونے والی خبروں اور بیانات کے شروع میں لگا کر دیکھا اور سبحان اللہ ان خبروں اور بیانات کے بین السطور مطالب کس طرح واشگاف ہو کر سامنے آئے، اسی لفظ ''خبردار'' کی کچھ کرشمہ سازیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

خبردار...... ایم آر ڈی سے بات چیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ (وزیراعظم جونیجو)

خبردار...... مارشل لاء اُٹھنے میں ابھی وقت لگے گا۔ (صدر ضیاء)

خبردار...... مینگل کی پاکستان سے محبت نے پھر جوش مارا ہے۔ (نوابزادہ نصر اللہ خان)

خبردار...... ولی خاں اور جتوئی علاج کے لیے لندن جا رہے ہیں!

خبردار...... وفاقی کابینہ آج بجٹ تجاویز کو حتمی شکل دے گی!

خبردار...... ہم صرف بیان نہیں دیتے۔ (اعتزاز احسن)

خبردار...... ۱۳۵ ارکان صوبائی چودھری غفور کی قیادت میں متحد ہو گئے۔

خبردار...... فائرنگ کا ملزم ابھی تک مفرور ہے۔

خبردار...... پی ایف یو جے سے مشورہ کیے بغیر پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس منسوخ نہ کیا جائے۔ (رشید صدیقی)

آپ یقین جانیں ابھی اس لفظ ''خبردار'' کی زد میں بے شمار خبریں اور بیانات آتے ہیں، لیکن ہمارا مقصد تو محض آپ کو خبردار کرنا تھا کہ کسی خبر یا بیان کے شروع میں لفظ ''خبردار'' نہ لگائیں ورنہ خبروں اور بیانوں کی دہشت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ''حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی'' والا مصرعہ خبروں کی دہشت ختم کرتا اور ''خبردار'' کا لفظ ان کی دہشت میں اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کالم یہیں ختم کر رہے ہیں کیونکہ اس لفظ اور متذکرہ مصرعے کے بیک وقت استعمال سے ''گرم سرد'' ہونے کا امکان ہے!

ہزاروں ساتھیوں سمیت شمولیت

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے اپنی پہلی تقریر سے اب تک کی جانے والی تقریروں اور بیانات میں صرف ایک بات پورے تکرار سے کہی ہے اور وہ یہ کہ فوج اکتوبر کے مہینے میں انتخابات کرائے گی اور ضرور کرائے گی۔ ان کی اس بار بار یقین دہانی کے نتیجے میں متعدد سیاسی لیڈروں نے اپنے بیانات میں اطمینان کا اظہار کیا ہے اور یہ توقع بھی ظاہر کی ہے کہ فوج نہ صرف انتخابات کرائے گی بلکہ یہ انتہائی منصفانہ بھی ہوں گے!

لیکن اگر سچی بات پوچھیں تو ہمیں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے اس طرح کے دو ٹوک بیانات بھلے نہیں لگتے جو وہ انتخابات اور جمہوریت کے قیام کے سلسلے میں دے رہے ہیں۔ ہم جب کبھی اخبار پڑھتے ہیں اور اس میں جنرل صاحب کا کوئی بیان نظر سے گزرتا ہے تو خاصے مایوس ہوتے ہیں۔ اس مایوسی کی وجہ ان کی یہی دوٹوک ''اعلانیت'' ہے جس کا مظاہرہ وہ انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں مسلسل کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ہمارے اندر دبی ہوئی ایک خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ یہ خواہش کچھ اس طرح کی ہے کہ جنرل ضیاء الحق ایک آدھ بیان ایسا دے ڈالیں، جس سے کچھ لوگوں کو یہ شبہ گزرے کہ فوج انتخابات کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، جس کے نتیجے میں عبوری حکومت مستقبل قریب میں دائمی حکومت کی شکل اختیار کر لے گی۔ جنرل ضیاء الحق سے

صرف اس ایک بیان کا سوال ہے، اس کے بعد ہم ان سے کچھ طلب نہیں کریں گے۔

ظاہر ہے ہماری اس خواہش کا شمار ان خواہشوں میں ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک پر دم نکلتا ہے مگر اس کے اظہار سے ہمارا مقصود صرف اخبارات کی وہ سرخیاں دیکھنا ہیں جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ جنرل صاحب کی طرف سے یہ بیان (خدانخواستہ، خدانخواستہ) آتے ہی اخبارات کے صفحہ اوّل پر ماضی میں ''اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں شمولیت'' کا اعلان کرنے والے کسی ''لیڈر'' کا بیان شائع ہوگا کہ وہ ''اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت ملٹری میں شامل ہو گئے'' اور بیان کے متن میں اس فیصلے کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ تمام ''ٹھوس'' دلائل دیے گئے ہوں گے جو انہوں نے ماضی میں پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کرتے وقت دیے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ظالم کی رسی کی طرح دراز ہوگا اور ''ملٹری میں شمولیت'' کی سرخی کے تحت روزانہ زندگی کے مختلف طبقوں سے متعلق افراد کے بیانات شائع ہونا شروع ہو جائیں گے۔ یہ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ''شمولیت'' کا اعلان کرتے وقت یہ لوگ برسر اقتدار طبقے کی کسی اہم شخصیت کو بھی اس تقریب میں موجود رکھنے کے خواہش مند ہوں گے تاکہ وہ اپنی یہ شمولیت بعد میں اس کے ذریعے ''کیش'' کرواسکیں۔ یہ طالع آزما لوگ اس تقریب کے مہمان خصوصی کے لیے بڑے رینک سے لے کر چھوٹے رینک تک رابطہ قائم کریں گے اور پھر ''حسب توفیق'' کسی کو مہمان خصوصی بنا کر اپنی شمولیت کا اعلان کر دیں گے!

ہم نے اگر اپنی کالی زبان کو حرکت دے ہی دی ہے تو ایک گزارش یہ بھی کریں گے کہ اس صورت میں ان شمولیت کرنے والوں میں سے کسی کو مایوس نہ کیا جائے بلکہ ایسے افراد کو ڈھونڈ کر اس امر کی طرف راغب کیا جائے کہ وہ اپنی شمولیت کا اعلان کریں اور جب پاک فوج کو یقین ہو جائے کہ اس طبقے کے تمام افراد ''شامل'' ہو گئے ہیں، تو انہیں

بغیر تربیت دیے کسی دشمن کے ملک کے بارڈر پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ یہاں اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں، اس صورت میں پاک فوج کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا، قوم بھی سرخرو ہو جائے گی اور انشاء اللہ یہ شمولیت کرنے والے بھی ''سرخرو'' ہوں گے۔ گو ہمیں یہ خدشہ ہے کہ یہ لوگ وہاں سے بارڈر پار کر جائیں گے اور اگلے روز اس دشمن ملک کے اخبارات میں ان ''لیڈروں'' کے بارے میں یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوگی کہ وہ ''اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت برسراقتدار پارٹی میں شامل ہو گئے!''

(اکتوبر ۱۹۷۷ء)

پاکستان پرائیویٹ ملٹری بینڈ!

گزشتہ روز ہم نے دو عبارتیں دو مختلف مقامات پر لکھی دیکھیں اور دل خوش ہوا۔ ان میں سے ایک عبارت جس کا شمار ''اقوالِ زریں'' میں ہوتا ہے، ہم نے ایک فالودے والے کی دکان پر لکھی دیکھی۔ یہاں دیوار پر جلی حروف میں درج تھا ''سیاسی گفتگو منع ہے، براہِ کرم اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں'' دوسری عبارت دراصل ایک دکان کا بورڈ تھا جس پر ایک بہت بڑا باجہ بنا تھا اور لکھا تھا ''پاکستان پرائیویٹ ملٹری بینڈ'' ہر چند ان دونوں عبارتوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں لیکن آخر کوئی تعلق تو ہوگا جو ہم انہیں دیکھ کر اس درجہ انسپائر ہوئے کہ کالم لکھنے بیٹھ گئے۔

جہاں تک ''سیاسی گفتگو منع ہے'' والی عبارت کا تعلق ہے تو اس میں اب کوئی لذت نہیں رہی کیونکہ یہ عبارت ہم ایوب خان کے فوجی مارشل لاء سے بھٹو مرحوم کے عوامی مارشل لا تک پڑھتے آئے ہیں اور اس ''نوشتہ دیوار'' کا ہم پر اتنا اثر ہے کہ آج جبکہ سیاسی گفتگو پر کوئی پابندی نہیں، ہم ابھی تک پرانے ''ڈاکٹروں'' کے نسخے کے زیر اثر سیاسی گفتگو سے حتی المقدور پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم اس عبارت کو ''حیاتِ نو'' اس کے اگلے فقرے نے بخشی ہے۔ یعنی سیاسی گفتگو کر کے براہِ کرم اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔ ہمارے خیال میں جنرل ضیاء الحق کی گیارہ سالہ حکومت کی ''مستقل مزاجی'' متذکرہ فقرے کے اس کوزے میں بند کر دی گئی ہے۔ جن دنوں ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھا کرتے تھے ان دنوں ہمارے ایک دوست پورے گلوب میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کو

ایک دوسرے سے کچھ اس طرح مربوط کرتے تھے کہ اس کے نتیجے میں جنرل ضیاء کی حکومت چوبیس گھنٹوں کی مہمان نظر آتی تھی لیکن اگلے روز جنرل ضیا ٹیلی ویژن کے خبرنامے اور اخبارات کی شہ سرخیوں میں پہلے جیسی شان کے ساتھ دوبارہ نظر آتے تو یار لوگ گھبرائے ہوئے ایک بار پھر ٹی ہاؤس پہنچتے جہاں وہ صاحب گلوب میں رونما ہونے والے نئے سیاسی واقعات کی روشنی میں اس امر پر اظہار افسوس کر رہے ہوتے کہ ان واقعات کی وجہ سے جنرل ضیا کے جانے میں ایک آدھ گھنٹے کی تاخیر ہوگئی ہے۔ آپ اس اثنا میں ایک سیٹ چائے اور منگوائیں، آپ کے چائے پینے کے دوران ان کے جانے کی خبر آ جائے گی، لیکن صاحب گیارہ سال ہو گئے ہیں مگر حضرت داغ جہاں بیٹھے تھے، آج بھی وہیں بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ چنانچہ اب اس موضوع پر گفتگو کر کے واقعی وقت ضائع کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ چند روز قبل ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارے ایک سیاسی دوست ایک بار پھر کچھ اس قسم کا زائچہ تیار کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں وہ جنرل ضیا کے اقتدار کا خاتمہ یقینی ظاہر کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کی کہ بھائی صاحب جس طرح ایک بچہ جوان ہوتا ہے، جوانی کے بعد وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اور پھر وہ موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے، اسی طرح اقتدار کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس نے جانا ہی جانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر دو ایک سال میں جنرل ضیا کا بوریا بستر گول ہو جائے گا تو یہ ان کے اقتدار کی ''طبعی موت'' ہوگی، اس کا کریڈٹ بہر حال کسی سیاسی قوت کو نہیں جائے گا کیونکہ یہ قوتیں اپنی تمام تر کوشش کے باوجود نہ صرف یہ کہ صدر ضیا کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں بلکہ اپنا شیرازہ بھی منتشر کر چکی ہیں۔ اگرچہ اس ہوٹل میں فالودے والی دکان کی طرح ''سیاسی گفتگو منع ہے، خواہ مخواہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں'' کی عبارت درج نہیں تھی۔ مگر ''نوشتہ دیوار'' ضروری نہیں دیونار پر لکھا ہوا بھی ہو، چنانچہ ہمارے دوست نے چپ سادھ لی، شاید انہوں نے بھی ''نوشتہ دیوار'' پڑھ لیا تھا۔

اور یہ جو ہم ایک دکان پر ''پاکستان پرائیویٹ ملٹری بینڈ'' کا بورڈ دیکھ کر محفوظ

ہوئے تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ملٹری نے بھی ایک لحاظ سے اب پرائیویٹ حیثیت اختیار کر لی ہے، ورنہ پرائیویٹ ملٹری بینڈ کہاں سے آتا ہے؟ جس بورڈ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس پر صرف باجے ہی کی نہیں ملٹری کے یونیفارم کی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔ جس سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بینڈ ہے تو ملٹری کا مگر اسے پرائیویٹ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ پیسے تو سول بینڈ والے بھی بہت بناتے ہیں لیکن اگر سول بینڈ کو چھوڑ کر ملٹری بینڈ کا کاروبار شروع کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کاروبار میں منافع زیادہ ہے۔ تاہم سچی بات پوچھیں تو ہمیں یہ بات اندر سے اچھی نہیں لگی کہ ملٹری کا نام کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے کیونکہ چند طالع آزما لوگوں کو چھوڑ کر ہماری ملٹری بہترین لوگوں پر مشتمل ہے اور یوں عوام کے دلوں میں اس کا ایک تقدس ہے جسے کاروباری مقاصد کے لیے تباہ کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ صدر جنرل ضیاء الحق چونکہ چیف آف آرمی سٹاف ہیں لہٰذا ہم انہی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ملٹری کا وقار مجروح ہونے سے بچانے کے لیے ملٹری کے نام کو پرائیویٹ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے رجحان کی روک تھام کریں۔ اس موقع پر ہمیں ایک فلمی بول بھی یاد آ رہا ہے جو کچھ اس قسم کا ہے کہ

تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا

لیکن چونکہ یہ بول غیر متعلق سا ہے لہٰذا ہم اس کے بغیر اپنا مطالبہ دہراتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے مطالبے پر دردمندی سے توجہ دی جائے گی اور اس کے توڑ کے طور پر ایک اور سرکاری عمرہ ادا کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

☆ ☆ ☆

ولی خاں بنام بے نظیر بھٹو

خان ولی خان نے ان دنوں ایک ایسا بیان دیا ہے جس کے نتیجے میں شبہ ہے کہ اب تک ان کے گھر میں لڑائی پڑ چکی ہوگی۔ یہ بیان انہوں نے پشاور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیا ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ سرحد کے غیور پٹھان ایک عورت کو یہ حق نہیں دے سکتے کہ وہ ان کے مفادات کا تحفظ کرے، کیونکہ وہ مرد کی برتری پر یقین رکھتے ہیں۔ اللہ کرے ہمارے خدشات غلط ثابت ہوں، لیکن خان صاحب کی بیگم محترمہ نسیم ولی خان نے اپنے شوہر محترم کے اس بیان پر گھر میں خاصا فساد برپا کیا ہوگا۔ کیونکہ محترمہ نسیم ولی خان ۱۹۷۷ء کی نظام مصطفیٰ تحریک میں ''نفاذِ اسلام'' اور ''عوامی مفادات'' کے تحفظ کے لیے بڑے بڑے جلسوں میں خطاب کرتی رہی ہیں اور اب بھی وہ سیاست کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ جبکہ خان صاحب کے متذکرہ بیان کے بعد بیگم نسیم ولی خان کی سیاسی سرگرمی پر پابندی عاید ہونے کا خدشہ محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ خان صاحب کا یہ بیان دراصل اپنے گھر میں مارشل لا نافذ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ مارشل لا والی بات کرتے ہوئے ہمیں خود ہی محسوس ہوا ہے کہ مثال کچھ غلط ہوگئی ہے کیونکہ ہمارے ہاں جب کبھی مارشل لا نافذ ہوا ہے، وہ ''گھر والوں'' پر کبھی لاگو نہیں ہوا۔ سو خان صاحب کے ''مارشل لا'' کی زد میں بھی غالباً دوسرے لوگ ہی آتے ہیں۔ ہم نے بہت سوچا کہ وہ دوسرے لوگ کون ہو سکتے ہیں، مگر ذہن کسی طرف نہیں گیا۔ بالآخر ذہن میں ایک نام آیا بھی تو وہ بے نظیر بھٹو کا تھا، کیونکہ مس بے نظیر چند روز قبل سرحد

کے کامیاب طوفانی دورے سے لوٹی ہیں، وہاں ان کا جس پرجوش طریقے سے استقبال کیا گیا، ممکن ہے قبلہ خان صاحب کو اس استقبال کے نتیجے میں اپنی دو چار نشستوں کے بھی چھننے جانے کا ڈر پیدا ہوا ہو۔ چنانچہ انہوں نے مناسب سمجھا کہ ''گربہ کشتن روز اوّل'' کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے سرحد کے غیور پٹھانوں کو ابھی سے خبردار کر دیا جائے کہ ایک عورت ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ ازراہِ کرم اپنے حقوق کے لیے اس عورت کی بجائے اس مرد سے رجوع فرمائیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا اہل سرحد کا کام ہے کہ وہ مرد اور عورت کی پرانی ڈیفی نیشن کو تسلیم کریں یا اس پر ازسرنو غور کریں۔

باقی باتیں کرنے سے پیشتر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کالم ہم محض خان صاحب سے محبت کی وجہ سے لکھ رہے ہیں تاکہ کسی بہانے سے ان سے ہم کلام تو ہوں یعنی:

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں ان سے ہم کلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

سو بات دراصل یہ ہے کہ خان ولی خان صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کے والد ماجد عبدالغفار بھی بہت نیک انسان ہیں۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا فلسفہ برتری روز اوّل سے قدرے مختلف نوعیت کا رہا ہے یعنی جس کی برتری تسلیم کرنا ہو، اس کی برتری آنکھیں ہی نہیں دل اور دماغ بھی بند کر کے قبول کر لیتے ہیں، لیکن اگر قبول نہ کرنا چاہیں تو پھر ان کے پاس ایسے ایسے ''معقول'' دلائل ہوتے ہیں کہ جوابی دلیل دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مثلاً خان عبدالولی خان کے والد بزرگوار نے ایک عظیم مسلمان کی برتری تسلیم کرنے سے انکار اور اس کے مقابلے میں ہندو کی برتری تسلیم کرنے پر اصرار کیا اور اب تک اسی موقف پر ڈٹے چلے آ رہے ہیں۔ البتہ ان کے صاحبزادے خان عبدالولی خان نے ایک ''اجتہاد'' یہ کیا کہ گاندھی کے مقابلے میں قائداعظم کی ہمشیرہ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی برتری تسلیم کر لی۔ تاہم اپنے حالیہ بیان میں انہوں نے اپنے اس اجتہادی فیصلے پر نئے حالات میں ایک بار پھر نظر ثانی کی ہے اور فرمایا ہے کہ سرحد کے غیور پٹھان ایک عورت کو یہ حق نہیں دے سکتے کہ وہ ان کے حقوق کا تحفظ کرے کیونکہ

وہ مرد کی برتری پر یقین رکھتے ہیں۔ اللہ جانے خان صاحب کو ماضی میں ایک اور خان یعنی ایوب خان کے مرد ہونے پر کیوں شبہ ہوا، جو انہوں نے اس کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر کوئی بہت راز کی بات ہے تو بھی ہمارے کان میں بتا دیں، تا کہ کم از کم ہم ذاتی طور پر تو مطمئن ہوں کہ خان صاحب اپنا موقف بغیر کسی ذاتی یا قومی وجہ کے تبدیل نہیں کرتے۔

جیسا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں اس شبہ کا اظہار کیا کہ خان عبدالولی خان صاحب کا متذکرہ بیان صوبہ سرحد میں بے نظیر کے پر جوش استقبال کا ردعمل لگتا ہے اور انہیں ''اچوائیں'' لگی ہوئی ہے کہ کہیں:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

کے مصداق سرحد والے بھی اس زلف کے اسیر نہ ہو جائیں کیونکہ ممتاز بھٹو نے حال ہی میں ایک بیان میں کہا کہ ولی خان ''کنفیڈریشن'' کے سلسلے میں ''اصولی'' طور پر ان سے متفق ہیں۔ ادھر بے نظیر بھٹو ہیں کہ کنفیڈریشن کی بجائے فیڈریشن کی بات کرتی ہیں۔ پاکستان کے جمہوری حلقوں میں بے نظیر کی مخالفت کرنے والا طبقہ بھی موجود ہے، مگر یہ طبقہ دیگر خدشات کی بنیاد پر، بلکہ ماضی کے تجربے کی بنیاد پر بے نظیر کی مخالفت کرتا ہے۔ جبکہ معلوم یہ ہوا ہے کہ اپنے ولی خان ان کی مخالفت کسی اور وجہ سے کر رہے ہیں۔ مگر ہائے رے انسان کی مجبوریاں کہ انہیں سیدھی کھری سیاسی بات کہنے کی بجائے ''جنس'' کی بنیاد پر بات کرنا پڑ رہی ہے اور عورت کو مرد سے گھٹیا قرار دینا پڑ رہا ہے۔ اس سلسلے میں مزید کچھ لکھنے کی بجائے ہم خان ولی خان کی بجائے بیگم نسیم ولی خان سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے میاں کو سمجھا لیں، ورنہ ہم وومن ایکشن فورم کو، بلکہ ان میں سے بھی کشور ناہید کو، ان کے میاں کے پیچھے لگا دیں گے۔ اس کے بعد ولی خاں یا بیگم ولی خاں ہم سے کوئی گلہ نہ کریں!

موسموں کا جن جپھا

کچھ لوگ بے تکلف ہونے میں کوئی جواب نہیں رکھتے۔ یہ منٹوں سیکنڈوں میں بے تکلف ہو جاتے ہیں اور آپ ان کا منہ ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ایک صاحب ہمیں برخورداروں کی طرح ملا کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ملاقات میں کچھ وقفہ پڑ گیا۔ چنانچہ کوئی دو سال بعد ان سے سر راہے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہمیں ایک دو ہتڑ رسید کیا اور قہقہہ لگا کر کہا: ''یار توں ملدا ای نئیں'' ہم ان کے اس اچانک حملے سے گھبرا گئے اور پیشتر اس کے کہ کوئی ''مناسب'' سا جواب دیتے، انہوں نے ہمیں پریشان دیکھ کر مزید ارشاد فرمایا: ''کی گل اے، تو وڈا آدمی ہو گیا ایں؟'' اور پھر انہوں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا ''اے او ہوئی روزن دیوار والا اے۔ پر اپنا یار اے، فیر بھی کدی ملاقات ہونی چائی دی اے'' اور اس کے بعد یہ صاحب ہماری ''بے تکلفی'' کا مظاہرہ دیکھے بغیر ہمیں ایک دو ہتڑ اور رسید کر کے آگے بڑھ گئے۔

خیر، افراد سے بے تکلفی یا تکلف کا مظاہرہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کچھ لوگ تو موسموں کے ساتھ بھی بے تکلفی سے باز نہیں آتے، ہمارے ایک دوست ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں اور ان کی موسم کے ساتھ بے تکلفی خاصی منفرد قسم کی ہے۔ مثلاً موصوف اپنے ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں، باہر آگ برس رہی ہے اور لو کے تھپیڑے جسم کے آر پار ہو رہے ہیں کہ اچانک ان کے پاؤں کی تلی میں خارش ہوتی ہے۔ اور یہ موسم کو دو ہتڑ رسید کرنے اور اس سے یہ پوچھنے کے لیے کہ ''یار توں کدی ملدا ای نئیں'' گھر

سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتے ہیں، مگر موسم ان صاحب سے زیادہ ستم ظریف ہے۔ چنانچہ وہ بڑھ کر ان سے ''معانقہ'' کرتا ہے اور یہ وہ ''معانقہ'' ہے، جس کے لیے زیادہ مناسب لفظ ''جن جپھا'' ہے۔ جس پر یہ صاحب خاصے تلملاتے ہیں مگر موسم کی بے تکلفی اس کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ انہیں لو کے دو چار تھپیڑے بھی رسید کرتا ہے۔ ان کے سر پر آگ بھی برساتا ہے اور یوں چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا ہے جس پر ہمارے یہ دوست اپنی بے تکلفی کی اس عادت پر لعنت بھیجتے ہیں اور واپس اپنے ٹھنڈے کمرے میں آ کر پناہ لیتے ہیں۔ مگر ان کی یہ پسپائی عارضی ہوتی ہے کیونکہ موسم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے لیے تھوڑی دیر بعد وہ پھر باہر سڑک پر آ جاتے ہیں جہاں ان سے زیادہ ''بے تکلف'' موسم ان کے سر پر آگ برسانے اور لو کے تھپیڑے رسید کرنے کے لیے ''اٹینشن'' کھڑا ہوتا ہے۔

ہمارے اس دوست کی بے تکلفی برستی ہوئی آگ اور جسم کے آر پار ہونے والے لو کے تھپیڑوں ہی سے نہیں ہے بلکہ کپکپا دینے والے اور سوچوں تک کو یخ بستہ کر دینے والے موسم سرما سے بھی ہے۔ چنانچہ اس موسم کے ساتھ بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ اکثر نو سے بارہ بجے کا فلم شو باریک سی قمیض اور اس سے زیادہ باریک دھوتی پہن کر دیکھنے جاتے ہیں۔ سینما ہال میں تو خیر ان کی بچت ہو جاتی ہے کیونکہ سکرین پر نظر آنے والے مناظر اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی گرم سانسیں انہیں موسم کے حملے سے محفوظ رکھتی ہیں لیکن جب یہ فلم دیکھ کر باہر نکلتے ہیں تو موسم ان کے ساتھ بے تکلفی پر اُتر آتا ہے اور یہ بھی اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے اس کے ساتھ چہلیں کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب مین روڈ کے ہجوم اور روشنیوں سے نکل کر یہ کسی تاریک گلی میں داخل ہوتے ہیں تو فوراً بغلوں میں ہاتھ دے کر سو سو کرتے ہوئے جھک کر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا مطلب موسم سے یہ گزارش کرنا ہوتا ہے کہ بھائی بہت مذاق ہو گیا، اب جان چھوڑ دو۔ مگر موسم جان نہیں چھوڑتا، بلکہ ہوتا یوں ہے کہ موصوف بغلوں میں ہاتھ دیے سو سو کرتے کبے ہو کر چل رہے

ہوتے ہیں کہ اچانک کوئی راہگیر سامنے سے آ جاتا ہے اور پوچھتا ہے ''پہلوان جی ٹیم کی کیتا اے؟'' جس پر یہ بغلوں سے ہاتھ نکال کر، تن کر چلنا شروع کر دیتے ہیں اور آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پا کر کہتے ہیں ''اِک وجن والا اے بھئی'' اور پھر یوں ہوتا ہے کہ گھر پہنچ کر انہیں زکام ہو جاتا ہے لیکن اگلے روز یہ موسم کے ساتھ بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کے لیے پھر اسی باریک سی قمیض اور باریک سی دھوتی میں گھر سے نکل پڑتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کا رویہ ہمارے اس دوست کا موسم برسات کے ساتھ بھی ہے۔ پہلے بارش کا انتظار کرتے ہیں، اس کے بعد کیچڑ کا اور جب دیکھتے ہیں کہ اب چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے تو موصوف ہوائی چپل پہن کر گھر سے باہر نکل آتے ہیں اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ تمام موسموں میں سے موسم برسات سب سے زیادہ بے تکلف موسم ہے، چنانچہ ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ ان کا پاؤں آگے کی طرف جا رہا ہے لیکن دھڑ پیچھے کی طرف آ رہا ہے۔ موصوف کو یہ چال غالباً زیادہ پسند ہے، کیونکہ کیچڑ میں لت پت ہو کر گھر پہنچتے ہیں تو اگلے روز پھر بارش کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کے بعد کیچڑ کا اور پھر ہوائی چپل پہن کر گھر سے باہر نکل آتے ہیں۔

ایک روز ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ ''یار تم موسموں کے ساتھ بے تکلفی سے باز نہیں آ سکتے؟'' جس پر اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا ''یہ بات تم موسموں سے کیوں نہیں کرتے؟ تم دیکھتے نہیں ہر موسم دادا گیری کرتا ہے۔ نہ گرمی جینے دیتی ہے، نہ سردی جینے دیتی ہے اور نہ برسات چین لینے دیتی ہے، ان سب موسموں کے نام الگ الگ ہیں اور کام ایک ہی ہے اور وہ خلق خدا کو عذاب میں مبتلا کرنا۔ انہیں سمجھاؤ میں خود ہی سمجھ جاؤں گا۔'' اب انہیں کون سمجھائے کہ موسم اتنے سمجھدار نہیں ہوتے۔ اگر یہ سمجھدار ہوتے تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ یہ بات موسم بھی جانتے ہیں کہ کوئی موسم سدا نہیں رہتا۔ اس کے باوجود اگر یہ اپنی چیرہ دستیوں سے باز نہیں آتے تو یہ ''بادچھا'' لوگ ہیں اور ''بادچھا'' لوگوں کو کون سمجھا سکتا ہے؟

رونے دھونے کا فائدہ

یہ خبر پڑھ کر دوسرے قارئین کا ردعمل تو خدا جانے کیا ہوگا، مگر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم بات بات پر رونے والوں کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے اور تو اور بعض مرحومین بھی ہمارے اس اندرونی غصے کی زد میں آ جاتے تھے، چنانچہ میر تقی میر سے تو ہم خصوصی طور پر نالاں تھے جن کی ساری عمر ؎

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

قسم کے شعر کہنے اور ہمسایوں کو ''ڈسٹرب'' کرنے میں بسر ہو گئی، مگر یہ بھید تو اب کھلا کہ مرحوم یہ سارا گریہ دراصل اپنی جان بنانے کے لیے کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کے بڑے شاعروں میں سے میر تقی میر غالباً سب سے طویل العمر شاعر ہیں، اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ آج اہل مغرب جن سائنسی تحقیقات کا کریڈٹ لینے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمارے بزرگ بغیر کسی تحقیق کے صدیوں پہلے فطرت کے یہ بھید پا گئے تھے، بس اتنا ہے کہ انہوں نے وقت پر اور کھل کر اہل دنیا کو اس سے آگاہ نہیں کیا۔ مثلاً یہ اہل مغرب آج سب ہوائی جہاز پر نازاں ہیں، میر حسن نے مثنوی ''سحر البیان'' میں اڑن کھٹولے کا آئیڈیا پیش کر کے اس ایجاد کے لیے راہ ہموار کی تھی اور یہ جو ماہر نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے آج یہ انکشاف کر کے بزعم خود بڑا تیر مارا ہے کہ رونے سے انسان کی صحت اچھی ہوتی

ہے، تو میر تقی میر نے دو صدی پہلے عملی طور پر یہ نظریہ درست ثابت کر دکھایا تھا!

ڈاکٹر فیری صاحب نے ''موازنہ خواتین و حضرات'' کر کے ایک انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ روتی ہیں، حالانکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں، جتنا سادہ بنا کر اسے پیش کیا گیا ہے، دوسرے مردوں کے بارے میں تو ہم زیادہ نہیں جانتے، البتہ ہمارا اُٹھنا بیٹھنا چونکہ شادی شدہ مردوں میں زیادہ ہے، اسی لیے ہم یہ بات بربنائے مشاہدہ ''بربنائے تجربہ'' (یہاں احتیاطاً نہیں لکھا گیا) کہہ سکتے ہیں کہ ان بچاروں کی عمر بھی روتے روتے گزر جاتی ہے۔ بس اتنا ہے کہ یہ بیویوں سے چھپ چھپ کر روتے ہیں کہ برملا رونے کی انہیں اجازت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ڈاکٹر فیری کو چاہیے کہ وہ اپنی متذکرہ تحقیق پر نظر ثانی کریں بلکہ مساوی حقوق کی بنیاد پر عورتوں اور مردوں میں السر کی شرح برابر لانے کی کوشش بھی کریں۔

ڈاکٹر فیری سے ایک گلہ ہمیں یہ بھی ہے کہ انہوں نے متذکرہ تحقیق کی آڑ میں رونے کے فضائل تو کھل کر بیان کر دیے ہیں جن سے ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کو شہ ملے گی جو ایک عرصے سے اپنے آنسو روک کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہنسی کی افادیت کو انہوں نے موضوع تحقیق نہیں بنایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اہل مشرق ہنسی ''افورڈ'' نہیں کر سکتے کہ اس کے لیے ہمیں مطلوبہ ماحول میسر نہیں ہے، جبکہ ہمارے ہاں رونے دھونے کے مواقع بکثرت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم اپنی تحقیق میں اگر وہ ہنسی کے فوائد بھی بیان کر دیتے اور اہل مشرق کو یہ مشورہ دیتے کہ اگر صحت مقصود ہے تو ہنستے رہنا چاہیے، تو ہم ان کی اسی بات پر ہنس پڑتے۔ اس میں ان کا کیا جاتا تھا، ہم غریبوں کا مفت میں بھلا ہو جاتا۔

اس تحقیق میں ہمیں جو بات سب سے زیادہ چونکا دینے والی لگی ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فیری نے ایک سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے جن کی مدد سے وہ متذکرہ نتائج تک پہنچے ہیں۔ یہ بات ہمیں حیرت انگیز لگی ہے کہ با قاعدہ پلاننگ کر کے بھی رویا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کسی کا رونے کو نہ بھی جی چاہ رہا ہو، اسے نوٹ دکھا کر رُلایا جا سکتا ہے۔ ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ دولت انسان کو ہنساتی ہے۔ مگر اب پتہ چلا کہ دولت انسان کو رُلاتی بھی بہت ہے اگر چہ ہم نے دولت مندوں کو ہمیشہ روتے دیکھا کہ کاروبار بہت مندا جا رہا ہے۔ مگر یہ تو محاورے والا رونا تھا، یہ بھید تو ہم پر اب کھلا کہ پیسہ انسان کو باقاعدہ آنسوؤں سے رُلاتا ہے۔

یہ ساری باتیں فروعی ہیں۔ اصل چیز تو ڈاکٹر فیری کی وہ تحقیق ہے جس کے نتیجے میں اب غم و آلام کے مارے ہوئے لوگوں کو کم از کم اتنا احساس طمانیت تو ضرور ہوگا کہ ان کا رونا دھونا ضائع نہیں جا رہا بلکہ افلاک سے ان کے نالوں کا جواب بالآخر آ ہی گیا ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ اپنے نالے جاری رکھیں، اس سے جان بنتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک شکریہ تو ہم نے ڈاکٹر فیری کا ادا کیا ہے کہ ان کی وساطت سے ہمیں نالوں کا جواب آیا اور ہم پر دوسرا شکریہ اپنے حکمرانوں کا جواب ہے جنہوں نے نالوں کی اس سپلائی لائن میں کبھی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دی بلکہ وہ ہمیشہ ایسے حالات پیدا کرتے رہے کہ عوام کو رونے دھونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر فیری کو خوش رکھے جنہوں نے ہمارے عوام کو دلاسا دیا۔ حکمرانوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے عوام کو جی بھر کر رُلایا اور عوام کو حوصلہ دے کہ وہ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے اس نسخے پر عمل کرتے رہیں جس پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ بس صبح و شام آنسو بہانے پڑتے ہیں!

راج کپور کی آخری خواہش!

بھارتی فلمی دنیا پر تقریباً ربع صدی تک راج کرنے والے آنجہانی اداکار راج کپور نے مرنے سے قبل اپنے وصیت نامے میں اپنے بیٹے رشی کپور اور دو بھائیوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں پاکستان جا کر اس کی جنم بھومی پشاور کا دیدار کریں اور صدر پاکستان جو اس دنیا کے عظیم انسان اور امن کے پیامبر ہیں، ان کی قدم بوسی کریں۔ راج کپور نے اس کے علاوہ بھی کچھ وصیتیں کی ہیں جو غیر اہم سی ہیں۔ مثلاً جائیداد کی تقسیم وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس خبر کی اہمیت یہ ہے کہ متذکرہ وصیت زبانی کلامی نہیں، بلکہ راج کپور نے تحریری طور پر اس آخری خواہش کا اظہار کیا ہے کہ رشی کپور پاکستان جا کر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی قدم بوسی کریں کیونکہ وہ دنیا کے عظیم انسان اور امن کے پیامبر ہیں۔

آپ یقین کریں کہ صدر جنرل ضیاء الحق سے ہزار اختلافات کے باوجود ہمیں یہ خبر پڑھ کر اس قدر مسرت ہوئی کہ ہم ایک انتہائی ضروری کام چھوڑ کر یہ کالم لکھنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ ضروری کام یہ تھا کہ ہم ٹب سامنے دھرے برف میں لگے سندھڑی آم کھا رہے تھے۔ بہر حال خبر میں مسرت کے جو پہلو مضمر ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ راج کپور پرتھوی راج کے بیٹے ہیں اور یہ سارا خاندان پاکستان دشمنی کے لیے مشہور ہے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، تو ہم نے اپنے صدر صاحب کی شخصیت کا یہ اعجاز پہلے بھی کئی دفعہ ملاحظہ کیا ہے کہ بڑے سے بڑا پاکستان دشمن بھی ان کی طرف کھنچا چلا

آتا ہے اوران کی عظمت کے گن گاتا واپس جاتا ہے۔ راج کپور سے پہلے اپنے جی ایم سید، صدر صاحب کو قریباً انہی لفظوں میں خراج عقیدت پیش کر چکے ہیں، لیکن انہوں نے دودھ میں مینگنیاں بھی ڈال دی تھیں کہ صدر سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ ہماری اور صدر صاحب کی سیاست کا نتیجہ ایک ہی نکل رہا ہے۔ لاحول ولاقوۃ! اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو راج کپور زیادہ بھلے مانس انسان ثابت ہوئے کہ انہوں نے صدر صاحب سے صرف اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، کوئی فالتو بالخصوص سیاسی بات نہیں کی!

متذکرہ خبر میں مضمر مسرت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اب رشی کپور اوران کے دو بھائی اپنے آنجہانی والد کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے عنقریب پاکستان آئیں گے اور صدر صاحب کی قدم بوسی کے لیے ایوانِ صدر میں حاضر ہوں گے۔ خدانخواستہ ایسا نہیں ہوگا کہ قدم بوسی کے بعد وہ دوسری فلائٹ سے واپس انڈیا چلے جائیں گے کہ یہ تو صدر صاحب کی روایتی میزبانی کے منافی بات ہے۔ چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ وہ صدر صاحب کے مہمان کے طور پر چند روز پاکستان میں رہیں گے، بلکہ امکان غالب یہ ہے کہ صدر صاحب انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھیں گے۔ صدر صاحب کی انہی اعلیٰ ظرفیوں نے انہیں انڈیا کی مقبول ترین شخصیت بنایا ہوا ہے۔ بلکہ لندن میں ہماری ملاقات ایک دعوت میں ایک ہندو سے ہوئی، حالانکہ وہ جن سنگھی ہندو تھا، لیکن وہ مسلسل ایک گھنٹے تک صدر صاحب کی عظمت کے گن گاتا رہا اور ہمیں یہ سمجھاتا رہا کہ جنرل صاحب کو پاکستان کا صدر رہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ بات ہمیں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جنرل صاحب نے پاکستان کا صدر تو رہنا ہی رہنا ہے، جب تک انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید وحمایت حاصل ہے اور آئین پاکستان میں ریفرنڈم کی کوئی دفعہ موجود ہے۔ ستے خیراں نیں!

ہم اپنے قارئین سے معافی چاہتے ہیں کہ سنگل ٹریک مائنڈ ہونے کی وجہ سے ہم راج کپور کی وصیت ہی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں، جس سے تاثر ملتا ہے کہ ہمارے صدر

صاحب خدانخواستہ صرف انڈیا کے اداکاروں میں مقبول ہیں۔ حالانکہ خدا گواہ ہے ایسی کوئی بات نہیں، یہ بات ہمارے مشاہدے میں آئی ہے کہ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صرف بھارتی اداکاروں ہی میں نہیں، پاکستان علماء میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ بھارتی اداکاروں میں مقبولیت کی وجہ فن سے محبت ہے۔ گزشتہ دنوں ہماری ملاقات حضرت مولانا مدظلہ العالی سے ہوئی۔ حضرت اس امر پر بے پناہ مسرت کا اظہار فرما رہے تھے کہ صدر مملکت نے اسلام کی سربلندی کے لیے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی ہیں اور نفاذ اسلام کا وہ کام، جو وہ آٹھ برسوں میں نہ کر سکے، اب تین ماہ میں کر دکھائیں گے۔ حضرت مولانا مدظلہ العالی نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے صدر صاحب کو مبارک باد کا تار بھیجا ہے اور یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ نوے دنوں کے اندر اندر انتخابات کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کے پیش نظر خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کر دیں۔ لوگ اپنی زبوں حالی ہی کی وجہ سے انہیں فوراً خلیفہ مان لیں گے، صدر کی مقبولیت بھارتی اداکاروں اور پاکستانی علماء کے علاوہ ہم نے سیاست دانوں میں بھی دیکھی ہے۔ ایک سے ایک سیاست دان ان دنوں صدر صاحب سے ملاقات کا خواہاں ہے بلکہ صدر صاحب کی مقبولیت دیکھ کر ایک سیاست دان نے تو ہمارے سامنے یہ شعر بھی پڑھا ہے ؎

جو بھی آوے ہے وہ نزدیک ہی بیٹھے ہے تیرے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

اور جہاں تک عام آدمی کا تعلق ہے، وہ تو پہلے ہی صدر صاحب کی زُلفوں کا اسیر ہے۔ اس کا خصوصی طور پر اندازہ ہمیں گزشتہ روز ہوا، جب بھولا ڈوگر ہمارے پاس آیا۔

بھولے نے کہا ''قاسمی صاحب! آپ نے راج کپور کی وصیت اخبار میں پڑھی ہے جس میں اس نے رشی کپور سے کہا ہے کہ وہ اوّلین فرصت میں پاکستان جا کر صدر ضیاء الحق کی قدم بوسی کرے؟''

ہم نے کہا ''ہاں پڑھی ہے!''

بولا ''ایک وصیت میں بھی کرنا چاہتا ہوں''

ہم نے پوچھا ''وہ کیا''

کہنے لگا ''میری قبر کے کتبے پر تحریر کیا جائے کہ صدر ضیاء الحق دنیا کے عظیم ترین انسان ہیں اور وہ ذاتی مفاد پر ملکی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔''

ہم نے پوچھا ''اور کیا لکھا جائے؟''

کہنے لگے ''بس اتنا ہی کافی ہے۔ البتہ اس عبارت کے نیچے ''منجانب بھولا ڈوگر'' ضرور لکھ دیا جائے تا کہ مستقبل کا سورج کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہو!''

✧ ✧ ✧

مولانا نیازی کا طرّہ

مولانا عبدالستار خان نیازی نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ لیبیا میں ان کی پگڑی کا طرہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ کئی افراد نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوائی۔ بلکہ وہاں کے ایک ڈائریکٹر نے پوچھ بھی لیا کہ مولانا آپ کا طرہ کیسے کھڑا ہے؟ کیا کوئی کیل وغیرہ لگائے ہیں؟ جس پر میں نے کہا کہ نہیں، یہ اپنے ہی زور سے کھڑا ہے۔

اگر ہم نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو ان کے طرے سمیت نہ دیکھا ہوتا تو ہم لیبیا والوں کی حیرت پر حیران ہوتے، لیکن ہم تو بچپن سے مولانا کو ان کے طرے سمیت دیکھتے آرہے ہیں۔ اگر کسی نے مردانہ وجاہت کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ مولانا کو دیکھ لے۔ سرخ وسفید رنگ، چوڑی چکلی چھاتی، چھ فٹ قد، دو فٹ طرہ۔ آواز میں گھن گرج اتنی کہ تقریر کر رہے ہوں تو لگتا ہے جنگل میں شیر دھاڑ رہا ہے۔ ہمیں مولانا پر رشک آتا ہے کہ ستر بہتر برس کی عمر میں بھی اتنی رعنائی کے مالک ہیں۔ ان کی داڑھی میں ابھی تک کالے بال وافر مقدار میں ہیں۔ مولانا پر رشک آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ تاہم اس کالم کو ضرورت رشتہ کا اشتہار نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ مولانا نے اپنی شادی کے لیے جو شرط عائد کی تھی، وہ ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ دراصل تحریک پاکستان کے دوران تین نوجوانوں یعنی مولانا عبدالستار خان نیازی، مولوی ابراہیم علی چشتی اور جناب م ش نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک پاکستان بن نہیں جاتا اور یہاں خلافت کا نظام رائج نہیں ہو جاتا، وہ شادی نہیں کریں گے۔ بقول شخصے یہ تو شادی

نہ کرانے والی بات ہے، مگر ہوایوں کہ کچھ دیر انتظار کے بعد مولوی محمد ابراہیم علی چشتی نے شادی کرلی۔ جناب م ش نے بقول کسی ستم ظریف کے ایک شادی اپنے ''بے بے'' کو خوش کرنے کے لیے اور ایک مولانا کے کوٹے میں اور پھر تیسری یہ کہہ کر کرلی کہ اب وہ عہد مولانا کو کیا یاد ہوگا لیکن عبدالستار خان نیازی اپنے طرے کی طرح اپنے مقام پر کھڑے رہے۔ بہت عرصہ قبل ہفت روزہ ''بادبان'' میں ایوب خان کے وزیر اطلاعات اور مسلم لیگ کے رہنما عبدالوحید خان کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ مولانا کی شادی طے پا گئی۔ نکاح خواں کو بھی بلوالیا، لیکن عین نکاح کے وقت مولانا آناً فاناً روپوش ہو گئے۔ عبدالوحید خان کے اس بیان کا مولانا نے خواہ مخواہ برا منایا۔ حالانکہ یہ تو ان کی ذہانت کو خراج تحسین تھا، چنانچہ مولانا نے جوابی بیان میں ان بزرگان دین کے نام گنوائے جنہوں نے اپنی ساری عمر تجرد میں بسر کردی اور آخر میں عبدالوحید خان مرحوم کو ایک چیلنج بھی دے ڈالا جس کا بیان غیرضروری ہے۔ کیونکہ خان صاحب اس پر جھینپ گئے تھے اور انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

یہ ساری باتیں ہمیں مولانا کے طرے کے حوالے سے یاد آ رہی ہیں، جسے دیکھ کر لیبیا والے حیران رہ گئے۔ دراصل مولانا کا طرہ ہی نہیں، وہ خود بھی فرقہ پرستی کے اس عہد میں اپنے زور سے کھڑے ہیں۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے داعی ہیں اور اس سلسلے میں اپنے بہت سے ''دوستوں'' کو بھی ناراض کر بیٹھے ہیں۔ یہ بیان ہم کسی اور وقت کے لیے ''پینڈنگ'' رکھتے ہیں، کیونکہ فی الحال کچھ مزید باتیں محض طرے کے حوالے سے کرنے کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لیبیا میں مولانا کی حیثیت اگر مہمان کی نہ ہوتی تو وہ متذکرہ ڈائریکٹر کے سوال کے جواب میں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تیسری دنیا کے بہت سے لیڈروں کے طرّے بھی بغیر کسی ''سپورٹ'' کے کھڑے ہیں اور ان پر تو یہ شعر بھی صادق آتا ہے ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرّہ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

اسی طرح ایران عراق جنگ میں دونوں ممالک اپنے طروں کو اُونچا رکھنے کے لیے انسانوں کے خون کا بطور ''مایہ'' استعمال کر رہے ہیں۔ خود ہمارے ہاں بھی کچھ طرے ایسے ہیں، جو ''اس پر طرہ یہ'' قسم کے ہیں اور یوں اقتدار کی جنگ کچھ ایسی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے جسے صرف خاصی بدشکلی ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہمارا ارادہ تو اس ضمن میں کچھ مزید مثالیں دینے کا بھی تھا مگر یاد آیا کہ کہیں یہ مثالیں مولانا کے طرے کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ یہ احتیاط ہم نے اس لیے برتی کہ ہم مولانا کے دیرینہ نیازمندوں اور مداحوں میں سے ہیں۔ مولانا کا طرہ علمائے سوء کے سر کے ساتھ چپکی ہوئی پگڑیوں کا کفارہ ہے۔ وہ نہ کسی سے ڈرتے ہیں نہ دبتے ہیں اور یوں انہیں اپنا طرہ اُونچا رکھنے کا حق ہے۔ ایک دفعہ کسی جلسے میں ہم مولانا کی تقریر سن رہے تھے۔ اتنے میں ایک فوٹوگرافر آگے بڑھا اور ان کی تصویر لینے لگا۔ مولانا نے گرجدار آواز میں کہا ''رُک جاؤ'' بچارا فوٹوگرافر سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ مولانا نے برابر میں رکھی اپنے طرے والی پگڑی سر پر رکھی اور اسی گھن گرج میں کہا ''ٹھیک ہے اب تصویر بنالو'' اس سے پگڑی کے ساتھ مولانا کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مولانا ہر وقت ہاتھ میں کھونٹی اور سر پر دستار رکھتے ہیں۔

✧ ~~~ ✧ ~~~ ✧

انڈر میٹرک وزیر

وزیروں کے بارے میں ''اصولاً'' ہماری معلومات زیادہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ہمارا تعلق وزیر آباد سے بھی ہے۔ لیکن ہم تو وزیر آباد کے دو سابق اور موجودہ وزیروں حامد ناصر چٹھہ اور راجہ خلیق اللہ خاں میں سے بھی صرف راجہ خلیق اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اتفاق دیکھیں کہ یہ دونوں وزیر ہوتے ہوئے بھی پڑھے لکھے انسان ہیں۔ حامد ناصر چٹھہ تو اب فخر امام کی جگہ لے چکے ہیں۔ ہمارا مطلب ہے کہ وہ قومی اسمبلی کے سپیکر ہیں۔ ویسے ''جگہ لینا'' موسیقی کی ٹرم بھی ہے اور منجھے ہوئے گلوکار ہی اس میں کامیاب ہوتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ حامد ناصر چٹھہ اس فن میں کتنے ماہر ہیں؟ بہرحال اس وقت ہمارا روئے سخن پڑھے لکھے وزیروں کی طرف نہیں، بلکہ ان وزیروں کی طرف ہے، جن کے بارے میں گزشتہ روز پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں سوال اُٹھایا گیا۔ جب صوبائی وزیر مال نے کہا کہ میٹرک پاس تحصیلداروں کو ترقی نہیں دی جاسکتی تو اس پر ایک رُکن نے کہا کہ انڈر میٹرک وزیروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر وزیر موصوف خاموش ہوگئے۔ حالانکہ انہیں پورے اعتماد کے ساتھ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہنا چاہیے تھا کہ انڈر میٹرک وزیروں کی ترقی کے ضمن میں بھی یہی اصول برتا جائے گا۔ یعنی انہیں وزیر اعلیٰ کے عہدے پر ترقی نہیں دی جائے گی۔

ویسے ہمارے نزدیک وزیروں کے لیے تعلیم یافتہ ہونے کی شرط عائد کرنا ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ وزیروں نے عوام کے مسائل حل کرنا ہوتے ہیں اور عوام ان پڑھ

ہیں۔ چنانچہ ان پڑھ لوگوں کے مسائل اگر کسی پڑھے لکھے وزیر کے سپرد کر دیے جائیں تو وہ ان مسائل کو کیسے سمجھے گا؟ ایک وزیر صاحب کے حلقے کا ایک سائل ان کے دفتر میں داخل ہوا اور کہا چودھری صاحب! آپ سے ایک چھوٹا سا کام پڑ گیا ہے۔ وزیر صاحب نے کام پوچھا تو اس نے کہا کہ بڑے لڑکے نے تین قتل کر دیے ہیں اور پولیس اس کی تلاش میں خواہ مخواہ گھر پر چھاپے مار رہی ہے۔ چودھری صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ ''جنوں'' کی دشمنیاں تو ہوتی ہی ہیں نا! چودھری صاحب چونکہ خود بھی ماشاء اللہ ''جٹ'' ہیں لہٰذا انہیں یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ سو انہوں نے سائل کو یقین دلایا کہ ان کے ہوتے ہوئے اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب ان کی جگہ اگر کوئی پڑھا لکھا وزیر ہوتا تو اسے یہ بات نہ سمجھ آتی، جس کی وجہ سے سائل مایوس لوٹتا اور یوں مسلم لیگ حکومت کی بدنامی ہوتی!

البتہ ان پڑھ وزیروں کے اپنے کچھ مسائل ہوتے ہیں جنہیں حل کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ماضی میں ایک ایسے ہی وزیر کو یہ پرابلم پیش آئی کہ انگریزی فائلوں کو وہ پڑھیں کیسے؟ ان کے دوست نے بتایا کہ یہ فائلیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ان پر Seen لکھ کر نیچے دستخط کر دیے جاتے ہیں۔ جب یہ فائلیں گھوم پھر کر واپس سیکشن آفیسر تک پہنچیں تو اس نے دیکھا کہ وزیر صاحب نے ان پر اُردو میں ''س'' لکھا ہوا تھا اور نیچے دستخط کیے ہوئے تھے! ایک اور وزیر صاحب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے لیکن راوی اس کا ایک حاسد ہے، لہٰذا اس میں مبالغے کی گنجائش ہے۔ بہر حال راوی کے مطابق وزیر موصوف نے ایک پٹرول پمپ کا افتتاح کیا۔ تقریریں ہوئیں، تالیاں بجیں اور بعد میں چائے پی گئی۔ چائے کے دوران وزیر صاحب پٹرول پمپ کے مالک کو ایک طرف لے گئے اور راز داری سے پوچھا ''یار ایک بات تو بتاؤ!'' اس نے کہا ''پوچھئے'' وزیر نے کہا ''سچ سچ بتاؤ تمہیں یہ پتہ کیسے چلا کہ جہاں تم پٹرول پمپ لگا رہے ہو، وہاں پٹرول موجود ہے؟''

اُوپر کی سطور میں ان پڑھ وزیروں کے لطیفے بیان کرنے کو تو ہم نے بھی بیان کر دیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ وزارت کے لیے موزوں بھی ہوتے ہیں۔ چند ہفتے پیشتر ہم نے اسلام آباد کی ایک محفل میں ایک وزیر صاحب کو ''جینٹری'' میں پھنسے دیکھا۔ بیچارے بڑی مشکل میں تھے۔ محفل کے مطابق گفتگو کرنے کی کوشش میں ایسے ایسے لطیفے چھوڑ رہے تھے کہ جنہیں یادگار کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک ادیب سے پوچھنے لگے ''کیا آپ اپنی ''برسی'' ہر سال مناتے ہیں؟'' ادیب نے ''بولا'' سامنہ بنا کر کہا ''نہیں جی! کئی دفعہ سال میں دو دفعہ بھی اپنی برسی منا لیتا ہوں!'' محفل کے اختتام پر ہم نے ایک دوست سے کہا ''یار سمجھ نہیں آتی، یہ لوگ وزیر کس طرح بن جاتے ہیں؟'' دوست نے جواب دیا ''تم بھی بھولوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ میاں یہ شخص سینکڑوں مربعے زمین کا مالک ہے۔ دیہات کے دیہات اس کے زیرنگیں ہیں۔ اگر یہ شخص ''سالگرہ'' کو ''برسی'' کہہ دے تو اس سے اس کی طاقت کو کیا فرق پڑتا ہے جو الیکشن اور دوسرے بحرانوں میں حکومت کے کام آتی ہے؟'' ہمیں اپنے اس دوست کی بات سمجھ میں آ گئی اور یہ بات سمجھ میں آنے کی وجہ ایک اور بات کا یاد آنا بھی تھا۔

پیپلز پارٹی کے دور میں جب بلوچستان پر فوج کشی کی وجہ سے مرکز اور صوبے کے درمیان سخت کشیدگی پائی جا رہی تھی، نیشنل سنٹر لاہور میں ''قومی یکجہتی'' کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پیپلز پارٹی کے وفاقی وزیر طاہر محمد خان کر رہے تھے اور مقرر لاہور کے ایک وفاقی وزیر تھے، جو ان پڑھ نہیں بلکہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ ان پڑھے لکھے وزیر صاحب نے پنجاب اور بلوچستان کے مابین خیرسگالی کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے اپنی عالمانہ تقریر کا آغاز کیا اور کہا ''خواتین و حضرات! آج کے موضوع کی اہمیت اور نزاکت کے مدنظر میں بلوچستان کے بارے میں پوری ریسرچ اور پوری تیاری کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ سب سے پہلے میں آپ کو بلوچستان کے لغوی معنی بتانا چاہتا ہوں۔ بلوچستان کا مطلب ہے مکر و فریب کی

سرزمین۔ جبکہ بلوچ لونڈیوں کی اولاد کو کہتے ہیں!'' یہ سن کر صدارت کی کرسی پر بیٹھے بلوچی رہنما طاہر محمد خان کا رنگ زرد ہوگیا۔ ہم نے اس تقریب پر کالم لکھتے ہوئے متذکرہ ''عالم'' وزیر صاحب کا بیان ''کوٹ'' کیا اور اپنے کالم میں ان کی جتنی ''خدمت'' کر سکتے تھے، کی! اس کالم کی اشاعت پر وزیر موصوف کو قومی اسمبلی اور اپنی پارٹی میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہوں نے ''نوائے وقت'' کو اپنا وضاحتی مضمون ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ تو ایک علمی بحث تھی اور یوں اسے اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے تھا! بس ان پڑھ وزیروں اور پڑھے لکھے وزیروں میں تقریباً وہی فرق ہے جو پنجاب کے دو گورنروں امیر محمد خان اور موسیٰ محمد خان میں تھا۔ یعنی بقول ایوب خان ان میں سے امیر محمد خان بات سنتا نہیں تھا اور موسیٰ خان بات سمجھتا نہیں تھا۔ تاہم یہ صورت حال بعض صورتوں میں ہے، ورنہ وزیر بہر حال وزیر ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا ہو تو کسی نہ کسی سطح پر اسے ان پڑھ ہونا ہی پڑتا ہے اور ان پڑھ ہو تو بہر حال اسے کہیں نہ کہیں خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنا ہی پڑتا ہے۔ تاہم دونوں صورتوں میں اس کی وفاداری شک اور شبہے سے بالاتر ہوتی ہے اور اس وفاداری کا تعلق اس کی وزارت سے ہوتا ہے۔ وزارت ہاتھ سے جارہی ہو تو علم اور جہالت دونوں کی خوبیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ وزارت کو بچانے کے لیے کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اگر انہیں کوئی اُمید نظر نہ آئے تو یہ پنچھی اُڑ کر کسی اور ڈال پر جا بیٹھتے ہیں ؎

تاڑی مار اڈا نہ باہو
اسی آپے ای اُڈن ہارے ہو!

⟡ ⟡ ⟡

مس بے نظیر اور ترقی پسند علماء

مس بے نظیر بھٹو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ''ترقی پسند علماء'' سے ملاقات کریں گی اور یہ ملاقات ''پاکستان کے لینن گراڈ'' ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوگی۔ وہی ٹوبہ ٹیک سنگھ جہاں کسی زمانے میں مولانا بھاشانی نے گھیراؤ جلاؤ کا نعرہ لگایا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن مس بے نظیر یہ ملاقات پیپلز پارٹی اور علمائے دین کے مابین پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے کر رہی ہیں۔ دراصل یہ خبر مولانا احترام الحق تھانوی کی بجائے جو، اب ''جا بے وفا'' کہہ کر پارٹی چھوڑنے والے ہیں، پارٹی کو سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے رُکن مسٹر غیاث الدین جانباز کی معرفت موصول ہوئی ہے جنہیں مس بے نظیر نے اس سلسلے میں ''مڈل مین'' کے فرائض ادا کرنے کی ہدایت کی ہے۔ جانباز صاحب نے ہمارے رپورٹر کو بتایا کہ یہ ملاقات ۲۴/اکتوبر کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوگی جہاں مس صاحبہ پارٹی کی مزدور کسان ریلی میں شرکت کے لیے آ رہی ہیں۔ جناب جانباز نے ایک دلچسپ بات بھی کہی ہے اور وہ یہ کہ پیپلز پارٹی نے اپنے دورِ اقتدار میں بھی علمائے حق کا احترام کیا اور ان سے مشورے حاصل کیے لیکن مولانا کوثر نیازی نے علمائے کرام اور مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے مابین غلط فہمیاں پیدا کیں۔

اس ساری خبر میں ہمیں جس چیز نے کالم لکھنے کی تحریک دی، وہ مس بے نظیر کی علماء سے ملاقات نہیں بلکہ ''ترقی پسند علماء'' سے ملاقات ہے۔ چنانچہ ہم بہت بے تابی سے چوبیس اکتوبر کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس روز یہ فیصلہ ہوگا کہ علماء میں سے ترقی پسند

کون نہیں ہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ علماء کا اس دن رزلٹ نکلنا ہے جس کے نتیجے میں ہمیں پتہ چلے گا کہ کون فیل اور کون پاس ہوا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے کچھ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوں گے، کچھ کی سیکنڈ ڈویژن آئے گی اور کچھ تھرڈ ڈویژن حاصل کر سکیں گے۔ تاہم لگتا ہے کہ ان دنوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے کے سلسلے میں میرٹ کی سخت پابندی کے باوجود تھرڈ کلاس علماء کو بھی پیپلز پارٹی کی سیاسی یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا۔ کیونکہ نشستیں بہت ہیں اور اُمیدوار کم ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کہ دو تین مضمونوں میں فیل ہونے والوں کو بھی داخلہ مل جائے اور ان کو بھی جنہیں گیپ کی وجہ سے پہلے کہیں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ حتیٰ کہ ہمیں یقین ہے کہ نشستیں پوری کرنے کے لیے Age Relaxation ایسی بے ضابطگی بھی روا قرار دے دی جائے۔

ہمیں چونکہ یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی ہے، لہٰذا ہم اس سلسلے میں مس صاحبہ سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور اس کی صورت یہی ہے کہ ہم ترقی پسند علماء کی نشاندہی میں ان کی مدد کریں۔ ایک ترقی پسند عالم کا تعاون تو انہیں پہلے ہی حاصل ہے جو اتفاق سے ہمارے ہمسائے میں رہتے ہیں۔ ان کا نام مولوی ہدایت اللہ ہے اور چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ جبکہ ہمیں یقین ہے کہ ایک مولوی ہدایت اللہ سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ کئی مولوی ہدایت اللہ درکار ہیں۔ ہمارے ذہن میں مولانا کوثر نیازی کا نام آیا تھا جن کے ''ترقی پسند'' ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں مگر جانباز صاحب ؒ نے یہ کہہ کر پہلے ہی ان کا پتہ کاٹ دیا ہے کہ مولانا کوثر نیازی نے پیپلز پارٹی میں ہونے کے باوجود اس دور میں علمائے کرام اور ذوالفقار علی بھٹو کے مابین غلط فہمیاں پیدا کیں۔ ہم نے کالم کے آغاز میں اس الزام کو اس لیے دلچسپ قرار دیا تھا کہ اس دور کی پیپلز پارٹی کے پاس ایک ہی عالم تھا جس نے نہ صرف جیل کاٹی بلکہ محکمہ اوقاف کے کتنے ہی علماء کو پارٹی کے قریب کیا اور آج ان کی ان خدمات کا اعتراف کرنے کی بجائے انہی کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یعنی ؏

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بہرحال یہ پارٹی کا اندرونی معاملہ ہے اور یوں بھی اس وقت سنجیدگی سے ہم پیپلز پارٹی کے لیے چونکہ ترقی پسند علماء تلاش کر رہے ہیں، اس لیے موضوع سے نہیں ہٹنا چاہیے۔ حبیب جالب کا ایک شعر ہے ؎

دنیا کا جن کو درد ہے معدودے چند ہیں
باقی تمام اپنی ترقی پسند ہیں

سو ہمیں تو علماء میں سے شاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد بھی اگر ان کا گریڈ دیکھیں تو ترقی پسند لگتے ہیں۔ اسی طرح علامہ نصیر الاجتہادی کی ہم نے مجلسیں سنی ہیں۔ ہمیں تو وہ بھی بہت ترقی پسند لگتے ہیں۔ ان کے علاوہ ماشاء اللہ بے شمار مشائخ ہیں، ان سے ترقی کی بات کریں اور ترقی پسند علماء میں شمار کر لیں، انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر اس کے باوجود ترقی پسند علماء کم پڑ جائیں تو ''امروز'' میں مولانا اشفاق ہیں۔ وہ تو باقاعدہ انقلابی ہیں بلکہ ان کی تو داڑھی بھی چینی مسلمانوں جیسی ہے۔ سو ان سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کی شمولیت سے پارٹی میں چین نواز علماء کی نمائندگی بھی ہو جائے گی۔ اس کے باوجود اگر ''مولانا'' مظہر علی خاں کو اس پر اعتراض ہو کہ وہ روسی براڈ کے زیادہ دلدادہ ہیں اور ترقی پسند علماء کا کوٹہ پورا نہ ہو تو انہی دنوں ہمارے محبوب ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار اشفاق احمد نے تازہ تازہ داڑھی رکھی ہے۔ ان سے بات کر کے دیکھ لیں اور شدید ضرورت کی صورت میں ایک پیشکش خود ہماری طرف سے بھی ہے اور وہ یہ کہ ہم بذاتِ خود رضاکارانہ طور پر آئندہ الیکشن کے لیے تیار ہیں۔ الیکشن تک کی میعاد ہم نے اس لیے مقرر کی ہے کہ اس کے بعد پارٹی کی طرف سے داڑھی کی مدت میں توسیع نہیں ملے گی۔ بلکہ باقیوں کے ساتھ یہ بھی منڈوا دی جائے گی۔

چلیں ہم نے اپنی حد تک پیپلز پارٹی کا یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔ یعنی انشاء اللہ اب

انہیں ترقی پسند علماء کی ''توڑ'' محسوس نہیں ہوگی، البتہ پارٹی کے بہی خواہ کی حیثیت سے ہم ایک مشورہ مس بے نظیر کو دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ جہاں انہوں نے ترقی پسند علماء سے روابط استوار کرنے کا فیصلہ کیا ہے، وہاں دوسرے طبقوں کے ترقی پسندوں سے بھی ازسرنو وعدے وعید کریں کہ پہلے کی طرح اب بھی پارٹی کو ان کی شدید ضرورت ہے۔ مثلاً ترقی پسند سرمایہ داروں کے ساتھ بھی ان کی میٹنگ ہونی چاہیے اور یہ میاں نصیر اے شیخ کی معرفت ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ترقی پسند جاگیرداروں سے گفت وشنید کا آغاز بھی لندن والے طارق علی فیم مظہر علی خاں صاحب سے مایوس ہو چکے ہیں تو ڈاکٹر وزیر آغا سے کریں۔ آٹھ آدمیوں پر مشتمل پورا سرگودھا گروپ ان کے ساتھ ہو جائے گا۔ باقی جاگیردار ان کے پاس پہلے ہی وافر مقدار میں ہیں بلکہ ''سرپلس'' ہیں۔ ترقی پسند صحافیوں کے سلسلے میں عبداللہ ملک سے بات ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ میاں نصیر کے ساتھ نہ پہنچ جائیں۔ سو ہمیں اُمید ہے کہ مس بے نظیر ہمارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ترقی پسند علماء کے علاوہ ترقی پسند سرمایہ داروں، ترقی پسند جاگیرداروں اور صحافیوں سے بھی مذاکرات کریں گی تاکہ ان طبقوں کے کچھ لوگ اگر پارٹی میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں تو وہ اب شامل ہو جائیں۔ کیونکہ ترقی پسند علماء، ترقی پسند سرمایہ داروں، ترقی پسند جاگیرداروں اور صحافیوں کی زیادہ سے زیادہ شمولیت ہی کی صورت میں پیپلز پارٹی، پیپلز پارٹی کہلانے کی حق دار ہوسکتی ہے۔

✧ ✧ ✧

مڈ ٹرم ونٹر!

ہمارے ایک دوست ہیں، ان کی جب ضرورت نہ ہو تو وہ آن موجود ہوتے ہیں لیکن اگر کبھی سوئے اتفاق سے ان کی ضرورت پڑ جائے تو وہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ یہی حال موسم سرما کا ہے۔ ہمیں ان دنوں اس کی سخت ضرورت ہے کہ مہینہ پہلے ایک گرم سوٹ سلوا چکے ہیں مگر سردیاں ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اسی دوران ہم نے دو تین دفعہ ''اجتہاد'' سے کام لینے کی کوشش کی۔ مگر ان تمام لوگوں نے اسے ''بدعت'' قرار دے کر ہمارے ارادوں پر پانی پھیر دیا، جن کے پاس سوٹ نہیں ہیں۔ مثلاً چند روز پیشتر ٹھیک ٹھاک بارش ہوئی۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور سوٹ پہن کر گھر سے نکلے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ حاسدین نے فقرے کسنے شروع کر دیے۔ اسی طرح چند روز پیشتر ذرا ہوا چلنے پر ہم نے ایک دفعہ پھر یہ سوٹ نکالا۔ ہمیں دوپہر کو تھوڑی بہت گرمی تو محسوس ہوئی، پسینے کے کچھ قطرے بھی پیشانی پر نمودار ہوئے مگر اس کے لیے ہم نے جیب میں رومال رکھا ہوا تھا چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم پسینہ پونچھ لیتے تھے۔ اب اگر دیکھا جائے تو سوٹ پہننے کے جملہ نتائج خود ہم بھگت رہے تھے۔ یعنی ہم اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔ کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ مگر یہاں بھی یار لوگ خبث باطن کے اظہار سے باز نہیں آئے اور کچھ ایسی نازیبا باتیں کہیں کہ پیشانی پر نمودار ہونے والے قطروں کے پونچھنے کے لیے رومال کافی نہ رہا کہ اب یہ قطرے عرق ندامت کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ سو ہم نے آئندہ کئی روز تک اس سوٹ کو گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیا۔ انہی دنوں

اپر کلاس سوسائٹی کے ایک ڈنر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ بہترین موقع تھا کہ سوٹ کو ''اظہارِ خیال'' کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایک دفعہ پھر یہ سوٹ زیب تن کیا مگر معلوم ہوا کہ اب خاندانی لوگ بھی کمی کمینوں کی طرح شلوار، کرتہ اور جیکٹ استعمال کرنے لگے ہیں، چنانچہ انہوں نے بھی ہمیں اس حلیے میں دیکھ کر ناک بھوں چڑھایا۔ البتہ ایک نجیب الطرفین بزرگ نے ہمیں سراہتی نظروں سے دیکھا۔ سوٹ کو ٹٹولا، سلائی کی تعریف کی۔ البتہ ایک مشورہ دیا کہ برخوردار! شام کے وقت نیلے رنگ کا سوٹ پہنتے ہیں، تم سرخ رنگ کا تو اس طرح پہن کر آئے ہو جیسے یہاں بل فائٹنگ کے لیے آئے تھے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہماری طرف دیکھا تو ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ آج تک وہ بل (Bull) کا ذکر یوں ہی کرتے آئے ہیں۔ ہمارے غیض وغضب سے بھرے ہوئے چہرے کی صورت میں بل انہوں نے آج پہلی دفعہ دیکھا ہے۔

ان پے درپے ناکامیوں کا سامنا کرنے کے بعد اب ہماری جملہ توقعات ۱۵/اکتوبر سے وابستہ تھیں۔ کیونکہ انگریز کے دور میں ۱۵/اکتوبر سے سرکاری دفتروں میں پنکھے بند کر دیے جاتے تھے اور یوں موسم سرما کو اس تاریخ سے باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ انگریز سے آزادی کے بعد بھی ہمارے ہاں تمام کام انگریز کے بنائے ہوئے ضابطوں کے عین مطابق انجام پا رہے ہیں۔ لہٰذا موسم کے سلسلے میں بھی انگریز بہادر کا حکم چلے گا۔ مگر ہم بھول گئے ہیں کہ موسموں پر اختیار تو انگریز کو خود اپنے ملک میں بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ۱۵/اکتوبر بھی گزر گیا ہے۔ بلکہ جنوری شروع ہو چکا ہے مگر دیسی لوگ ابھی تک وہی ملبوسات پہنے پھر رہے ہیں، جو ہماری قوم کو ترقی نہیں کرنے دیتے۔ اگر آپ کو ہمارے اس بیان پر شبہ ہو تو انگریز کے زمانے کے کسی بھی خانسامے یا خان بہادر سے بات کر کے دیکھ لیں۔ وہ آپ کو انگریزی دور کی برکات گنوائے گا اور ان کی ترقی کے مظاہر میں سے وہ سب سے زیادہ مرعوب ان کے کوٹ پتلون سے ہوگا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس ''خاندان'' کے لوگ نیکر میں ملبوس

اپنے گورے چٹے بچے کو پیار سے ہوا میں اُچھالتے ہوئے یہی کہتے ہیں ''آہا جی، میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔''

سوٹ کے سلسلے میں ایک اہم بات تو ہم آپ کو بتانا بھول ہی گئے اور وہ یہ کہ اس کا کپڑا ہمارے انکل نے ایڈنبرا سے بھیجا تھا بلکہ یہ پیس انہوں نے خود بن کر بھیجا ہے، جس کا اندازہ بنت کی صفائی سے ہوتا ہے، حاسدین نے ہماری اس بات کو بھی غلط رنگ دیا اور انکل کے پروفیشن کے بارے میں عجیب وغریب اندازے لگائے۔ حالانکہ وہاں کپڑا کھڈیوں پر نہیں، مشینوں پر تیار کیا جاتا ہے۔ ابھی تو ہم نے اپنے ان جوتوں کو ہوا نہیں لگنے دی، جو ہمارے برادران لاء نے ہمیں ارسال کیا ہے کہ کہیں احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگ اسے بھی نیا رنگ دیں اور یوں ہمیں اپنی معاشرتی سطح پر کھینچ لائیں۔

بہرحال، سردیوں کا جتنا انتظار کرنا تھا، وہ ہم نے کرلیا۔ سوٹ کے سلسلے میں جتنے مہنے ہم نے سننے تھے، وہ سن لیے۔ اب ہم میں انتظار کی مزید تاب نہیں رہی۔ اب تو ہمیں سوٹ پہننے کے لیے اگر کوئی تحریک بھی چلانا پڑی، تو چلائیں گے اور اس ضمن میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ بلکہ ہمارے آٹھ دوست اور بھی ہیں جو اس خیال سے کئی ماہ پہلے سوٹ سلوا چکے تھے کہ اب سردیاں بس آنے ہی والی ہیں۔ نوویں ہم خود ہیں۔ چنانچہ ہمارا ارادہ نو جماعتوں پر مشتمل ایک اتحاد بنانے کا ہے جس کا مطالبہ یہ ہوگا کہ ہم سوٹ پہننے کے لیے سردیوں کا انتظار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ''مڈ ٹرم ونٹر'' والا مطالبہ تسلیم کر کے ''قوم'' کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کی جائے۔ اس کالم کے ساتھ ہی ہم نے تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ اگر کوئی اور بھائی بھی پیش از وقت سوٹ یا گرم شیروانی سلوا چکا ہو تو وہ پیش از وقت موسم سرما کے اعلان تحریک میں اپنے قائد کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ ہمارے دروازے تمام مکاتب فکر کے لوگوں کے لیے کھلے ہیں۔

✧ ~~~ ✧ ~~~ ✧

افطاری، سحری اور عید کارڈ

ماہ رمضان گزرنے کو ہے۔ مگر اس بار ہم افطاریوں کے ثواب سے محروم ہی ہیں۔ اللہ جانے لوگوں کو کیا ہوا کہ اس بار یہ فریضہ ہی بھول گئے یا شاید وہ ہمیں بھول گئے ہیں۔ ایک افطاری ہم نے اسلام آباد میں سی ڈی اے والوں کی کھائی۔ دوسری حلقہ ارباب ذوق و چائنیز لاہور کی تھی جو ان کے ہفتہ وار اجلاس کے دوران ''منعقد'' ہوئی۔ تیسری پارٹی جلیل نقوی کی طرف سے تھی۔ چوتھی، پانچویں، چھٹی قصہ مختصر بس یہی کوئی آٹھ دس افطاریاں اور تھیں لیکن یہ کوئی بات تو نہ ہوئی کہ روزے انتیس ہوں اور ان میں سے بیشتر اپنے گھر افطار کرنے پڑیں۔ یہی گلہ ہمارے دوست چودھری اللہ وسایا کو بھی ہے بلکہ انہیں تو ٹیلی ویژن والوں سے بھی گلہ ہے کہ وہ روزانہ افطاری کے وقت مختلف مساجد میں روزہ داروں میں افطاری تقسیم ہوتے دکھاتے ہیں لیکن اپنے دیگر پروگراموں کی طرح اس پروگرام کا پیشگی ''ٹیلپ'' نہیں دکھاتے کہ کل فلاں مسجد میں تسلی بخش افطاری کا پروگرام ہے۔ اگر ٹی والے انہیں بروقت مطلع کر دیتے تو اس میں ان کا کیا جانا تھا۔ بلکہ اس روز متعلقہ مسجد میں افطاری کرانے والی مخیر شخصیت کو چودھری اللہ وسایا کی موجودگی کی صورت میں اکٹھے آٹھ دس روزہ داروں کی افطاری کا ثواب مل جاتا۔ ایک شخص گزشتہ روز یہ سوچ کر آنسو بہا رہا تھا کہ ماہ رمضان اب گزرنے کو ہے۔ خدا جانے یہ ہم سے خوش بھی جا رہا ہے کہ نہیں؟ اس پر مجلس میں موجود ایک شخص نے کہا کہ بے فکر رہو ماہ رمضان خوش ہی جا رہا ہے۔ اس شخص نے پوچھا تم یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ

رہے ہو؟ اس نے کہا وہ اس طرح کہ اگر خوش نہ جاتا تو ہر سال اتنی باقاعدگی سے آتا۔ سو ماہ رمضان خوش جا رہا ہے۔ انشاء اللہ اگلے برس بھی آئے گا۔ لہٰذا ٹی وی والوں کو چودھری اللہ دسایا کی فرمائش ابھی سے نوٹ کر لینی چاہیے۔

اس بار ایک گلہ ہمیں سحری کے وقت ڈھول بجا کر جگانے والوں سے بھی ہے۔ ہم ان کی سن لیتے تھے لیکن وہ ہماری نہیں سنتے تھے۔ رات کو دو بجے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر وہ ڈھول بجانا شروع کرتے اور بجاتے چلے جاتے۔ اہل خانہ ان کی تسلی کے لیے کمروں کی بتیاں روشن کرتے لیکن وہ ڈھول بجانے میں مشغول رہتے۔ پھر ان کی مزید تسلی کے لیے گھر کے باہر کی بتیاں بھی روشن کر دی جاتیں لیکن وہ اسی طرح ڈھول بجانے پر تلے رہتے۔ اس کے بعد کھنگورے وغیرہ مار کر انہیں اپنے جاگنے کا یقین دلایا جاتا پر وہ نہ ٹلتے۔ ان کا تقاضا غالباً یہ تھا کہ ڈھول کی تال پر اہل محلّہ گھروں سے نکلیں اور ''سر بازاری رقصم'' کا ایمان افروز مظاہرہ کریں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ ان دنوں فوٹو گرافر کی موجودگی کے بغیر جذب و مستی کا یہ مظاہرہ معیوب سمجھا جاتا ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ ہم روزہ داران کے بہت ممنون ہیں اور بہت بے چینی سے عید کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر رات کے دو بجے سے صبح کے سوا تین بجے تک یہ ڈھول بجانے والے ان سے عیدی لینے آئیں گے۔

تاہم ایک طبقہ جس سے ہم بہت خوش ہیں۔ وہ عید کارڈ بھیجنے والوں کا ہے۔ ماہ رمضان کے اس آخری ہفتے میں ہم نے کیسے کیسے عید کارڈ وصول کیے ہیں۔ بڑے بڑے عید کارڈ، جنہیں لیٹر بکس میں ڈالنے اور پھر اس میں سے نکالنے کے لیے تربیت یافتہ چھاپہ ماروں کی خدمات حاصل کرنا پڑی ہوں گی اور چھوٹے چھوٹے عید کارڈ، جنہیں بڑے بڑے کارڈوں تلے دبے ہونے کی وجہ سے ڈاک خانے والوں کو انہیں مصنوعی

آکسیجن فراہم کرنا پڑی ہوگی۔ تاہم ذاتی طور پر ہمیں یہ ننھے منے کارڈ پسند ہیں۔ لگتا ہے عید کارڈوں کے بچے نکلوائے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے عید کارڈ بھی، جنہیں دیکھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور ایسے بھی جن سے روزہ مکروہ بلکہ ساقط ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کچھ عید کارڈ ایسے بھی ملے جو' صاحب نے سلام بھیجا ہے'' قسم کے تھے اور کچھ ایسے بھی جن پر فوراً ''وعلیکم السلام'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بعض عید کارڈ تو ایسے تھے جیسے بجلی یا سوئی گیس کے بل ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے جواب میں اگر فوراً ادائیگی نہ کی گئی تو ''خیر سگالی'' کی یہ ''کمرشل سپلائی'' بند ہو جائے گی۔ ہمیں تو وہ عید کارڈ ہی اچھے لگے جو مختلف سرکاری و نیم سرکاری اور نجی اداروں کے پبلک ریلیشن کے شعبوں کی طرف سے موصول ہوئے کہ اگر یہ موصول نہ ہوں تو انسان کی اوقات کا پتہ چل جاتا ہے۔ یعنی اسے جان لیوا احساس ہوتا ہے کہ اب پبلک ریلیشنگ والوں کو بھی اس سے پبلک ریلیشنگ کی ضرورت نہیں رہی!

نوالہ اور پیالہ!

ان دنوں جو روزے ہیں، وہ روزے نہیں ''روز حساب'' ہیں مگر جنہوں نے رکھنے ہیں، وہ ان کو برساتی دو پہروں میں بھی رکھتے ہیں اور جو ''مسافر'' یا ''بیمار'' روزے نہیں رکھتے، ان کا بھی روزہ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ پورے شہر میں گھوم جاؤ، کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ البتہ کچھ روزے دار ایسے ہیں جو پانچ بجے کے بعد ہر ایک کو کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اس دفعہ شہر میں حرمت رمضان کا بہت پاس کیا جا رہا ہے۔ مجال ہے کوئی شخص سر عام کھاتا پیتا نظر آ جائے۔ البتہ ہم نے گزشتہ روز ایک گھوڑے کو کارپوریشن کے چو بچے سے پانی پیتے دیکھا لیکن اس مخلوق سے کیا گلہ اسے تو جینا ہی نہیں ہے۔

ایک مخلوق اور بھی ہے جس سے آج ہی ہمارا واسطہ پڑا اور اتفاق سے یہ ہمارا دوست ہی ہے۔ موصوف چہرے سے بہت فریش لگ رہے تھے۔ دور دور تک روزے کا نام و نشان نہ تھا۔ ہم نے کہا کیا بات ہے تم روزے نہیں رکھ رہے؟ بولے ''جمعے کا رکھا تھا''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ سارا دن بے سدھ پڑا رہا۔ اپنی جگہ سے ہلا نہیں جاتا تھا۔ افطاری کے وقت گھر والوں نے مجھے پکڑ کر اُٹھایا، اٹھا کر بٹھایا اور بٹھا کر کھانا کھلایا۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ کھانے کے بعد میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس نماز کے دوران اپنی زندگی کے طویل ترین سجدے کیے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ سجدے سے اُٹھا ہی نہیں جاتا تھا''

''اس کے بعد تم نے روزہ نہیں رکھا؟''

''ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے، چنانچہ اب روزانہ غرباء و مساکین کو کھانا کھلاتا ہوں۔ تم بھی آج شام کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ!''

ادھر افطار پارٹیوں کا سلسلہ بھی زوروں پر ہے اور ان افطار پارٹیوں میں روزہ رکھنے والی اور روزہ افطار کرنے والی دونوں پارٹیاں شریک ہوتی ہیں۔ ان پارٹیوں میں ''فریقین'' کے نمائندوں سے ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے اور ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ ان میں سے روزہ دار کون ہے اور روزہ دار کون نہیں ہے۔ کیونکہ روزہ دار کی جو نشانیاں ہیں، وہ سب کی سب ان روزہ خوروں نے بھی اپنے چہرے پر سجائی ہوتی ہیں۔ مجال ہے اپنی کسی حرکت سے اخفائے راز ہونے دیں۔ مثلاً دسترخوان پر انواع و اقسام کی نعمتیں سجی ہوتی ہیں مگر یہ آنکھ اُٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتے۔ بلکہ کھجوروں کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور دعا پڑھتے ہوئے کھجور کا ایک دانہ منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد شربت کے جگ کی طرف کچھ اس خضوع و خشوع سے ہاتھ بڑھاتے ہیں کہ ؎

''جگ'' میں آ کر ادھر ادھر دیکھا

والا مصرعہ خواہ مخواہ یاد آنے لگتا ہے اور پھر جب گلاس منہ کو لگاتے ہیں تو پہلا گھونٹ پینے کے بعد ان کے چہرے پر جو تاثرات اُبھرتے ہیں تو بس یوں لگتا ہے کہ سارے دن کی پیاس کے بعد پانی کا یہ پہلا قطرہ ہے جو ان کے حلق میں اُترا ہے۔ اللہ اللہ! کیسے کیسے فنکار ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مگر ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ ان میں سے قدر صرف ان کی ہے جو سیاست میں چلے جاتے ہیں کہ ان کے اصل جوہر تو دراصل وہیں کھلتے

ہیں۔ ہمارے ایک دوست سیاست دان کی تمام کامیابیوں کا راز سال ہا سال تک افطار پارٹیوں میں شمولیت اور ان میں بطور روزہ دار اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے میں مضمر تھا۔ یہ ریاضت سیاست میں ان کے کام آئی۔ چنانچہ جب وہ اپنے انتخابی دورے کے دوران غریب عوام کے درمیان ہوتے اور اپنے ان ووٹروں کے گھر جا کر ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک پلیٹ میں روکھی سوکھی کھاتے تو پہلا نوالہ حلق سے اُترنے کے بعد ان کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگتا جیسے کئی دنوں کے فاقے کے بعد یہ پہلا نوالہ ہے جو ان کے حلق میں اُترا ہے۔ اس کے بعد وہ مٹی کے پیالے میں پانی پیتے اور تاثر یہ دیتے کہ ؏

جامِ جم سے یہ ''تیرا'' جام سفال اچھا ہے

اور ان کا یہ تاثر ایک لحاظ سے ٹھیک بھی ہوتا ہے کیونکہ جس کلاس سے ان کا تعلق تھا اور جو لوگ ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، وہاں ایسا نوالہ انہیں کہاں نصیب ہوتا تھا اور وہاں ایسا پیالہ انہیں دیکھنے کو بھی کہاں ملتا تھا؟

کس کو کہہ رہے ہو؟

امجد اسلام امجد کی ڈرامہ سیریز ''سمندر'' میں ایک کردار ''گلو بادشاہ'' کا بھی ہے جو عابد کاشمیری ادا کر رہے ہیں۔ اس گلو بادشاہ کا تکیہ کلام ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' عوام الناس میں کس قدر مقبول ہے اس کا اندازہ اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق لاہور کے لنڈے بازار میں ایسے طوطے بکثرت فروخت ہو رہے ہیں جو گاہک سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' اور محض اپنے اس ڈائیلاگ کی وجہ سے یہ طوطے تین سو روپے تک میں فروخت ہوتے ہیں جب کہ عام حالات میں ان کی قیمت دس روپے سے زیادہ نہیں۔

یہ خبر پڑھ کر اصولاً ہمیں بھی چونکنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمارے جن دوستوں نے یہ خبر پڑھی وہ بہت حیران ہوئے کہ محض ایک ڈائیلاگ یعنی ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' کی بنا پر ان طوطوں کے ''درجات'' اتنے بلند ہو گئے کہ ان کی قیمت تین سو روپے تک پہنچ گئی؟ مگر سچ پوچھیں تو ہمیں یہ خبر پڑھ کر قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ایسے طوطے پہلے سے موجود ہیں، جن کے پاس عوام اپنے مسائل لے کر جاتے ہیں تو وہ بھی آگے سے ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' کہتے ہیں اور صرف اس ڈائیلاگ کے صدقے میں انہیں ہزاروں روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور وہ اُونچے گریڈوں پر فائز ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ ڈائیلاگ ہم آج سے نہیں، برسوں سے سن رہے ہیں اور رنگ برنگے طوطوں سے سن رہے ہیں۔ مثلاً

ہمارے ہاں جو سیاسی طوطے ہیں، وہ صاحبان اقتدار کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' اور پھر ان طوطوں کی قیمت میں بیٹھے بٹھائے کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خاموش رہنے والے طوطوں کی نسبت بولنے والے طوطوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بولنے والے طوطے اپنی منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں۔

اور یہ جو بولنے والے طوطے ہیں یہ اتنے بے وقوف نہیں کہ موقع محل دیکھے بغیر اور مخاطب کو پہچانے بغیر یونہی ہر ایک کو ''ٹرّی'' لگا دیں۔ ایوب خان ایک ذمہ دار فوجی افسر کے طور پر ملکی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جن کے آگے وہ جواب دہ ہیں، وہ خود ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں، تو انہوں نے ان سب کو آنکھیں دکھائیں۔ جب انہوں نے آگے سے بولنے کی کوشش کی تو ایوب خان نے ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' کہا اور پورے پاکستان پر قابض ہو گئے۔ جب ایوب خان کمزور ہوئے تو بھٹو نے ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' نعرہ لگایا اور یحییٰ خاں کے بعد بچے کھچے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر ایک وقت آیا کہ یہی ڈائیلاگ خود انہیں بھی سننا پڑا۔ سو یہ ڈائیلاگ اگر عوام میں مقبول ہے تو یونہی مقبول نہیں۔ عوام سال ہا سال سے اس ڈائیلاگ کے کرشمے دیکھ رہے ہیں اور وہ یوں اس کے قائل ایک ''گلو بادشاہ'' کی وجہ سے نہیں، کئی ''گلو بادشاہوں'' کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

ویسے آپس کی بات ہے کبھی کبھی یہ تکیہ کلام بہت مہنگا بھی پڑتا ہے۔ یعنی ہمارے طوطے رواداری میں یہ جملہ بھی اپنے آقاؤں کے آقاؤں کو بھی کہہ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں فوری طور پر ان کی گردن مروڑ دی جاتی ہے۔ افغانستان میں نور محمد ترکئی نے سردار داؤد کو اس تکیہ کلام سے گھائل کر لیا مگر کسی موقع پر اپنے آقائے ولی نعمت روس کے سامنے ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' کے الفاظ ان کے منہ سے نکل گئے جس کے نتیجے میں اس

کی گردن مروڑ دی گئی اور حفیظ اللہ امین نے اس کی جگہ سنبھالی۔ غلطی سے اس نے بھی کسی موقع پر ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' کہہ دیا۔ چنانچہ اس کی جگہ ببرک کارمل نے لے لی اور صرف افغانستان ہی کیا، دنیا میں جہاں جہاں بڑی طاقتوں کو ''ہارڈ اینڈ فائر'' کے اختیارات حاصل ہیں، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ بقول ندیم ؏

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

سو وہ طوطے جن کا تکیہ کلام ہے ''کس کو کہہ رہے ہو؟'' آج بے شک لنڈے بازار میں دس روپے کی بجائے تین سو روپے میں فروخت ہو رہے ہیں تاہم انہیں اپنا یہ تکیہ کلام سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے اور اس پر زیادہ تکیہ بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک شاعر نے کہا ہے:

جن پر ''تکیہ'' تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

امریکہ صاحب بہادر!

بہت دنوں سے ذہن پر ایک بوجھ تھا، وہ گزشتہ روز اخبار پڑھ کر ہلکا ہوا ہے۔ بوجھ یہ تھا کہ مشکل وقت میں پاکستان کی مدد کون کرے گا۔ روس پاکستان کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ بھارت کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں، افغانستان چاقو چھریاں تیز کر رہا ہے، چین ہمارا بہت پیارا دوست ہے، مگر وہ فی الحال اس پوزیشن میں نہیں کہ بروقت بھرپور طور پر آگے بڑھے اور پاکستان کی مشکلات کم کرنے میں مدد دے، چنانچہ یہ خیال رہ رہ کر ہمیں تنگ کر رہا تھا کہ ان حالات میں ہمارے ساتھ صف اعداء کے سامنے کون کھڑا ہوگا بس اسی پریشانی کے عالم میں ہم نے صبح صبح اخبار کھولا اور شہ سرخی دیکھ کر طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔ یہ شہ سرخی امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مسٹر شیفر کے اس بیان پر مشتمل تھی کہ امریکہ پاکستان کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ کرے گا۔ سو اس وقت سے ہم نے اپنے ذہن میں سارے خدشے جھٹک دیے ہیں، کیونکہ امریکہ کی اجازت سے تو حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں، دنیا کے بہت سے ملکوں کے حکمران اپنی ''نوکریوں'' کی Extension کے لیے امریکہ ہی کو اپلائی کرتے ہیں۔ اگر وہاں سے توسیع مل جائے تو ان کا لہجہ بدل جاتا ہے اور اگر نہ ملے تو بھی بدل جاتا ہے۔

دراصل اس وقت دنیا دو علاقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک علاقے کا بدمعاش روس اور دوسرے علاقے کا بدمعاش امریکہ ہے۔ روس ذرا ''شیدا پستول'' قسم کا بدمعاش ہے۔ بھرے بازار میں کھلم کھلا فائرنگ کرتا اور بڑھکیں مارتا رہتا ہے، جبکہ امریکہ

''شریف بدمعاش'' قسم کی چیز ہے۔ وہ ان ''معززین'' میں سے ہے جو محلے کی ''انجمن اصلاح معاشرہ'' کے چیئرمین بھی ہوتے ہیں اور اپنی بیٹھک میں جوا بھی کھلواتے ہیں، منشیات بھی فروخت کرتے ہیں، ڈاکے بھی ڈلواتے ہیں اور بوقت ضرورت قتل بھی کروا دیتے ہیں، تاہم یہ دونوں اصل میں ایک ہوتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں باہمی مشورے سے کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے علاقے میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتے اور ان تمام خرابیوں کے باوجود ان میں ایک خوبی بھی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ قول کے پکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ کرلیں نبھاتے ہیں، چنانچہ امریکہ نے پاکستان کی سلامتی اور تحفظ کی یقین دہانی کرائی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ بہرحال اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔

مگر ہمارا ایک دوست ہے جو اتنا شکی ہے کہ اسے ''شکی القلب'' کہا جا سکتا ہے اور وہ اس قسم کی یقین دہانیوں کو نہیں مانتا۔ چنانچہ وہ ہمارے حوصلے پست کرنے میں لگا رہتا ہے اور اپنی گفتگو کا نچوڑ اس ایک فقرے میں بیان کرتا ہے کہ جس نے امریکہ کے ساتھ یاریاں لگائیں، وہ سر پر ہتھ رکھ کر رویا۔ تاہم ان تمام حوصلہ شکن باتوں کے باوجود ہمیں امریکہ کی دوستی پر اعتماد ہے کیونکہ فارسی کا ایک شعر ہے ؎

دوست آں باشد کہ گیرو دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی!

اور یہ بات تو ہمارا دوست بھی مانتا ہے کہ جب بھی امریکہ کا کوئی دوست پریشان حالی و درماندگی کا شکار ہوا اور اس کے مخالف نے اسے زدوکوب کرنا شروع کیا تو امریکہ نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کا ہاتھ تھام لیا، جس کے نتیجے میں گو اس دوست کے ہاتھ بندھ گئے اور اسے دو چار جھانپڑ مزید کھانا پڑ گئے، مگر امریکہ نے اس عالم میں دوست کا ہاتھ پکڑنے کا حق ادا کر دیا۔

اور اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو ہمارا یہ ''شکی القلب'' دوست بھی تسلیم کرتا ہے اور وہ یہ کہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، انہیں کبھی سلام کرو تو ناراض ہو

کر بال بچے کولہو میں پسوا دیتے ہیں اور اگر کبھی گالی دو تو خوش ہو کر ہاتھی انعام میں دیتے ہیں، چنانچہ امریکہ بہادر کا معاملہ بھی یہی ہے۔ پاکستان کے حکمران صاحب بہادر کو فرشی سلام کرتے آئے ہیں اور یہ سلام گزشتہ ۳۵ برس میں اتنے تواتر سے کیے ہیں کہ کمر دوہری ہوگئی ہے مگر صاحب کا دل نہیں پسیجتا، البتہ جب کبھی غالب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے یعنی ؎

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

کے مصداق صاحب بہادر کا دامن ذرا حریفانہ انداز میں کھینچا ہے تو اس نے خوش ہو کر ہمیں ایسے ایسے ہاتھی دیے ہیں کہ ہمارا ''بجٹ'' مثالی ہو گیا ہے۔ البتہ بھارت ماتا کا مسئلہ قدرے مختلف ہے۔ وہ خلوت میں صاحب بہادر کو مجرا بجا لاتی ہے اور جلوت میں آنکھیں دکھاتی ہے اور صاحب بہادر کو بھارت کا یہی انداز محبوبی پسند ہے۔ چنانچہ وہ اس ''ہندو'' کے ایک خال پر سمرقند و بخارا قربان کر سکتا ہے۔

تاہم یہ سب باتیں فروعی ہیں۔ اصل بات وہی ہے جو ہم نے کالم کے آغاز میں بیان کی ہے، یعنی امریکہ بہر حال یاروں کا یار ہے۔ عرب ممالک میں امریکہ کے جو دوست ہیں وہ امریکہ کی دوستی کا میٹھا پھل کئی بار کھا چکے ہیں بلکہ خود ہمیں بھی اس کا بہت اچھی طرح تجربہ ہے۔ مشرقی پاکستان میں جب روس اور بھارت نے ہمارا گھیراؤ کر رکھا تھا، امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ ہماری مدد کے لیے ہر وقت تیار کھڑا رہتا تھا۔ وہ تو آخری وقت میں اس کے جوڑوں میں درد شروع ہوگئی ورنہ کس کی مجال تھی کہ وہ امریکہ کی موجودگی میں ہماری سلامتی کو پارہ پارہ کرنے کی جرات کرتا، سو اگر آج ایک بار پھر امریکہ نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کی آزادی اور سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی، تو ہمیں اپنے اس دوست کی بات پر یقین کرنا چاہیے اور پوری طرح مطمئن ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا چاہیے اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے اپنے لوگوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سائیں کوڈے شاہ

یہ حقیر پر تقصیر، سائیں کوڈے شاہ صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہے۔ سائیں جی بہت شفیق ہیں اور یوں ان کے در سے بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں فیض پاتے ہیں۔ میں گزشتہ روز جب سائیں جی کے تکیے پر حاضر ہوا تو اس وقت کے ان کے پاس دوسرے لوگوں کے علاوہ ملک کے ممتاز رسہ گیر چودھری اللہ وسایہ سابق ایم این اے بھی مودب بیٹھے تھے۔ چودھری اللہ وسایا نے عرض کی سائیں جی! جنرل ضیاء الحق نے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی ہیں اور یوں ہم منتخب "نمائندوں" کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ سائیں جی نے چودھری اللہ وسایا کو دلاسا دیا اور کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، صبر کرو، کچھ نہیں ہوگا۔ چودھری اللہ وسایا نے رونی آواز میں کہا سائیں جی! مجھے جان کے لالے پڑے ہیں، گزشتہ تین سال میں بنائے گئے اثاثوں کی تحقیق ہو رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ سن کر سائیں جی کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا اور بولے چودھری تم بڑبولے تو نہیں ہو؟ چودھری صاحب نے کہا نہیں سائیں جی، میں تو اپنی زبان پولیس کے سامنے بھی بند رکھتا ہوں۔ اس پر سائیں جی نے فرمایا، پھر تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، جو بولتا ہے، وہ نقصان اٹھاتا ہے، جو زبان بند رکھتا ہے، اسے اس کا پھل ملتا ہے۔ تم جا کر شیروانی سلواؤ ہمیں بشارت ہوئی ہے کہ تمہیں نگران حکومت میں وزیر بنایا جائے گا۔

ایک عقیدتمند نے عرض کی، سائیں جی جنرل ضیاء نے منتخب حکومت کے خاتمے کا

جواز یہ پیش کیا ہے کہ یہ کرپٹ لوگوں کی سرپرستی کرتی تھی اور نفاذِ اسلام کے سلسلے میں روڑے اٹکاتی تھی، چنانچہ اب انہوں نے کرپشن کے خاتمے اور نفاذ اسلام کے وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کیا ہے، لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جنرل صاحب اتنے دیانت دار، نیک نام اور اسلام دوست لوگ کہاں سے لائیں گے جو ان کے اس مشن کو پورا کر سکیں؟ اس پر سائیں جی نے فرمایا، اتنی مایوسی کی کوئی بات نہیں، ابھی ملک میں ایسے نیک نام لوگ موجود ہیں جو کرپشن کے خاتمے اور نفاذ اسلام کے ضمن میں جنرل صاحب کے دست و بازو بن سکتے ہیں چنانچہ صوبہ سرحد میں جنرل فضل حق کو صوبائی حکومت کا نگران وزیر اعلیٰ بنایا گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جنرل ضیاء الحق صاحب کی نگاہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مزید ایسے موزوں افراد ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

ایک عقیدت مند نے کہا سائیں جی! صدر صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ الیکشن نوے دنوں کے اندر کرائے جائیں گے، کیا واقعی ایسا ہوگا؟ سائیں جی نے یہ سن کر اپنی آنکھیں بند کیں اور مراقبے میں چلے گئے، تھوڑی دیر بعد انہوں نے سر اُوپر اُٹھایا اور فرمایا ''اللہ نے چاہا تو الیکشن ٹھیک نوے دن بعد ہوں گے لیکن یہ نوے دن جس روز اسلام نافذ ہوگا اس کے بعد سے شروع ہوں گے۔''

محفل میں موجود ایک ارادت مند نے اخبارات کا بنڈل سائیں جی کی طرف بڑھایا اور صفحہ اوّل پر شائع شدہ ایک اشتہار کی طرف اشارہ کر کے کہا سائیں جی یہ اشتہار کراچی کی ایک ''نامی گرامی'' شخصیت فیض احمد صاحب نے چھپوایا ہے۔ اس میں سب سے اُوپر قرآن مجید کی ایک آیت لکھی ہے، نیچے ترجمہ ہے۔ ''ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' اور اس کے ساتھ جنرل ضیاء الحق کی تصویر لگا کر لکھا ہے ''جناب جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان! آپ نے ملک و ملت کی فلاح اور بہتری کے لیے جو قدم اُٹھایا ہے، ہم تہہ دل سے اس کی تائید کرتے ہیں!'' تو کیا جنرل صاحب اس شخص کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے جس نے انہیں خدا کا درجہ دے دیا

ہے؟ اس پر سائیں جی نے اس ارادت مند کو گھور کر دیکھا اور کہا، خدا کے بندوں کے بارے میں اتنی بدگمانی ٹھیک نہیں، اس آیت کا جنرل ضیاء الحق صاحب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ آیت موجودہ مشکل وقت کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور اس میں مخاطب اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اس بدگمانی کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو!

ایک مرید نے کہا، بہت سے سیاست دانوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنرل صاحب کی اس کارروائی سے خوش ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟ سائیں کوڈے شاہ نے فرمایا، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ سیاست دانوں اور ویگن ڈرائیوروں میں فرق ہوتا ہے۔ اگر پولیس کا جھگڑا کسی ایک ویگن ڈرائیور کے ساتھ ہو جائے تو سارے ویگن ڈرائیور متحد ہو جاتے ہیں کہ کل کلاں ان کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آ سکتا ہے جبکہ سیاست دان قوم کا ذہین ترین طبقہ ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی سوچ ویگن ڈرائیوروں کی طرح کی نہیں، بلکہ اس سے کہیں بلند ہے۔

محفل میں موجود ایک کالم نگار نے عرض کیا سائیں جی مجھے جنرل صاحب کے حالیہ اقدام سے سخت اختلاف ہے اور میں ملک وقوم کے مفاد میں اس مسئلے پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت خاموش رہنا ایک مجرمانہ نوعیت کا فعل ہے۔ سائیں جی نے فرمایا، زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جنرل صاحب نئے دور میں پہلے ایسے شفیق جرنیل ثابت نہیں ہوں گے بلکہ اس دفعہ وہ جمالی کی بجائے جلالی روپ میں سامنے آئیں گے، چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر میں تختہ دار کی بات بھی کی تھی۔ اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ ان کے منہ سے تختہ دار کی بجائے ''تختہ وار'' نکل گیا تھا تاہم تمہیں فی الحال خاموش رہنا چاہیے کیونکہ تلفظ کا فیصلے سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر حق گوئی کا زیادہ ہی شوق ہے تو یہ شوق ان کے جانے کے بعد پورا کر لینا۔

اس پر کالم نگار نے کچھ عرض کرنے کی کوشش کی مگر سائیں جی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا ''اب کسی کو سیاسی سوال

کرنے کی اجازت نہیں۔'' پھر محفل میں موجود غوثے میراثی سے کہا ''اوئے غوثے! ان دنیادار لوگوں نے ہمیں تھکا دیا ہے، ہم اب اپنے حجرے میں آرام کریں گے، ہمارے جانے سے پہلے کوئی لطیفہ سناؤ!'' اس پر غوثے میراثی نے یہ لطیفہ سنایا۔

''ایک کسان اپنے کھیت میں ہل جوت رہا تھا۔ ایک گیدڑ نے اسے دیکھا تو پوچھا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ کسان نے کہا میں خربوزے کی فصل کی تیاری کر رہا ہوں۔ گیدڑ نے کہا، جب خربوزوں کی فصل تیار ہوگی، میں فصل اُجاڑ دوں گا۔ کسان نے جواب دیا، میں کھیت کے گرد باڑ لگا دوں گا۔ گیدڑ بولا، میں باڑ کے نیچے سے اندر داخل ہو جاؤں گا! کسان نے کہا، میں فصل کے گرد دیوار کھڑی کر دوں گا۔ گیدڑ بولا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں دیوار کود کر اندر آ جاؤں گا اور فصل اُجاڑ دوں گا۔ کسان کچھ پریشان سا ہو گیا اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا، میں دیوار میں ایک دروازہ بناؤں گا اور دروازے کے باہر چارپائی پر بیٹھ کر میں خود کھیت کی حفاظت کروں گا۔ گیدڑ نے کہا، جب تم سو جاؤ گے میں اس وقت کھیت میں داخل ہو جاؤں گا اور تمہاری خربوزوں کی فصل تباہ کر دوں گا۔ اس پر کسان کو اچانک یاد آیا کہ گیدڑ کتے سے بہت ڈرتا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً کہا میں کھیت کی حفاظت کے لیے کتے پال لوں گا۔ یہ سن کر گیدڑ کا رنگ خوف سے متغیر ہو گیا اور اس نے کہا ''برادرم! یہ تو پھر مردوں والی بات نہ ہوئی!''

✧ ~~~ ✧ ~~~ ✧

انگریزی انگریزی کردی!

لوگ انگریزوں اور انگریزی کے بارے میں جو چاہے کہیں، مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمیں انگریز اور انگریزی دونوں سے بہت رغبت ہے، تاہم براہِ کرم ''انگریز'' اور ''انگریزی'' کو ''مذکر'' اور ''مونث'' کے معنوں میں نہ لیا جائے کیونکہ انگریز سے ہماری مراد مروجہ معنوں میں انگریز قوم اور انگریزی سے مراد خطہ انگلستان ودیگر ممالک میں بولی جانے والی انگریزی زبان ہے۔ اس ضمن میں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ انگریز اور انگریزی سے محبت کے معاملے میں ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ اس انجمن میں ہمارے رازداں اور بھی ہیں، چنانچہ ایک دفعہ ہم نے اپنے ایک ہم خیال دوست کو دیکھا کہ اس نے اپنا گورا چٹا بیٹا گود میں اُٹھایا ہوا ہے، اس کی بلائیں لے رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''آہا، میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے!'' ہمارے ہم خیال لوگوں میں صرف یہی دوست نہیں جنہیں اپنے بیٹے پر کسی انگریز کا بیٹا ہونے کا شبہ گزرا تھا، بلکہ انگریز کے زمانے کے خانسامے اور خان بہادر بھی ہماری ہی طرح انگریزی دور کے قصیدہ خواں ہیں۔ آپ ان سے بات کر کے دیکھیں، وہ انگریزی حکومت کی برکات اور اس کے فیوض پر کچھ یوں روشنی ڈالیں گے کہ انگریزی حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک پر خواہ مخواہ ندامت سی ہونے لگے گی۔ سبحان اللہ! کیا زمانہ تھا جب انگریز ڈپٹی کمشنر، جو انگلستان سے اپر ڈویژنل کلرک سے پروموٹ ہو کر ہندوستان میں ڈپٹی کمشنر بن کر آتے تھے، اُن کے حضور ہمارے وڈیرے ڈالیاں پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے اور قدم بوسی کی سعادت حاصل

کرنے کی صورت میں شاداں وفرحاں گھروں کو لوٹتے تھے۔ انگریز کے دربار میں کرسی ملنے پر مہینوں اس پر فخر وانبساط کا اظہار ہوتا تھا، الحمداللہ اپنے ان محسنوں کے احسانات کو یاد رکھنے والی نسل اور پھر ان کی اگلی نسل اس وقت ہمارے درمیان موجود ہے اور اتنے کروفر سے موجود ہے کہ آج ہم ان کی خدمت میں ڈالیاں پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور قدم بوسی کی سعادت حاصل ہونے پر شاداں وفرحاں گھروں کو لوٹتے ہیں۔

اور جہاں تک انگریزی زبان سے محبت کا تعلق ہے تو اس زبان کے کشتگان میں تو کشتگان قوم سے افسران قوم تک شامل ہیں۔ تبھی تو انگریز کے جانے کے بعد بھی دفتروں سے انگریزی نہیں گئی، دراصل اس زبان میں برکت بہت ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اُردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو میں بات کرتے ہوئے انسان کو کچھ گھٹیا سا لگتا ہے، لیکن جونہی وہ انگریزی میں گفتگو کا آغاز کرتا ہے، ایک دم سے ''اپ گریڈ'' ہو جاتا ہے۔ ہم نے بھی تو دیکھا ہے کہ جونہی کوئی شخص انگریزی بولنے والوں کی ''یونین'' میں شامل ہوا، اس کے درجات بلند ہو گئے، تاہم اس کے لیے صرف انگریزی بولنا کافی نہیں بلکہ اندر سے انگریز ہونا بھی ضروری ہے اور ''کالے لوگوں'' کو ایک فاصلے پر روکنا بنیادی شرط ہے۔

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ اگر ہم میں سے کوئی اپنی قوم یا مادری زبان میں گفتگو کرے تو اس کے بارے میں پہلا تاثر کچھ ٹھیک نہیں رہتا جبکہ انگریزی بولتے ہی اس کی ٹانگوں کے ساتھ لمبے لمبے بانس لگ جاتے ہیں اور وہ اتنا اُونچا نظر آنے لگتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کے سامنے جھکنے کو جی چاہتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کیونکہ بقول مرزا محمود سرحدی ؎

جھکنے والوں نے رفعتیں پا لیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

تاہم اُردو پر انگریزی کی ''فضیلت'' کا پوری طرح اندازہ لگانا ہو تو کبھی انگریزی اخبارات میں دانشوروں کے خوبصورت انگریزی میں لکھے ہوئے مضمون پڑھیں، محسوس ہوگا کہ کوئی شخص بلندی پر کھڑا ہو کر بات کر رہا ہے بلکہ بیشتر اوقات تو وہ اتنی بلندی پر کھڑے ہوتے ہیں کہ نیچے تک آواز ہی نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہی مضمون اُردو میں ترجمہ کر کے پڑھیں، تو یہ مضمون ٹکے کے نہیں لگیں گے۔ اب ظاہر ہے اس میں ان دانشوروں کا یا ان کی دانشوری کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو اس نیٹو (Native) زبان کا ہے جسے اُردو کہتے ہیں اور جسے لکھتے وقت کاتب حضرات بھی اس بے دلی سے لکھتے ہیں کہ نہ کہیں کوما اور نہ کہیں فل سٹاپ ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک انگریزی ہفت روزہ ''ویو پوائنٹ'' جو ہمارے پسندیدہ پرچوں میں سے ہے، اس میں فل سٹاپ اور کومیں اس ذمہ داری سے لگائے جاتے ہیں اور اس پرچے کی قیمت بھی اتنی کم ہے کہ بقول ہمارے دوست ظفر مرزا کے ؎

''کومیں'' فروختند و چہ ارزاں فروختند

والا مصرعہ یاد آ جاتا ہے۔

تاہم یہاں یہ وضاحت ایک دفعہ پھر ضروری ہے کہ انگریزی کے کشتگان میں صرف رہنمایانِ کرام اور افسرانِ عظام ہی شامل نہیں بلکہ معاملہ

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

والا ہے۔ چنانچہ ہم سب لوگ انگریزی سے اپنی محبت اور عقیدت کا عملی ثبوت پیش کرنے کے لیے اگر اور کچھ نہیں تو اپنی گفتگو میں انگریزی کا ایک آدھ جملہ بولنے کی کوشش ضرور

کرتے ہیں اور جنہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی، وہ اپنی خاموش محبت کا ثبوت کسی نہ کسی طور پر پیش ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ایک دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ انگریزی سے والہانہ محبت کے باوجود بدقسمتی سے اس زبان سے متعارف ہونے کی سعادت سے محروم رہے۔ مگر مجال ہے اپنی یہ محرومی کسی پر ظاہر ہونے دیں، چنانچہ جب کوئی انگریزی میں درخواست لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے، تو وہ درخواست ہاتھ میں پکڑتے ہیں، عینک لگاتے ہیں اور پانچ دس منٹ تک پوری توجہ سے اس کے نفس مضمون پر غور کرتے ہیں۔ بالاخر وہ درخواست میز پر رکھتے ہیں، عینک اُتارتے ہیں اور میز پر کہنیاں ٹکا کر درخواست گزار سے کہتے ہیں ''درخواست میں نے پڑھ لی ہے، اب تم مختصراً مجھے یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟''

✧ ✧ ✧

ڈیانا، چارلس اور ولیم

بہت دنوں سے طبیعت کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ صبح صبح اخباروں کا پلندہ بھی پڑھنے کو ملتا تھا، مگر سرسری طور پر دیکھ کر ہم یہ پلندہ پرے رکھ دیتے تھے اور طبیعت تھی کہ بحال نہیں ہوتی تھی۔ لگتا تھا زندگی میں کوئی خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ الحمداللہ آج پھر ہمارے چہرے پر رونق ہے اور وہ جو خلا تھا پُر ہو گیا ہے۔ دراصل آج بہت دنوں کے بعد صبح صبح صفحہ اوّل پر پھر لیڈی ڈیانا کی خبر پڑھی ہے۔ گو اس کباب میں ہڈی بھی ہے، یعنی ساتھ شہزادہ چارلس کی تصویر اور اس کا بیان بھی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، دراصل ہمیں ایک خوشی تو اس بات کی بھی ہے کہ اخبار والوں کو پھر سے عقل آ گئی ہے اور انہوں نے صفحہ اوّل پر اہم بین الاقوامی خبروں کی اشاعت کی طرف پھر سے توجہ کی ہے۔ لیڈی ڈیانا کی شادی کیا ہوئی اور وہ ایک بچے کی ماں کیا بنیں اخبار والے انہیں بھول ہی گئے۔ ورنہ ہماری کتنی صبحوں کا آغاز کیسی کیسی خوبصورت شہ سرخیوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ آج لیڈی ڈیانا کی منگنی ہو گی، آج شادی ہو گی، شب عروسی میں یہ باتیں ہوئیں، لیڈی ڈیانا حاملہ ہو گئیں، اب تیسرا مہینہ ہے، اب چھٹا مہینہ ہے، اب نواں مہینہ ہے، اب بچے کی پیدائش ہونے ہی کو ہے۔ ایک نجومی نے کہا ہے کہ لڑکا ہو گا۔ لیجیے مبارک سلامت لڑکا پیدا ہو گیا۔ اب لڑکے کی تصویریں دیکھیں۔ لڑکے کی دادی اماں یہ کہتی ہیں، ممانی صاحبہ کا یہ خیال ہے، پھوپھڑ صاحب پھولے نہیں سماتے، نانا جان اور نانی جان خوشی سے ناچ رہے ہیں، دادا ابا گڑ پتاسے بانٹ رہے ہیں۔ غرضیکہ اس بچے اور اس بچے کی ماں کی وجہ سے اخباروں میں کتنی چہل پہل تھی، مگر پھر یکایک ان اخبار والوں کو

اللہ جانے کیا ہوا کہ دو تین ہفتوں تک ان اہم خبروں سے منہ موڑا اور اب کہیں جا کر ایک چھوٹی سی خبر دی ہے مگر دی تو ہے اور نری خبر کو بھی ہم نے چاٹا تھا، ساتھ تصویر بھی دی ہے جس کے لیے ہم ان اخبار والوں کے ممنون ہیں۔

تصویر یہ ہے کہ لیڈی ڈیانا نے سر پر ہیٹ پہنا ہوا ہے مگر یہ ہیٹ اس نوعیت کا ہے کہ ان کا مخصوص ہیئر سٹائل اس میں بھی پوری طرح عیاں ہے۔ ان کے ساتھ شہزادہ چارلس بیٹھے ہیں اور کسی گہری فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں اور خبر یہ ہے کہ شہزادہ چارلس نے اپنے صاحبزادے شہزادہ ولیم کو ایک ایماندار اور متحمل مزاج انسان بنانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے بچوں کو مہذب انسان بنائیں گے جو دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اسی طرح ولیم کی والدہ ماجدہ یعنی لیڈی ڈیانا نے کہا کہ ان کا بچہ شاہی خاندان کے لیے نیک نامی کا باعث بنے گا اور ہاں انہوں نے ایک اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان کے بچے کی عمر ۱۰۱ سال ہو۔

سو، وہ جو ہماری طبیعت کی بے تکلفی تھی، وہ اس تصویر اور اس تحریر سے جاتی رہی ہے۔ کیسے اچھے لوگ ہیں۔ ظاہر بھی خوبصورت ہے، باطن بھی خوبصورت ہے اور اخبار والوں نے کئی ہفتوں تک ہمیں ان کی گھاتوں اور ان کی باتوں سے محروم رکھا۔ اب دیکھیں انہوں نے کیسی اچھی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے بچے کو مہذب بنائیں گے۔ اتنا مہذب کہ وہ دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی سوچے، گویا اگر شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کی یہ خواہش پوری ہوئی تو شہزادہ ولیم کسی انوکھی خصوصیت کا حامل نہ ہوگا، بلکہ صرف اتنا ہوگا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل رہا ہوگا جس سے شاہی خاندان کی نیک نامی میں واقعی اضافہ ہوگا۔ شہزادہ ولیم کے آباؤ اجداد خود بھی تو بہت مہذب تھے اور دوسروں کے بارے میں اتنا سوچتے تھے کہ ساری دنیا کو تہذیب سکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے اور جب تک لوگوں نے انہیں زبردستی اپنے گھروں سے نہیں نکالا، اتنی دیر تک وہ اپنی تہذیب سکھانے سے باز نہیں آئے۔ یہ جو ہم آج تھوڑی

بہت انگریزی بول لیتے ہیں، کوٹ پتلون پہن لیتے ہیں، اماں کو ممی اور ابا کو ڈیڈ کہہ لیتے ہیں، شہزادہ ولیم کے آباؤ اجداد ہی کی تو دین ہے اور جس طرح والدین کو اپنے بچوں کو مہذب بنانے کے لیے تھوڑی بہت سختی بھی کرنی پڑتی ہے، اسی طرح شہزادہ ولیم کے مہذب آباؤ اجداد نے جلیانوالہ باغ اور کچھ اس طرح کے دوسرے مقامات پر ہماری تھوڑی بہت سرزنش بھی کی۔ ۱۸۵۷ء میں انہیں قدرے زیادہ سختی کرنا پڑی مگر یہ ہمارے بھلے ہی کے لیے تو تھی۔ اس طرح یہ مہذب شاہی خاندان جس کا نام شہزادہ ولیم کی وساطت سے روشن کرنے کی خواہش کی گئی ہے، افریقہ کے جنگلوں تک تہذیب کی شیروانی لے گیا تھا اور کالے لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ایسی تہذیب سکھائی تھی کہ وہ ''ہاں ہاں'' کر اُٹھے تھے۔

اور ہاں ایک نیک نام شاہی خاندان کے پاس ایک ایسی گیدڑ سنگھی بھی تھی کہ جب بھی ان کے زیرِ نگیں بلکہ زیرِ تربیت کوئی جانگلی قوم، ان کی تہذیب کے شکنجے سے نکلنا چاہتی، شاہی خاندان کی ساحری انہیں دوبارہ سلا دیتی تھی۔ آج کل تو نیند لانے کے لیے بازار میں ویلیم (Valium) دستیاب ہیں۔ ان فرنگیوں کے پاس قوم کو سلانے کے لیے ان کی تہذیب کے خواب آور اجزاء ہی کافی تھے۔ سو شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کے ساتھ ہم بھی ان کی خواہش میں شریک ہیں کہ ان کا بچہ مہذب بنے مگر ہماری دعا یہ ہے کہ ایک تو وہ دوسروں کے بارے میں ''اضافہ'' کا باعث نہ بنے، چونکہ بچے دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں اور ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ ایک خوشگوار نظام کی نوید لے کر آتا ہے لہٰذا اللہ کرے کہ شہزادہ ولیم بڑا ہو کر اپنی قوم کے لیے اور دنیا کی دوسری قوموں کے لیے کوئی خوشخبری لے کر آئے۔ وہ بہت مہذب بنے مگر اتنا مہذب نہیں کہ دوسروں کو تہذیب سکھانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے اور دوسروں کے گھر میں گھس جائے اور جب گھر والے اسے نکالنے کی کوشش کریں تو وہ انہیں سلانے کے لیے ''ولیم'' کی بجائے ''ویلیم'' بن جائے، اللہ نہ کرے کہ اس طرح ہو، ورنہ اس صورت میں لوگ اسے ولیم کی بجائے ''ویلیم ۵'' کہنا شروع کر دیں گے۔

ایک حکایت

بھارت کی فلم انڈسٹری کے معروف ولن پران نے، جو اَب تک فلموں میں ۵۰ ڈاکے، ۹۰۰ چوریاں، ۳۰۰ قتل اور ۱۰۰ آبروریزی اور سمگلنگ کی وارداتیں کر چکے ہیں، اپنے ایک انٹرویو میں ایک بہت دلچسپ بات کہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پرانی فلموں میں کسی بے رحم ڈاکو، لالچی مہاجن، ظالم غنڈے اور عورت کی عزت لوٹنے والے کو دیکھ کر فلم بینوں کے دل میں برائی سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا مگر آج ہماری فلموں میں سب برے کام ہیرو کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری فلم میں توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری کے باوجود فلم بین اسے اپنا ہیرو تسلیم کرتے ہیں۔

پران کی یہ بات سن کر ہمیں لگا جیسے موصوف خاصی پرانی وضع کے آدمی ہیں اور وقت کو ایک ساکت چیز سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ زمانے کی بدلتی قدروں کا ساتھ دینے کی بجائے اُلٹا ان کا نوحہ پڑھنے میں مشغول ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اپنے یہ بھائی صاحب خاصے رِی ایکشنری آدمی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس زمانے میں بے رحم ڈاکو، لالچی مہاجن، ظالم غنڈے اور عورت کی عزت لوٹنے والے کو دیکھ کر فلم بینوں کے دلوں میں ان برائیوں سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا وہ زمانہ اور تھا اور آج جبکہ یہ سارے برے کام ہیرو کرتا ہے اور اس کے باوجود وہ ولن نہیں ہیرو ہی رہتا ہے تو یہ زمانہ اور ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں علامہ قنوطی صاحب، وہ بھی پران کی طرح ہر نئی چیز پر کڑھتے رہتے ہیں اور اس میں سے اچھے پہلو تلاش کرنے کی بجائے اس میں سے

کیڑے نکالنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہم نے انہیں کئی دفعہ اقبال کا مشہور زمانہ شعر ؎

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سنایا مگر انہوں نے اپنی سوچ اس شعر کے مطابق تو خیر کیا ڈھالنی ہے، وہ اس شعر کے پہلے دو لفظوں ہی سے بدک جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں آئین نو نہیں چاہیے، ہمارے لیے ۷۳ والا آئین ہی ٹھیک ہے۔

انہی علامہ قنوطی صاحب کو ہم نے پران کا متذکرہ بیان پڑھ کر سنایا تو یہ بیان سن کر پہلے وہ ہنسے اور پھر روئے۔ ہم نے پوچھا کہ علامہ صاحب! آپ ہنسے کیوں۔ کہنے لگے، ہنسا اس لیے ہوں کہ اس دور میں بھی پرانی قدروں کو عزیز رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ہم نے کہا کہ علامہ صاحب، آپ روئے کیوں؟ بولے، رویا اس لیے ہوں کہ عزیزی پران نے اپنی بات کو فلم تک ہی محدود کر کے بات کا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ ہم نے کہا، کیا مطلب؟ بولے، پران نے جس چیز کا فلم کے حوالے سے رونا رویا ہے، وہی چیز سیاست میں بھی موجود ہے۔ ہم یہ سن کر حیران ہوئے تو علامہ قنوطی نے کہا کہ میرے عزیز، اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جہاں فلموں میں آج کل ہر برائی کا ارتکاب ہیرو کرتا ہے اور اس کے باوجود عوام کی نظروں میں ہیرو ہی رہتا ہے، اسی طرح ہمارے حکمران بھی اپنے دورِ اقتدار کے دوران قتل و غارت گری اور لوٹ مار میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے باوجود عوام انہیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ صاحب تاریخ کی پوتھی کھول کر بیٹھ گئے اور ایسے کتنے ہی حکمرانوں کے کرتوت بیان کرنا شروع کر دیے جنہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی مگر جنہیں عوام آج بھی اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔

ہم نے علامہ صاحب کی یہ ساری کتھا بڑے تحمل سے سنی۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکے تو ہم نے کہا علامہ صاحب! یہ تو ماضی کی باتیں ہیں، کچھ باتیں آج کے حوالے سے بھی بتائیں۔ کہنے لگے، آج کی باتیں آج نہیں کل بتائی جاتی ہیں۔ ہم نے عرض کی،

آپ علامہ ہیں، اخبار نویس تو نہیں ہیں کہ آج کی باتیں کل بتائیں گے۔ بولے، عطاء اللہ شاہ بخاری کو جانتے ہو۔ ہم نے کہا کہ ہم تو ان کے پرستاروں میں سے ہیں۔ کہنے لگے، شاہ صاحب جب تقریر کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے "آہ شاہ صاحب"۔ ظاہر ہے ہمیں علامہ صاحب کی یہ بات سمجھ میں آ گئی چنانچہ اس کے بعد ہم نے اصرار نہیں کیا کہ وہ ماضی اور حال کا موازنہ بھی کر کے دکھائیں۔

اور اب آخر میں ہم اپنے قارئین کو ایک حکایت سناتے ہیں جو محض جگہ بھرنے کے لیے ہے کیونکہ کالم کچھ چھوٹا رہ گیا ہے۔ ایک بادشاہ کے زمانے میں ایک بہت بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ اس بوڑھے آدمی نے اس بادشاہ کے والد اور دادا کا زمانہ بھی دیکھا ہوا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے اس بوڑھے آدمی کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا بزرگو! آپ نے میرا زمانہ بھی دیکھا ہے، میرے والد کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور میرے دادا کا زمانہ بھی دیکھا ہے، آپ کو ان تینوں ادوار میں کیا فرق نظر آتا ہے۔ بزرگ نے کہا، حضور آپ کے دادا کے زمانے میں ایک روز میں جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ میں نے ایک ڈاکو کو دیکھا جو ایک دلہن کو اُٹھا کر لے جا رہا تھا۔ میرا وہ جوانی کا زمانہ تھا۔ میں نے ڈاکو کا مقابلہ کیا اور اسے زیر کر کے بے ہوش دلہن کو اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ دلہن نے لاکھوں روپے کا زیور پہنا ہوا تھا مگر میں نے ان زیورات کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ میں نے دلہن کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور جب وہ ہوش میں آئی تو اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تو حضور یہ تو آپ کے دادے کا زمانہ تھا، جب آپ کے والد بادشاہ بنے تو یہ واقعہ یاد آنے پر بجائے خوشی کے مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میں نے اس عورت کی جان بچائی۔ یہی کافی تھا، میں اگر اس کے کچھ زیور اُتار لیتا تو اسے کون سا پتہ چلنا تھا، اپنی باقی عمر آرام سے کٹ جاتی۔ تو حضور یہ آپ کے والد کا زمانہ تھا اور بادشاہ سلامت جب سے آپ اقتدار میں آئے ہیں، جب کبھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اس عورت کی خوبصورتی اور اپنی بے وقوفی کا سوچ کر سخت غصہ آتا ہے، کیا عمدہ موقع تھا جو میں نے ہاتھ سے گنوا دیا۔

وقت کا ''ضیا''!

ایک مقامی بنک میں ٹیلی فون کا بل جمع کراتے ہوئے میری نظر کاؤنٹر کے قریب ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک ''ہدایت نامہ'' پر پڑی جس پر لکھا تھا۔

''ٹیلی فون کا بل ادا کرتے ہوئے پوری رقم ادا کریں، تا کہ لین دین کے دوران وقت کا ''ضیا'' نہ ہو!''

لکھنے والا غالباً ''وقت کا ضیاع'' کہنا چاہتا تھا، لیکن جس طرح امریکن، لفظ کی ساؤنڈ کے مطابق اس کے ہجے لکھتے ہیں یعنی Through کو Thru لکھتے ہیں، اسی طرح متذکرہ ہدایت لکھنے والے نے ''ضیاع'' کو ''ضیا'' لکھ دیا کہ ''ع'' کی ساؤنڈ تو سنائی دیتی نہیں چنانچہ کیوں نہ لفظوں کے ضیاع سے بچنے کے لیے ''ضیاع'' کو ''ضیا'' لکھ دیا جائے!

مگر لکھنے والا بچارا جانتا نہیں تھا کہ اس نے ''وقت کا ضیاع'' اور ''وقت کا ضیا'' کو ہم معنی سمجھ کر بھولپن میں صدر ضیا کے نو سالہ دور حکومت کو جس طرح ''وقت کا ضیا'' قرار دیا ہے، اس سے صدر ضیا کے ہم جیسے مداحوں کو کتنی تکلیف ہوگی، کیونکہ گزشتہ نو برس میں ضیا حکومت کی افغانستان اور انڈیا وغیرہ کے سلسلے میں خارجہ پالیسی کافی حد تک قومی تقاضوں کے مطابق رہی ہے، اسی طرح ضیا حکومت نے گزشتہ نو برس میں جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ سکالروں، دانشوروں، ادیبوں، مصوروں، موسیقاروں، اداکاروں، شاعروں اور فنون لطیفہ سے متعلق تمام شعبوں کے لوگوں کو ریاست

کی سطح پر اتنی اہمیت اور عزت دی ہے کہ اس سے پہلے ایسا کم ہوا ہے۔ تحریر و تقریر کے معاملے میں صدر ضیا کی پالیسی یہ رہی ہے کہ آزادی تحریر و تقریر دینے میں کوئی حرج نہیں، بس آزادی تحریک نہیں ہونی چاہیے...... اور اب جناب جونیجو نے آزادی تحریک بھی دے رکھی ہے یعنی کرلو جو کرنا ہے۔

تاہم متذکرہ بنک کے صارفین کے لیے لکھے گئے ''ہدایت نامہ'' میں ''وقت کا ضیاع'' کو جس طرح ''وقت کا ضیا'' لکھا گیا ہے، وہ بھی نظر انداز کرنے والی بات نہیں، ممکن ہے لکھنے والے نے ضیا اور ضیاع کو بھولپن میں ہم معنی قرار دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے یہ غلطی شعوری طور پر کی ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ صدر ضیا نے گزشتہ نو برس میں وہ کچھ بالکل نہیں کیا، جو انہیں کرنا چاہیے تھا، یعنی وہ سمجھتا ہو کہ صدر ضیا نے ۱۹۷۷ء میں جس طرح ایک مطلق العنان حکمران کے طور پر اقتدار سنبھالا، وہ چاہتے تو اس ملک کی تقدیر بدل سکتے تھے۔ یعنی وہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت بناتے، ایسی فلاحی مملکت جس میں بچے کی پیدائش پر اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا، بڑا ہونے پر اسے مفت تعلیم کی سہولت حاصل ہوتی، تعلیم سے فراغت کے بعد اسے روزگار کے لیے پریشان نہ ہونا پڑتا۔ اگر اس کے لیے فوری طور پر نوکری کی فراہمی ممکن نہ ہوتی تو اسے بے روزگاری کا وظیفہ دیا جاتا۔ یتیموں، بیواؤں اور بوڑھوں کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک ایسا نظام قائم ہوتا جس میں کسی کو زکوٰۃ یا خیرات دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ رشوت، اقربا پروری، بدعنوانی کا خاتمہ کیا جاتا۔ جنسی بے راہ روی پر سزائیں دینے سے پہلے ان تمام محرکات کا خاتمہ کیا جاتا، جو انسان کو اس طرف لے جاتی ہیں۔ چوریوں، ڈکیتیوں اور لاقانونیت کے انسداد کا حل مستقل بنیادوں پر تلاش کیا جاتا۔ رزق حرام کی طرف راغب ہونے والوں کو کڑی سزائیں دی جاتیں۔ ملک دشمنوں کو ٹھکانے لگایا جاتا۔ سرحدوں کا دفاع اتنا مضبوط ہوتا کہ کسی پاکستانی کے دل میں اپنے وطن کے مستقبل کے بارے میں کوئی خدشہ پیدا نہ ہوتا، لیکن چونکہ گزشتہ نو برس میں ان

میں سے کوئی کام بھی نہیں ہوا لہٰذا ممکن ہے کہ بنک کے باہر "ہدایت نامہ" لکھنے والے نے دانستہ طور پر گزشتہ نو برس کو مکمل طور پر وقت کا ضیاع قرار دیا ہو، اگر ایسا ہے تو پھر بقول شخصے یہاں تو ہم بھی قائل ہو گئے ہیں۔

ویسے وقت کا ضیاع والی بات اگر درست ہے تو پھر یہ دائرہ ذرا اور پیچھے کی طرف کھینچنا چاہیے، کیونکہ جنرل ضیا ۱۹۷۷ء میں اگر فوج کی طاقت کے بل بوتے پر مطلق العنان حکمران کے طور پر سامنے آئے تو ان سے پہلے ۱۹۷۲ء میں سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو بے پناہ عوامی حمایت کے زور پر ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے اور یوں اگر وہ چاہتے تو اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں ملک کا نقشہ بدل سکتے تھے لیکن انہوں نے ملک کا "نقشہ" کسی اور طریقے سے بدلا اور پھر حکومت پر قبضہ کیا لیکن باقی ماندہ چھوٹے سے پاکستان کو بھی نہ صرف یہ کہ وہ پاکستان نہیں بنایا جس کا وعدہ انہوں نے اپنے ووٹروں سے کیا تھا، بلکہ یہاں ظلم اور بے انصافی کی نئی روایتیں قائم کر دیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو صدر جنرل ضیاء الحق نے نو سال اور ذوالفقار علی بھٹو نے پانچ سال ضائع کرائے۔ ذرا اور پیچھے جائیں تو ہمارے دس سال ایک اور مطلق العنان حکمران صدر ایوب خان کھا گئے، گویا ہماری گاڑی چوبیس برس سے ریورس گیئر میں چل رہی ہے اور ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان جلوہ افروز ہونے والے صدر جنرل یحییٰ خان کے تو کیا کہنے! اس سے پیچھے ہم اس لیے نہیں جائیں گے کہ اس دور کے حکمرانوں کو اپنے "عزائم" پورے کرنے کے لیے زیادہ اور مطلوبہ مطلق العنانی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ لہٰذا "وقت کا ضیاع" کو "وقت کا ضیا" لکھنے والے کے ذہن میں اگر وہی باتیں ہیں جو ہم نے اوپر اسی سے منسوب کی ہیں، تو پھر اس کے دل دردمند کو صرف نو برس کا نہیں، کم از کم گزرے ہوئے چوبیس برس کا دکھ محسوس ہونا چاہیے۔ باقی رہے ہم، بحمد اللہ ہماری عیش میں گزر رہی ہے۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان چوبیس برس کا حساب کریں جو ہماری زندگی میں سے منفی کر دیے گئے ہیں۔ حساب کتاب بنک والے کیا کرتے ہیں، وہ کرتے رہیں کہ انہیں تو اس کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں!

ریفرنڈم

ان دنوں متعدد آڑھتیوں نے ریفرنڈم کی حمایت میں بیان دیے ہیں لیکن انجمن تحفظ حقوق آڑھتیاں سبزی منڈی کے سینئر نائب صدر چودھری محمد طارق نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے ریفرنڈم کرانے کے فیصلے کا جس طرح خیر مقدم کیا ہے اور انجمن کی طرف سے صدر کی حمایت کا جس طرح اعلان کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چودھری طارق نے کہا ہے کہ وہ خود، ان کے اہل خاندان، سبزی منڈی کے تاجر اور ان کے دیگر ساتھیوں میں سے ہر شخص ریفرنڈم کے بیلٹ پیپر کے ساتھ ایک ایک سو روپے کا نوٹ ڈالے گا۔ اس طرح ایک لاکھ روپے بیلٹ بکسوں میں ڈالے جائیں گے۔ چودھری محمد طارق نے بتایا کہ وہ ریفرنڈم کے روز صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی ایک لاکھ تصاویر تقسیم کریں گے اور ووٹروں کو پولنگ سٹیشنوں پر پہنچانے کے لیے پچاس لاکھ ویگنوں کا انتظام کریں گے۔

چودھری صاحب کے متذکرہ بیان نے الیکشن یا ریفرنڈم کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز باب کا اضافہ کیا ہے، کیونکہ آج تک ووٹ کے ساتھ نوٹ کا اصول رائج تو تھا مگر یہ نوٹ ووٹر وصول کرتا تھا لیکن چودھری صاحب نے اس اصول کو اُلٹا کر ''ہتھوں'' پیسے دینے کا اعلان کیا ہے۔ بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ چودھری صاحب یہ آپ نے ہم ووٹروں کے حق میں اچھا نہیں کیا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آپ نے ہمارے راستے میں کانٹے بو دیے ہیں کیونکہ ہم لوگوں کو ساری عمر قدم قدم پر نوٹ کی جھلکی دکھا کر فائلوں کو پہیے لگانا

پڑتے ہیں۔ بس زندگی میں ایک آدھ موقع ایسا آتا ہے جب ہمیں نوٹوں کے پہیئے لگا کر پولنگ سٹیشن تک لے جایا جاتا ہے مگر آپ نے ہمارا یہ سکوپ بھی ختم کر دیا کیونکہ اب تو ہمیں اُلٹا یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ۱۹ دسمبر کو ووٹ ڈالنے جائیں تو پولنگ افسر ہمارا ووٹ قبول کرنے سے پہلے نوٹ کے بارے میں نہ پوچھ بیٹھے اور ہم اسے قائل کرنے میں لگے رہیں کہ بھائی صاحب ہم ایک غریب ملازمت پیشہ شخص ہیں، آڑھتی نہیں ہیں اور یوں وہ ''مثبت'' جواب نہ ملنے پر ہمیں ووٹ کے حق ہی سے محروم کر دے۔

خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، فی الحال تو ہم نے چودھری صاحب کی داڑھی کو ہاتھ لگا کران سے ایک گزارش کی ہے کیونکہ ان کا یہ بیان دوررس نتائج کا حامل ہے اوران سے گزارش ہم نے یہ کرنی ہے کہ پولنگ کے روز یہ جو ایک لاکھ روپے کی ''ویلیں'' آپ دیں گے، ان کی واپسی وصولی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟ یہ گزارش تو سوال کی صورت اختیار کر گئی، چنانچہ اگر سوالیہ صورت ختم کی جائے تو براہِ راست گزارش یہ ہے کہ خدارا سبزیوں کی قیمتوں کو مزید نہ چھیڑیں اور یہ جہاں ہیں انہیں وہیں رہنے دیں۔ آپ جو نیک کام کر رہے ہیں اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو یوں دے گا کہ ریفرنڈم کے بعد مارچ تک الیکشن بھی منعقد ہو جائیں گے اور انشاء اللہ اس موقع پر عوام ٹماٹر اور گلی سڑی سبزیاں بھی منہ مانگے داموں آپ سے خریدیں گے اور یوں آپ اپنے پیسے پورے کر سکیں گے۔ لہٰذا فی الحال ہم پر کرپا کریں رام بھلی کرے گا!

اب اگر ریفرنڈم کا ذکر چھڑا ہے تو شہر میں لہلہاتے ہوئے ان بینروں کا تذکرہ بھی ہو جائے جو ریفرنڈم کے حق میں نعروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بینر کسی ایسی مخیر شخصیت کا عطیہ ہیں جو اس بات کی قائل ہے کہ دائیں ہاتھ سے نیکی کرتے وقت بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ان بینروں میں سے بیشتر کے نیچے کسی فرد یا انجمن کا نام درج نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ اس پر صرف جزاکم اللہ تعالیٰ ہی کہا جا سکتا ہے، البتہ ان میں سے ایک بینر ایسا ہے جس پر درج مضمون نے ہمیں بہت انسپائر کیا ہے۔

مضمون بلکہ نفسِ مضمون یوں ہے:

میری رائے ہاں، تیری رائے ہاں
ہم سب کی رائے ہاں ہاں ہاں

بلکہ یہ بینر پڑھتے ہوئے ہمارے ساتھ ایک لطیفہ بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس کی دوسری لائن قدرے مدھم لکھی ہوئی تھی اور اُوپر سے ہم اپنی عینک بھی گھر بھول آئے تھے۔ چنانچہ پہلی نظر میں ہم نے یہ سلوگن اس طرح پڑھا:

میری رائے ہاں تیری رائے ہاں
ہم سب کی رائے ہا ہا ہا!

اور یوں ہمیں یہ سلوگن خاصا عجیب محسوس ہوا مگر جب ہم نے پوری توجہ سے اصلی بینر پڑھا تو ہمیں یہ بہت خیال افروز محسوس ہوا۔ اس ''ہاں ہاں ہاں'' میں کتنی موسیقیت ہے، البتہ ''ہاں ہاں ہاں'' کی تکرار سے کچھ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی چڑ کر کہہ رہا ہو کہ ہاں ہاں ہاں سن لیا ہے، اب بس کرو۔ لہٰذا اس کی بجائے اگر

''ہم سب کی رائے ہاہاہا!''

بھی ہو تو ٹھیک ہے کیونکہ اس قہقہے سے عوام کی مسرت کا احساس ہوتا ہے یعنی تیری رائے ہاں میری رائے ہاں اور پھر اس اتفاق رائے پر سب اظہار مسرت کے لیے قہقہہ لگاتے ہیں ہاہاہا! اگر ہماری اس تجویز سے اربابِ اختیار اتفاق کریں تو یہ بینر تبدیل کروا دیں تاکہ بصارت اور بصیرت میں کوئی بعد نہ رہے!

◇ ◇ ◇

ایک کتے کا سوال ہے بابا!

ایک بار چور، ہمارا سکوٹر لے گیا۔ ہم ایک کالم لکھ کر چپ ہو گئے۔ چور غیرت والا تھا، اس نے اس تھوڑے لکھے کو ''بوتا'' سمجھا اور سکوٹر واپس چھوڑ گیا۔ گزشتہ برس چور نے گھر کا رُخ کیا، کچھ نہ ملا تو کمرے میں سے رسٹ واچ اُٹھا کر چلتا بنا۔ ہم خاموش رہے۔ پھر دو ماہ پیشتر وہ گھر کے صحن اور ملحقہ کمرے میں مٹر گشت کرتا رہا۔ اس دفعہ بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور واپس چلا گیا۔ ہم خاموش رہے۔ اب اس نے گزشتہ شب غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا، مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو کھڑاک سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ ہم نے اسے پکڑنے کے لیے اپنے کمرے کی کنڈی کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ موصوف بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے۔ انہوں نے پہلے ہی باہر سے تمام کنڈیاں لگا دی ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے پوری بے چارگی کے ساتھ نچلی منزل والی دیوار پھلانگتے دیکھا، اس کے رُخ زیبا کا دیدار بھی کیا۔ اس پر ہم نے صبح رپٹ لکھائی اور خاموش رہے۔

لیکن ہمارے دوستوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ اب خاموشی مناسب نہیں ہے، اب تمہیں کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہم نے پوچھا کیا کریں۔ کہنے لگے، ایک کتا پالو۔ ہم نے پوچھا، اس کا کیا فائدہ۔ بولے، بھونکے گا۔ ہم نے کہا، فائدہ؟ کہ جو کتا بھی ہم نے پالا ہے، وہ بالآخر ہمیں پر بھونکا ہے۔ انہوں نے کہا، سبھی کتے ایسے نہیں ہوتے۔ تم کوئی بہتر

نسل کا کتا پالو۔ دن کو اسے زنجیر باندھ کر رکھو، رات کو کھلا چھوڑ دو۔ سو اب ہمیں ایک اعلیٰ نسل کے کتے کی ضرورت ہے۔ قارئین میں سے اگر کسی کے پاس فالتو ہو تو وہ ہمیں عنایت کر دیں!

تاہم یہ کرم فرمائی کرتے وقت وہ اگر چند امور پیش نظر رکھیں تو ہم زیادہ ممنون ہوں گے۔ مثلاً یہ گھر کی حفاظت کے لیے ہمیں کتے کی ضرورت ہے، کتیا کی نہیں۔ کتیا میں قباحت یہ ہے وہ بہت سوشل ہوتی ہے۔ اس کا حلقہ احباب بہت وسیع ہوتا ہے، چنانچہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مہمانوں کی خاطر داری بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں خدشہ ہے کہ لوگ کہیں ''خواجہ سگ پرست'' نہ کہنا شروع کر دیں۔ اسی طرح ہمیں ایسے آوارہ کتے کی بھی ضرورت نہیں جو سارا دن گھر سے غائب رہ کر کسی دکان کے پھٹے کے نیچے اُونگھتا ہے، جو اسے ہڈی ڈال دے، اس کے پیچھے چل پڑے۔ سارا دن سڑکوں پر یونہی بیکار پھرتا رہے اور یوں اپنے علاقے میں اس کی ریپوٹیشن اچھی نہ ہو، چنانچہ کتے کے ساتھ اگر کتے کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا جائے تو مہربانی ہوگی۔

کتا بہر حال کتا ہوتا ہے لیکن بقول پطرس بخاری اسے بہت کتا نہیں ہونا چاہیے۔ اسے دن کے وقت آرام کرنا چاہیے، رات کو جاگنا چاہیے۔ کئی کتے اس کے برعکس رات کو سوتے ہیں اور دن کو جاگتے ہیں۔ یہی وہ کتے ہیں جو بہت کتے ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کے پاس اسی قسم کا کتا ہے۔ چنانچہ اس دوست کے گھر میں رات کے دوران متعدد بار چوری ہو چکی ہے اور کتا اس کے کئی دوستوں کو دن کے وقت کاٹ چکا ہے۔ خود ہمیں ایک بار سات ٹیکے لگوانا پڑے تھے! سو قارئین سے درخواست ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی کتا ہو تو بھیج دیں، بہت کتا نہ بھیجیں۔

ہم یہ سطور یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ایک دوست نے بتایا کہ گزشتہ رات چوروں

نے عارف نظامی کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی واردات میں کامیاب بھی ہوئے ہیں اور زیور وغیرہ پر ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ عارف نظامی، حمید نظامی کے صاحبزادے اور مجید نظامی کے بھتیجے ہیں۔ یوں چوروں کے ساتھ ان کا ''اِٹ کھڑکا'' ہے۔ لہٰذا وہ بھی ان کے ساتھ نبٹ لیں گے۔ تاہم دریں اثناء ہماری اپیل کا دائرہ قدرے وسیع ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب ایک کتے کی بجائے دو کتوں کا سوال ہے بابا، ہے کوئی سخی......!

نئے پرانے کتبے

سیّد ضمیر جعفری نے انگریزی کے ایک مزاحیہ شاعر کی ان مختصر نظموں کو اُردو میں ترجمہ کیا ہے جو اس نے مختلف لوگوں کی قبروں پر بطور کتبہ تخلیق کی ہیں۔ مثلاً ایک ''بیوی'' کی قبر کے لیے اس نے یہ کتبہ تجویز کیا ہے۔ ؎

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
میں بھی ہوں آرام سے اور وہ بھی ہے آرام سے

لارڈ کلائیو کی قبر کے لیے اس نے یہ کتبہ منتخب کیا ہے۔ ؎

کلائیو کی یہ بات آئی پسند
کہ وہ مر گیا!

تاہم مغرب والے اپنے مرحومین کے ساتھ اس درجہ بے تکلف ہونا ''افورڈ'' کر سکتے ہیں جبکہ ہم مشرقی لوگ اس ضمن میں بہت محتاط ہوتے ہیں، چنانچہ ہم بہت سنجیدگی سے اپنے مرحومین کی قبروں کے کتبے تیار کرتے ہیں اور اس امر کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ قبرستان سے گزرنے والوں یا فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں پر مرحوم کی اس درجہ دہشت طاری کر دی جائے کہ وہ کتبہ دیکھ کر ''با ادب، باملاحظہ ہوشیار'' کی تصویر بن جائیں۔ چنانچہ آپ نے بہت سی قبروں پر مرحوم کے نام کے ساتھ اس کی ڈگریاں لکھی دیکھی ہوں گی اور وہ عہدہ بھی جس پر، یا جس کے لیے مرحوم نے وفات پائی۔ ہم نے ایک قبر کے کتبے پر، جس کے آگے ایک خوبصورت سا باغیچہ تھا اور جس میں تازہ ہوا کے

لیے روشن دان بنائے گئے تھے، ڈگریوں اور مناصب کی وہ بہار دیکھی کہ کچھ کنفیوژ سے ہو گئے اور صحیح اندازہ نہ ہوا کہ یہ کتبہ ہے یا اس جدید طرزِ تعمیر کی حامل انڈر گراؤنڈ ''کاٹیج'' کی نیم پلیٹ ہے؟

ویسے یہ سطور لکھتے ہوئے ہمیں خیال آیا ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے کا انسان تو مرنے کے بعد کتبے وغیرہ کی نعمت سے محروم ہی رہ جاتا ہوگا، کیونکہ اس بیچارے کا تو نہ کہیں جنازہ اُٹھتا تھا اور نہ کہیں مزار ہوتا تھا۔ وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا تھا اور جنگلی جانور اس کی ہڈیاں تک چبا جاتے تھے، بلکہ اس کا تو زندہ رہنا بھی ایک مسلسل امتحان تھا، کیونکہ اسے کھانے پینے کی نت نئی اشیاء ''ایجاد'' کرنے اور اپنی ضرورتوں اور ''آسائشوں'' کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے خاصے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ بہرحال اگر آج سے ہزاروں برس پہلے کے انسان کو پورے کپڑوں میں بیمار ہونے اور پورے علاج معالجے کے بعد مرنے کی سہولت حاصل ہوتی، بلکہ مزید یہ کہ اسے مکمل اعزاز کے ساتھ دفن ہونے اور پھر قبر پر کتبہ لگانے کے مواقع میسر آتے تو ان قبروں پر خاصے انوکھے کتبے پڑھنے کو ملتے۔ اور ظاہر ہے آج سے ہزاروں سال پہلے کے معاشرے میں بھی سائنس دان، حاکم، طبیب، دانشور، سیاست دان، ادیب اور مذہبی علماء وغیرہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں بہرحال موجود ہوں گے، سو اس معاشرے میں اگر قبروں پر کتبے لکھنے کی ''سہولت'' موجود ہوتی، تو ان کی قبروں پر ہم آج کچھ اس طرح کے کتبے لکھے دیکھتے!

سائنس دان:

چاند کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے ایک روز اچانک اسے ایک گہری جھیل میں چاند نظر آیا۔ اس نے فوراً جھیل میں چھلانگ لگا دی اور فوت ہو گیا۔ مرحوم چاند تک رسائی حاصل کرنے والے پہلے انسان تھے۔

حاکم:

اس نے اپنے ایک مخالف کو "فکس اپ" کرنے کے لیے غار کے دہانے پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا جس میں وہ مخالف رہتا تھا۔ مگر ایک روز ادھر سے گزرتے ہوئے خود ہی اس پتھر کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا!

سیاست دان:

مردار گوشت کی تقسیم پر جھگڑا ہوا اور ایک نوکیلا پتھر لگنے سے وفات پائی۔ اس کی وفات پر ایک بار پھر گوشت کی تقسیم کا مسئلہ اُٹھا، جسے پُر امن طریقے سے حل کر لیا گیا!

عالم:

اس نے ایک تقریر میں کہا کہ زلزلے ان گنہگاروں کی وجہ سے آ رہے ہیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں اور جن کا ظاہر، باطن ایک نہیں ہے۔ اگر ہم ان لوگوں سے نجات حاصل کر لیں تو زلزلوں کا سلسلہ رُک سکتا ہے۔ دورانِ تقریر ایک زلزلہ آیا اور وہ ایک چٹان کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد زلزلوں کا سلسلہ رُک گیا!

شاعر:

اس نے اپنی محبوبہ سے کہا، میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ یقین نہیں آتا تو میرا دل چیر کر دیکھ لو۔ محبوبہ نے فوراً اس کا دل چیر کر دیکھا جس میں اس قسم کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ تاہم موصوف اس عمل کے دوران انتقال کر گئے۔

طبیب:

ایک دفعہ بیمار پڑنے پر اس نے اپنا علاج خود کیا اور فوری وفات پائی!

ادب اور بے ادب!

سیاست دان ''ملک وملت کے مفاد'' میں جو کچھ کہتے رہتے ہیں، ہم نے ان باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی تلخ نوائی کے پس پردہ بسا اوقات عوام کا ''احساس محرومی'' نہیں بلکہ ان کا ذاتی احساس محرومی بول رہا ہوتا ہے۔ بلکہ ایک پنجابی محاورے ''روندی یاراں نوں لے لے ناں بھراواں دا'' کے مصداق وہ عوام کا نام لے کر دراصل اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں کچھ سیاست دان تو ایسے بھی ہیں جن کی ملک وقوم سے وفاداریاں بھی مشکوک قرار دی جاتی ہیں۔ تاہم سیاست دانوں کی ایک بڑی بلکہ بہت بڑی تعداد ہمارے نزدیک انتہائی قابل احترام ہے مگر اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ سیاست دان اپنے ہر بیان میں مخلص ہوں بلکہ اس میں ذاتی مصلحت یا مفاد کی ملاوٹ بھی خارج از امکان قرار نہیں دی جا سکتی!

ان تمہیدی سطور پر ہمارا مقصود یہ ہے کہ اگر سیاست دان لوگوں میں پائی جانے والی سیاسی، معاشی اور معاشرتی بے چینی کا حوالہ دیں یا ملک کے مستقبل کے بارے میں خدشات کا اظہار کریں تو بدگمانی سے کام لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مبالغہ آمیز مایوس کن صورت حال پیش کر کے دراصل لوگوں میں حکومت کے خلاف مایوسی پھیلا رہی ہیں، لیکن ان سے ہٹ کر ایک طبقہ ملک میں ایسا بھی ہے جو کسی قسم کی عملی سیاست میں ''ملوث'' نہیں۔ وہ نہ حکومت کے ساتھ ''پارٹی'' ہے اور نہ وہ سیاست دانوں کا ہم سفر ہے بلکہ وہ ایک دردمند پاکستانی کے طور پر ملک وقوم کو درپیش مسائل پر غور کرتا ہے۔ ہماری مراد

پاکستانی ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں سے ہے اور یہاں بھی ہمارا روئے سخن صرف ان افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرف ہے جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہیں، چنانچہ حبیب جالب یا ان کی طرح کے دوسرے قابل احترام شعراء کی مثال بھی ہم یہاں پیش نہیں کر رہے، بلکہ سو فیصد غیر سیاسی شاعروں اور ادیبوں کو اپنی گفتگو کا حوالہ بنا رہے ہیں۔ کہنا ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکومت عام سطح پر اور دانش کی سطح پر پائی جانے والی بے چینی اور گھٹن کے سلسلے میں سیاست دانوں کی باتوں کو بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھے، لیکن اگر وہ آج کے پاکستانی ادب ہی کا مطالعہ کرے تو اسے اندازہ ہوگا کہ پاکستان کو خوبصورت دیکھنے کے آرزو مند ادیب اور دانشور اس سلطنت خداداد کو بدصورت بنانے کی کوششوں پر کس قدر مضطرب اور بے چین ہیں۔ چنانچہ صاحبان اقتدار سے ہماری گزارش ہے کہ اگر وہ ان احساسات کی شدت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو وہ پاکستانی ادب کا مطالعہ ضرور کریں۔ ہمارے ادب میں پائی جانے والی بے چینی کو بعض بھارتی نقاد اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ پاکستانی ادیب جو کچھ لکھتا ہے پکا محب وطن ہونے کے ناتے اپنے وطن کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو میں لکھتا ہے۔ بہر حال صاحبانِ اقتدار کے لیے اگر ادب کی تفہیم ممکن نہ ہو تو وہ مختار مسعود، مسعود مفتی، جاوید قریشی، منظور الٰہی شیخ، جیون خان، اختر سعید ایسے سخن فہم اور سیکرٹری لیول کے دوسرے افسران سے اس ضمن میں مدد لے سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم نئی اور پرانی نسل کے شعراء کے کچھ اشعار پیش کر رہے ہیں، صاحبان اقتدار ذرا زحمت کریں اور ایک نظر دیکھ لیں تا کہ سال ہا سال کی بے چینی کا انہیں اندازہ ہو سکے۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

تیرے بچے مر رہے ہیں بھوک سے کیوں؟
اے زمیں تیرے خزانے کس لیے ہیں

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

اُتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

وہ کاروبار کریں گے خدا کے نام پہ ہم
کہ اس نواح میں نام خدا نہیں رہنا

نہ جانے ختم ہو کب گلستاں کی یک رنگی
ترس گئی ہے نئے منظروں کو بینائی

آنکھیں بھی ہیں، رستہ بھی، چراغوں کی ضیا بھی
سب کچھ ہے مگر کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا
اب اپنی زمیں چاند کی مانند ہے انور
بولیں تو کسی کو بھی سنائی نہیں دیتا

جس میں سورج کو بھی شوکیس میں رکھا جائے
جس کی سحر کا ذکر بھی امکان میں نہیں

ہمیں تسلیم ہے تم نے کلامِ رب اُٹھایا ہے
دُکھی انسانیت کا بوجھ لیکن کب اُٹھایا ہے
روایتوں کی زباں سے تحسین ہو رہی ہے
مصاحبوں کی وفا کی توہین ہو رہی ہے
سجی ہوئی ہیں حریر و اطلس سے خواب گاہیں
مگر رعایا کو اور تلقین ہو رہی ہے

مشتے نمون ازخروارے کے مصداق یہ چند شعر ہم نے صاحبانِ اقتدار کی خدمت میں پیش کیے ہیں اور یہ شعر چاروں صوبوں کے مختلف شعراء کے ہیں۔ ہم آخری پیرالکھ کر اس کالم کا اختتام کرنے والے تھے کہ ابھی ابھی ہمیں ڈاک میں ایک غزل موصول ہوئی، غزل بھیجنے والے کو اپنے نام کی اشاعت سے غالباً کوئی غرض نہیں کیونکہ اس نے نام پتہ نہیں لکھا۔ ممکن ہے کوئی بڑا سرکاری افسر ہونے کی بنا پر نام کی اشاعت مسئلہ ہو، اس صورت میں متذکرہ غزل میں موجود دردمند خیالات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔
بہر حال اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے چارگی دوش ہے اور بار گراں ہے
اظہار پہ پابندی ہے اور منہ میں زباں ہے
ہاں رنگ بہاراں ہے مگر اس کے لہو سے
جو دست بہ دل، مہر بہ لب، درد بہ جاں ہے
ہوتا ہے یہاں روز مرے درد کا سودا
اے تیغ بکف روزِ مکافات کہاں ہے

آزاد کرو خون کو بازار میں لاؤ
صدیوں سے یہ محکوم رگوں ہی میں رواں ہے
کل کس کی زباں بند کرو گے ذرا سوچو
کل دیکھو گے ہم کو کہ زباں ہے نہ دہاں ہے
کس شہرِ خموشاں میں چلے آئے ہیں ہم لوگ
نے زورِ سناں ہے نہ کہیں شورِ فغاں ہے
ہر درد کی حد ہوتی ہے یوں لگتا ہے جیسے
اس درد کا کوئی نہ زماں ہے نہ مکاں ہے

اور اے صاحبانِ اقتدار! ملکی صورت حال کے حوالے سے یہ اضطراب صرف شاعری میں نہیں! پاکستان میں لکھے جانے والے افسانے میں بھی پایا جاتا ہے، مُلّائی وپیری کے ستائے ہوئے لوگوں کے دکھ دیکھنے ہوں تو افسانہ ''بین'' پڑھیں۔ مدینے کی جانب سفر کرنے والے رستہ بھول کر جس طرح ہر دفعہ کوفے کی سمت جانکلتے ہیں، اس کے لیے ''خواب اور تقدیر'' پڑھیں، ''راستے بند ہیں'' پڑھیں، غرضیکہ وہ پاکستانی ادب کا جہاں سے چاہے مطالعہ کریں انہیں محسوس ہوگا کہ شاعروں کے خواب ادھورے ہیں اور ؎

خدا کرے نہ کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

یہ کالم ہم نے اس لیے لکھا ہے کہ ممکن ہے ''ادب'' صاحبانِ اقتدار کی آنکھیں کھولنے کا باعث بنے۔ ورنہ ''بے ادب'' تو اب بہرحال زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔

◇ ◇ ◇

پروٹوکول

اللہ جانے وزیراعظم پاکستان جناب محمد خان جونیجو ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے کہ عجیب شخص ہے اتنی دفعہ مل چکا ہے مگر پہچانتا ہی نہیں۔ مثلاً گزشتہ برس اہل قلم کانفرنس میں ان سے ملاقات ہوئی تو ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے چہرے پر بڑی واضح مسکراہٹ تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں پہچان گئے ہیں، ورنہ ہماشا کے لیے ان کے چہرے پر مسکراہٹ کہاں آتی ہے۔ اسی طرح سبی کے مشاعرے میں بھی ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے چہرے پر شناسائی کے بڑے واضح آثار تھے مگر ہم اتنے بھول بھلکو ہیں کہ ہمیں بعد میں علم ہوا کہ وزیراعظم سے ہاتھ ملا چکے ہیں اوراب گزشتہ ہفتے انہوں نے ملک بھر سے تمام اخبارات و جرائد کے چیف ایڈیٹروں، نیز چند کالم نگاروں کو یاد فرمایا تو ہمیں ایک بار پھر شرف باریابی حاصل ہوااوراس دفعہ ہم انہیں واقعی نہیں پہچان سکے کہ قومی یا بین الاقوامی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے لہجے میں جو بھرپور اعتماد تھا وہ ہمیں گزشتہ ملاقاتوں میں نظر نہیں آیا تھا۔ ان کے ایک طرف وزیر اطلاعات چوھری شجاعت حسین اور دوسری طرف سیکرٹری اطلاعات مجید مفتی بیٹھے تھے۔ مگر خالص صحافت میں کیے گئے سوالوں کے جواب بھی وزیراعظم خود دیتے رہے۔ سوائے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کے حوالے سے مجیب الرحمٰن شامی کے ایک سوال کے جس کا جزوی جواب چودھری شجاعت حسین نے دیا۔ کیونکہ اس مسئلے پر اخبارات کے ایڈیٹراور زیادہ تر چودھری صاحب ہی مذاکرات کرتے رہے ہیں!

خیر یہ تذکرہ تو پھر کبھی سہی، فی الحال ایک ضروری بات آپ کو یہ بتائیں کہ صدر،

وزیراعظم، گورنر، وزرائے اعلیٰ اور وزرائے کرام کی بلائی گئی محفلوں میں شرکت کا ایک فائدہ ہمیں یہ ہوا ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اس نوع کی محفلوں کے پروٹوکول سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً چند ماہ قبل صدر مملکت نے ''سارک'' کے ملکوں کی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے روانگی سے قبل راولپنڈی میں اخبار نویسوں سے ملاقات کی، تو ایک پروٹوکول ہمارے علم میں یہ آیا کہ موضوع پر اظہار خیال سے قبل حکومت کی خارجہ پالیسیوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا جائے اور ہر گفتگو کے آغاز میں کہا جائے کہ جناب والا! آپ کی آزادانہ پالیسیوں کے طفیل اس وقت پاکستان کو اقوام عالم میں ایک قابل فخر مقام حاصل ہے اور پھر جو بھی کہنا ہے محتاط لفظوں میں اس افتتاحی جملے کے بعد کہا جائے۔ اسی طرح چودھری شجاعت حسین نے وزیر اطلاعات بننے کے بعد صحافیوں کو راولپنڈی میں اپنے ہاں مدعو کیا، تو وہاں ہمیں پتہ چلا کہ گفتگو کے آغاز میں چودھری شجاعت حسین کے والد ماجد چودھری ظہور الٰہی مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا حوالہ دیا جائے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اس ٹریننگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ ہفتے گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی کے ڈنر میں ہم خود انہیں ایک طرف لے گئے اور انہیں کہا کہ اگر آپ کو یاد ہو تو ملتان میں ایک رات ہم آپ کے مہمان تھے اور اگلے روز آپ خود جیپ ڈرائیو کر کے ہمیں کبیر والا لے گئے تھے اور یہ کہ آپ نے بہت ''ریش'' ڈرائیونگ کی تھی! اس نوع کی کچھ مفید باتیں ہم نے جناب وزیراعظم محمد خان جونیجو کی پریس بریفنگ میں بھی سیکھیں۔ مثلاً یہ کہ سوال کرنے سے پہلے پانچ منٹ جناب وزیراعظم کے اس تاریخ ساز کارنامے کو سراہا جائے جو انہوں نے مارشل لاء کے خاتمے اور ایک مکمل جمہوری حکومت کے قیام کے ضمن میں سرانجام دیا ہے۔ اس کے بعد سوال کیا جائے اور اگر آدھے راستے میں پہنچ کر اندازہ ہو کہ سوال کچھ منفی ہو رہا ہے، تو اسے مکمل ہونے سے پہلے پہلے مثبت بنا دیا جائے اور یہ ساری احتیاطیں اپنے طور پر کرنے کی ہیں ورنہ محمد خان جونیجو، چودھری شجاعت حسین یا مجید مفتی کو خوش کرنا مقصود نہیں کہ یہ سب کچھ تو غالباً پروٹوکول کا حصہ ہے۔

اور اگر آپ پروٹوکول کا پوچھتے ہیں تو وہ ان محفلوں کے علاوہ ان محفلوں کے بعد

دیے جانے والی ضیافتوں میں ہی پوری طرح نظر آتا ہے۔ مثلاً وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی طرف سے چیف ایڈیٹروں اور کالم نگاروں کو دیے گئے عشائیے میں ہم نے اس ضمن میں کچھ ضروری اسرار و رموز خاصی محنت شاقہ کے بعد سیکھے۔ مثلاً یہ کہ ٹیبل پر آپ کی کھانے کی پلیٹ آپ کے بائیں ہاتھ پر۔ کورسز ڈنر کے دوران اگر باوردی خدام آپ کی پلیٹ اُٹھا کر لے جائیں تو آپ پریشان نہ ہوں، کیونکہ دوسری ڈش کے لیے دوسری صاف پلیٹ آئے گی اور اس کے بعد جتنی ڈشز آئیں گی ہر دفعہ نئے برتن سجائیں گے۔ حتیٰ کہ آخر میں ایک پیالی میں پانی اور لیمو آئے گا، وہ پینا نہیں اس سے ہاتھ صاف کرنے ہیں۔ اسی طرح باوردی خدام آپ کے بائیں جانب سے کاندھے کے قریب بلکہ بسا اوقات کاندھے پر پلاؤ وغیرہ کی ڈشیں رکھیں گے۔ آپ وہ ڈش اپنے ہاتھ میں پکڑ کر خود ڈالنے کی کوشش میں ان خدام میں کھینچا تانی نہ کریں، کیونکہ تمام تر زور آزمائی کے باوجود وہ آپ پر اعتبار نہیں کریں گے بلکہ ڈش پر ان کی گرفت اس کشمکش کے دوران مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی۔ ہمارے سامنے والی نشست پر وزیر اعظم کے پریس سیکرٹری جناب مفتی جمیل میاں اچکن پہنے چھری کانٹے سے کیلا کھا رہے تھے۔ ان کے تتبع میں ہم نے بھی کوشش کی، مگر کیلا پھسل کر تین نشستیں دور مسعود شورش کی پلیٹ میں جا گرا جو انہوں نے ہمارے شکریے کے ساتھ منہ میں ڈال لیا۔ مگر ہمارا ارادہ حوصلہ ہارنے کا نہیں، ہم انشاء اللہ آئندہ دو تین محفلوں میں باقی اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہو جائیں گے اگر ہمیں بلایا گیا۔

اور اب آپ سے کیا پردہ، یہ کالم لکھتے وقت حاشا وکلا یہ سب کچھ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بلکہ کالم کا دھارا خود بخود اس طرف مڑتا چلا گیا، اور ظاہر ہے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اس سے ایک تو دوسرے ''رنگروٹوں'' کو بھی پروٹوکول کی باریکیوں کا علم ہو جائے گا اور یوں وہ آئندہ زندگی میں ہمارے ممنون ہوں گے اور دوسرے فرداً فرداً سب احباب کو یہ بتلانا ممکن نہیں تھا کہ ہمیں اربابِ اقتدار کا کس قدر قرب حاصل ہے۔ اس کالم کے بین السطور سے انہیں ہمارے تعلقات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ مزید تفصیلات کے لیے براہِ کرم ہم سے براہِ راست رجوع فرمائیں۔ (۱۵ مئی ۱۹۸۶ء)

ایک لاکھ رضا کاروں کی پیشکش!

چند روز پیشتر جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی کے ایک بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی پارٹی عنقریب ایک لاکھ رضا کار برادر مسلم ملک لیبیا بھیجنے کا انتظام کر رہی ہے، جس میں زیادہ تر سابق فوجی ہوں گے۔ مولانا کا یہ بیان پڑھ کر ایک پنجابی محاورے کے مطابق ہمارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ کیونکہ لیبیا پر امریکہ کے سفاکانہ حملے کے بعد سے ہماری حکومت اور ہمارے لیڈروں کے محض خالی خولی بیان آ رہے تھے، جس میں لیبیا اور صدر قذافی سے اظہار ہمدردی کیا جا رہا تھا اور اس طرح کے اظہار ہمدردی کی جو حیثیت ہے، ہم آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ خدا مولانا کو خوش رکھے کہ انہوں نے اس ضمن میں عملی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا اور مختلف شہروں سے رضا کار جمع کرنے کا کام شروع بھی کر دیا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ اس کالم کی اشاعت تک جمعیت علمائے پاکستان کے ایک لاکھ مسلح کارکن لیبیا کی مدد کے لیے روانہ بھی ہو چکے ہوں اور یہ کارکن اناڑی بھی نہیں بلکہ ان کی زیادہ تر تعداد سابق فوجیوں پر مشتمل ہے اور یوں جنگ کی جدید تکنیک پر مہارت رکھتی ہے۔

تاہم ہماری دعا ہے کہ ہمارے کالم کی اشاعت تک مولانا اپنے ایک لاکھ مسلح رضا کاروں کی محاذ جنگ پر روانہ نہ کر پائیں۔ کیونکہ اس ضمن میں ہم چند مفید مشورے دینا چاہتے ہیں جن کا تعلق اتنی بڑی فورس کے صحیح اور مکمل استعمال سے ہے۔ سو اس سلسلے میں ہمارا پہلا مشورہ یہ ہے کہ مولانا یہ پوری فورس لیبیا کے لیے روانہ نہ کریں۔ کیونکہ جانباز

۳۱۳ بھی ہوں تو وہ کفار کا منہ پھیر دیتے ہیں۔ یہاں تو ایک لاکھ سرفروش ہیں جنہیں جنگ کا تجربہ بھی ہے اور وہ مولانا نورانی کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ لہٰذا فی الحال وہ ان میں سے پچاس ہزار جانباز لیبیا کے بھائیوں کے لیے بھیجیں اور باقی پچاس ہزار افغانستان کے محاذ پر بھیجنے کا انتظام کریں تا کہ امریکہ اور روس دونوں کو اندازہ ہو جائے کہ پاکستان کی صرف ایک دینی جماعت بھی اگر ان کا ناطقہ بند کرنے پر تل جائے تو وہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

اس ضمن میں ہمارا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اگر فوج بنانے پر تل ہی گئے ہیں تو ایک لاکھ کی بجائے ''کوڑا گھٹ'' کر کے دو لاکھ رضا کار جمع کر لیں اور انہیں کشمیری بھائیوں کو بھارتی سامراج کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے کشمیر بھیجیں۔ یہ بات ہم مولانا نورانی سے محض اس حسن ظن اور عقیدت کی بنا پر کر رہے ہیں، جو ہمارے دل میں ان کے لیے ہے۔ کیونکہ کشمیر کے متعلق پاکستانی حکومت اور ہمارے سیاست دانوں نے کافی عرصے سے مکمل سرد مہری کا رویہ اپنایا ہوا ہے جبکہ مولانا نورانی کے بیان میں ہمیں روشنی کی ایک جھلک نظر آئی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ کشمیر اگر آزاد ہوگا تو وہ بھی مولانا نورانی کے مضبوط و بابرکت ہاتھوں سے ہوگا۔ لہٰذا مولانا سے دست بستہ گزارش ہے کہ وہ اپنی فورس میں سے کم از کم پچاس ہزار گوریلے کشمیر کے محاذ پر بھی ضرور بھیجیں تا کہ یہ سہرا بھی مولانا ہی کے سر بندھے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ انسان کے سارے ارادے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ مولانا کو ایک لاکھ رضا کار پاکستان میں کسی ایک مقام پر جمع کرنے اور پھر وہاں سے انہیں لیبیا بھجوانے میں تاخیر ہو جائے اور یوں مولانا کی کمک بروقت نہ پہنچ سکے۔ اس صورت میں مولانا کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ پاکستان میں باطل قوتیں ایک عرصے سے سرگرم عمل ہیں اور انہیں ''نتھ'' ڈالنے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ مولانا کے پاس سرفروشوں کی جو اتنی بڑی تعداد موجود ہے، اسے پاکستان میں سرگرمِ عمل کیا جا

سکتا ہے اور یوں اسلامی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی جا سکتی ہے بلکہ سرفروشوں کی اتنی بڑی تعداد کی موجودگی میں تو فوری انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مولانا سے درخواست ہے کہ وہ پاکستان میں موجود باطل قوتوں کو شکست دینے کے لیے ''مصلیٰ'' جدوجہد کی بجائے اب ''مسلح'' جدوجہد کا آغاز کریں۔

یہ کالم لکھتے ہوئے ایک بات رہ چلی تھی اور وہ یہ کہ اس سے پہلے ہمارے سیاسی رہنما متعدد مواقع پر لاکھوں رضا کار مختلف محاذوں پر بھجوانے کا اعلان کرتے آئے ہیں، جن میں سے عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر تو خصوصاً بے شمار رہنماؤں نے دو دو چار چار رضا کار بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ رضا کاروں کا ایک دستہ تو مارچ پاسٹ کرتا ہوا لاہور کی سڑکوں پر نظر بھی آیا اور ان کے سالار نے ایک راہگیر کے سوال پر بتایا کہ وہ اپنے عرب بھائیوں کی مدد کے لیے مصر جا رہے ہیں اور پیدل جا رہے ہیں۔ اس پر راہگیر نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر پیدل جانے کا ارادہ ہے تو پھر بیڈن روڈ کی طرف سے جائیں۔ شارٹ کٹ رہے گا لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، یہ دکھاوے کے اعلانات تھے، جو سیاسی رہنما جھوٹ سچ کی پروا کیے بغیر ایسے مواقع پر دیتے ہیں۔ تاہم جہاں تک مولانا شاہ احمد نورانی کا تعلق ہے، وہ محض سیاسی رہنما نہیں، مذہبی رہنما بھی نہیں۔ لہٰذا ہمیں توقع ہی نہیں، یقین ہے کہ ان کے قول اور فعل میں قطعاً کوئی تضاد نہیں۔ انہوں نے اگر ایک لاکھ رضا کار لیبیا بھجوانے کا اعلان کیا ہے تو اب کچھ بھی ہو جائے، وہ اپنا کہا پورا کر کے دکھائیں گے تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ ایک سیاسی رہنما اور ایک دینی رہنما کے دعوے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اب معاملہ چونکہ دینی حمیت کا آ پڑا ہے، لہٰذا کالم کے آخر میں ایک پیشکش ہماری طرف سے بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر عین وقت پر مولانا شاہ احمد نورانی کے کچھ رضا کار خدانخواستہ بیمار و یمار ہو جائیں یا بصورت ملازمت چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے ان میں سے کچھ لیبیا نہ جا سکیں یا اسی طرح کی کوئی اور مجبوری پیش آ جائے تو ایک عاجزانہ سی پیشکش کے طور پر چالیس ہزار رضا کار ہماری طرف سے قبول فرمائیں۔ جی تو

چاہتا تھا کہ ہم کچھ اس سے زیادہ پیش کرتے، لیکن تنگی وقت کی وجہ سے اس ننگ اسلاف کی درخواست پر فی الحال اتنے سرفروش دستیاب ہیں۔ جب مولانا شاہ احمد نورانی اپنے رضا کار پورے کر لیں، اپنے کسی عقیدتمند سے کہیں کہ وہ ہمیں ایک ٹیلی فون کر دے، باقی ماندہ رضا کار ہم انشاء اللہ اسی وقت ارسال کر دیں گے۔ تاہم اس ضمن میں ہماری ایک چھوٹی سی درخواست ہے اور وہ یہ کہ ہمارا نام صیغہ راز میں رکھا جائے۔ بلکہ خود مولانا شاہ احمد نورانی کو بھی یہ اعلان برسرِ عام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ کل کلاں کوئی کم ظرف حریف ہم پر اور مولانا شاہ احمد نورانی پر یہ الزام نہ لگائے کہ ہم نے اتنی بڑی تعداد میں اپنے کارکنوں کو مسلح کر دیا ہے بلکہ وہ اتنے تربیت یافتہ بھی ہیں کہ باقاعدہ محاذ جنگ پر بھی داد شجاعت دے سکتے ہیں۔ مولانا نے اپنے راز کو راز نہیں رہنے دیا۔ ہم اپنی اس ستر پوشی پر بہرحال ان کے بہت ممنون ہوں گے۔

۳۰/اپریل ۱۹۸۶ء

کھر کے بچے......!

ان دنوں پنجاب کے رہنما اور پیپلز پارٹی کے سابق رہنما غلام مصطفیٰ کھر خبروں میں بہت ''ان'' جا رہے ہیں۔کوئی اخبار اُٹھا کر دیکھ لیں، ان کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور نظر آئے گا۔تاہم پہلے سارا فوکس ان کی سیاسی زندگی کے حوالے سے تھا، اب یہ فوکس ان کی عائلی زندگی پر ہے۔انہوں نے اپنی ساتویں بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اخباروں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔حالانکہ یہ ان کا سراسر نجی معاملہ ہے۔ایک دفعہ امریکہ میں ایک بی بی نے ہمیں کوئی عرب شیخ سمجھ کر ہم سے ہماری بیویوں کی تعداد پوچھی۔ہم نے کیلکولیٹر سے حساب کتاب کر کے کوئی گیارہ سو کے قریب بتائی۔اس پر وہ بی بی اتنی حیران ہوئی کہ اس نے قریباً چیخ کر کہا ''گیارہ سو؟ یہ کیوں؟'' ہم نے کہا ''اس لیے کہ غریب آدمی ہوں۔اس سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکتا!'' غلام مصطفیٰ کھر بھی ہماری طرح غریب آدمی ہیں، انہوں نے زندگی میں بہت سی عائلی خدمات انجام دی ہیں۔لہٰذا اس حوالے سے ان پر تنقید کی کوئی گنجائش نہیں۔

تاہم یہ کالم تعدادِ ازدواج کے حوالے سے نہیں، ان کے بچے کے حوالے سے لکھ رہے ہیں جو ان کی ساتویں بیوی محترمہ تہمینہ کے بطن سے ہیں اور جن کے بارے میں مسلسل خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ کھر نے انہیں یورپ سے پاکستان بھیج دیا ہے اور ان دنوں وہ فلاں جگہ پر ہیں یا فلاں جگہ پر نہیں ہیں۔چنانچہ آج کل ہر روز اخباروں میں ایک سرخی ''کھر کے بچے'' سے شروع ہوتی ہے اور اس کے آگے وہ ممکنہ مقام لکھا ہوتا ہے، جہاں یہ بچے رکھے گئے ہیں۔اب تک اس سلسلے میں جو پیش گوئیاں کی جا چکی ہیں،

ان کے مطابق کھر کے بچے پاکستان میں اکبر بگٹی کے صاحبزادے کی تحویل میں ہیں۔ ان کے مطابق غلام جتوئی کے گاؤں میں ہیں اور ان کے مطابق اپنے چچا عربی کھر کے پاس ہیں، لیکن ہمارے خیال میں پیش گوئی کا سب سے زیادہ حق ہمیں پہنچتا ہے۔ کیونکہ ہم بفضل تعالیٰ اصلی تے وڈے پیرزادڈے ہیں۔ چنانچہ ہماری پیش گوئی یہ ہے کہ کھر کے بچے ان دنوں مری میں ان کے ایک پٹھان دوست کی تحویل میں ہیں اور آج کل سکول میں ان کے داخلے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہ پیش گوئی پورے دھڑلے سے ہم نے اس لیے بھی کر دی ہے کہ اگر شرمندگی ہوگی تو وہ ہم سب پیش گوئی کرنے والوں میں برابر تقسیم کر دی جائے گی اور یوں بہت کم ندامت ہمارے حصے میں آئے گی جبکہ پیش گوئی درست نکلنے کی صورت میں ہماری گڈی اُونچی چڑھ جائے گی کہ ملکی سیاست میں پیر پگاڑو کے بعد دوسرا مقام ہمارا ہوگا۔ ایک دوست ہیں، انہیں اپنے خوابوں کے سچا ہونے پر اتنا یقین ہے کہ وہ انہیں جھوٹا ثابت ہونا برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جو خواب دیکھتے ہیں، اسے پورا کرنے کے لیے دعاؤں کے علاوہ عملی جدوجہد بھی شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے خواب دیکھا کہ زلزلے سے ہزاروں مکان گر گئے ہیں اور لاکھوں لوگ مر گئے ہیں بس اسی دن سے جب کبھی کوئی چھوٹا موٹا زلزلہ آتا ہے، وہ فوراً سربسجود ہو جاتے ہیں اور سجدے سے سر اُٹھانے کے بعد پہلا سوال یہ پوچھتے ہیں ''کتنا نقصان ہوا؟'' جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا تو اُداس ہو جاتے ہیں مگر پھر پورے عزم سے کہتے ہیں ''انشاء اللہ ہوگا'' ہمارا معاملہ بھی ہمارے ان دوست سے ملتا جلتا ہے۔ ہم بھی پیش گوئی کرنے کے بعد اسے پورا کرنے پر تل جاتے ہیں۔ تاہم اگر غلام مصطفیٰ کھر کے بچے ہماری پیش گوئی کے مطابق واقعی مری میں پائے جائیں تو براہِ کرم یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے انہیں اغوا کر کے وہاں پہنچا دیا ہے بلکہ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہی سمجھا جائے کہ آخر ایک پیرزادے کی پیش گوئی تھی، غلط کس طرح ہو سکتی تھی؟

یہ کالم لکھتے ہوئے مسلسل ایک خیال ہمیں تنگ کر رہا ہے کہ سیاست اور صحافت اتنی سنگدل کیوں ہوتی ہے۔ یعنی سیاست میں لوگوں کے نجی معاملات بھی ان کے نجی

معاملات نہیں رہتے۔ حتیٰ کہ یورپ میں بھی نہیں رہتے، جہاں نجی معاملہ ''مقدس گائے'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ غلام مصطفیٰ کھر ان دنوں اپنے ایک عائلی پرابلم کی وجہ سے جس ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں، اس پر ان سے ہمدردی کرنے کی بجائے سیاسی لوگ اس معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہے ہیں۔ اسی طرح صحافت بھی ایسے معاملات کی ٹوہ میں رہتی ہے اور ماں باپ اور بچوں جیسا نازک اور جذباتی معاملہ بھی خبروں اور کالموں کو موضوع بن رہا ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی ضمیر کی پوری خلش کے ساتھ ہم خود بھی یہ کالم لکھ رہے ہیں کیونکہ ضمیر انسان کو برے کام سے نہیں روکتا۔ صرف برے کام کا مزا کرکرا کرتا ہے۔ چنانچہ ضمیر کی خلش کی وجہ سے ہم اس کالم کا مزا بھی کرکرا کر رہے ہیں۔ دراصل غلام مصطفیٰ کھر شروع سے اس معاملے میں بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔ آج کل تو ان کے بچوں کا معاملہ ہے، جو اپنی ماں سے بھی دور ہیں اور یوں یہ دونوں ان کی جدائی میں تڑپ رہے ہیں مگر لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ اپنے بیانات سے ماں کے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے اور دوسرا گروپ باپ پر طعن و تشنیع کر رہا ہے۔ اسی طرح جب غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر تھے، اس وقت سمن آباد کی دو بچیاں ان کے خلاف پراپیگنڈے کا باعث بن گئیں۔ کہا گیا کہ انہیں اغواء کر کے گورنر ہاؤس لے جایا گیا ہے اور اس وقت وہ گورنر ہاؤس میں موجود ہیں بلکہ رانا نذر الرحمٰن تو ان بچیوں کی بازیابی کے لیے ایک جلوس لے کر گورنر ہاؤس بھی پہنچ گئے تھے۔ حاکم اعلیٰ اپنی رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر کو اس الزام تراشی سے کتنا صدمہ ہوا ہوگا اور اس کے ساتھ گورنری کا مزا بھی کچھ دیر کے لیے کرکرا ہو گیا ہوگا۔ اب وقت نے ان کے حقیقی بچوں کو ایک افسوس ناک صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ ماں اور باپ دونوں سے دور کسی خفیہ مقام (یعنی مری) پر مقیم ہیں اور اخباروں کی سرخیاں ''کھر کے بچے ... '' سے شروع ہو رہی ہیں۔ بچے ہوں یا قوم کی بچیاں ہوں۔ یہ ہم سب کی مشترکہ امانت ہیں خدا کرے ایک خبر ان دنوں ''کھر کے بچے ... سے شروع ہو اور مکمل اس طرح ہو کہ کھر کے بچے اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئے'' کہ بڑوں کی غلطیوں کی سزا ان کے بچوں کو بہرحال نہیں ملنی چاہیے! (۲۷ جون ۱۹۸۶ء)

غزوۂ احد

ہمارے دوستوں میں بڑے ''ون سونے'' لوگ ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر ساری ''کلفتیں'' دور ہو جاتی ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں دیکھ کر محلے بھر کی کلفتیں سینے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہمارے دوستوں میں رند بھی شامل ہیں اور زاہد خشک بھی اور ہم جب ان سے ملتے ہیں تو لگتا ہے کہ رنگ برنگی روشنیوں میں گھر گئے ہیں لیکن ان سطور میں ہم اپنے جس دوست کا ذکر کرنے لگے ہیں، وہ بہت عبادت گزار ہیں۔ پنج وقت نماز ادا کرتے ہیں، تمام روزے رکھتے ہیں، شراب نہیں پیتے، اس کام کے قریب بھی نہیں جاتے جس کی شرعی سزا اسی کوڑے ہے۔ گو ہم ذاتی طور پر تو نہیں جانتے مگر ان کے بارے میں عام اطلاع یہی ہے کہ وہ بہت ایماندار بھی ہیں۔ حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے بچوں کو رزق حلال پر پالا ہے۔

ہمارے اس دوست میں صرف یہی خصوصیات نہیں ہیں بلکہ ایک بہت اچھی بات جو ہم نے ان میں دیکھی، وہ یہ بھی ہے کہ ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ان میں غرور نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ اپنے سے کم تر منصب پر فائز لوگوں کو بھی محبت اور گرم جوشی سے ملتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کے پروٹوکول کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ وہ لوگوں کے کام بھی آتے ہیں، دوستیاں بھی پالتے ہیں۔ وہ زاہد خشک بھی نہیں بلکہ بہت شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ایک حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ شدید مذہبی رجحانات

کے حامل ہونے کے باوجود انہیں نور جہاں کا گانا بھی پسند ہے۔ وہ ادیبوں، دانشوروں، کھلاڑیوں اور دیگر تمام شعبوں کے نمایاں افراد سے میل ملاقات میں مسرت بھی محسوس کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں اپنے اہل خاندان سے بھی بہت محبت ہے اور اپنی تمام تر مصروفیات میں سے وقت نکال کر وہ اپنے بچوں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ ان کی ذات میں چند کمزوریاں بھی ہیں۔ یہ کمزوریاں غالباً کام کی زیادتی کی وجہ سے ہیں مگر ہم یہاں ان کی کمزوریوں کا نہیں، صرف خوبیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور جتنی خوبیاں بھی یاد تھیں، وہ اُوپر ہم نے بیان کر دی ہیں۔ اب لے دے کر ہمارے پاس یونس احقر کا حوالہ رہ گیا ہے۔ یونس احقر ہمارا بہت عزیز دوست ہے۔ پنجابی کا معروف شاعر اور انتہائی بھلا مانس شخص! وہ بھی ہمارے اس دوست کی ان خوبیوں کا قائل ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ مناصب پر فائز لوگوں میں اس درجے کے عبادت گزار لوگ بہت کم ہیں مگر اس کا خیال ہے کہ انسان کو صرف متقی، پرہیز گار اور معاملات میں ایماندار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ہر طرح کی سچوایشن میں اپنے اس کردار کی خوبیاں منعکس کرنا چاہئیں۔ وہ اس سلسلے میں غزوۂ احد کا حوالہ بھی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جن کی ڈیوٹی درے کی حفاظت پر ہو، انہیں وہاں سے ہلنا نہیں چاہیے کہ غزوۂ اُحد میں ایسا ہوا تھا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی تھی۔

اپریل ۱۹۸۰ء

شیر افگن یا نور جہاں؟

۱۹۵۳ء میں جب تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کو فوجی عدالت کی طرف سے سزائے موت سنائی گئی تو ایک ستم ظریف نے اس پر بہت دلچسپ تبصرہ کیا۔ اس نے کہا کہ مولانا عبدالستار خاں نیازی کو سزائے موت اس لیے سنائی گئی کہ انہوں نے تحریک میں حصہ کیوں لیا اور مولانا مودودی کو اس لیے کہ انہوں نے تحریک میں حصہ کیوں نہیں لیا؟ ایک اچھا جملہ محض مزہ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی صداقت یا عدم صداقت پر زیادہ غور نہیں کرنا چاہیے۔ سو ہم نے بھی اس جملے کا مزہ لیا لیکن تیس سال بعد یہ جملہ ہمیں آج کچھ وزیروں کے الیکشن میں حصہ لینے اور کچھ وزیروں کے الیکشن میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے یاد آ رہا ہے۔ کیوں کہ ہمارے ممدوح میر علی احمد تالپور وزارت سے اس لیے محروم ہو گئے کہ انہوں نے الیکشن میں حصہ کیوں لیا اور ہمارے دوسرے ممدوح ڈاکٹر افضل وزارت سے اس لیے جائیں گے کہ انہوں نے الیکشن میں حصہ کیوں نہیں لیا؟ گویا علامہ اقبال نے جب کہا تھا:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

تو غالباً ان کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی۔ ہمارے خیال میں ہمیں اپنے قلم کو اب یہیں روک لینا چاہیے۔ کیونکہ رزم حق و باطل میں مومن کو فولاد نہیں بلکہ نیوٹرل ہونا چاہیے اور یوں بھی جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ لہٰذا اب یہ جنگ کے بعد کا مکہ ہے،

ویسے بھی رسم دنیا یہ ہے کہ اقتدار میں آنے والوں کو خوش آمدید کہا جائے۔ اقتدار سے رُخصت ہونے والوں کے لیے کلمہ خیر کہنا یوں بھی مشرقی آداب کے منافی ہے۔

سو ہم اقتدار میں آنے والوں کو انشراح صدر سے خوش آمدید کہتے ہیں مگر ہمیں تو ابھی تک یہ پتہ نہیں چل رہا کہ اقتدار میں کون آ رہا ہے۔ بس روزانہ یہ خبریں پڑھ رہے ہیں کہ فلاں رُکن اسمبلی کے ساتھ اتنے ارکان اسمبلی ہیں اور فلاں کے ساتھ اتنے۔ لہٰذا فلاں اقتدار میں آ رہا ہے۔ چنانچہ ہم ان دنوں صبح اخبار پڑھتے ہی کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور حساب لگاتے ہیں کہ کس کے ساتھ ارکان اسمبلی زیادہ ہیں۔ اس کے بعد ہم اس کے نام مبارک باد کا ایک تار لکھتے ہیں، جس کا مضمون کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ ''اے آمدنت باعث آبادی ما!'' مگر اس اثناء میں نظر کسی دوسری خبر پر پڑ جاتی ہے۔ جس میں کسی دوسرے اُمیدوار نے اپنے ''ہم خیال'' ارکان اسمبلی کی تعداد زیادہ بتائی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم ارادہ باندھتے ہیں کہ ''آمدنت باعث آبادی ما'' والا تار اس دوسرے اُمیدوار کو بھیجنا چاہیے اور پہلے اُمیدوار کو ہم ''آبادی ما'' کی بجائے ''بربادی ما'' والا تار بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس دوران تیسرا اُمیدوار پہلے سے زیادہ کے دعووں کے ساتھ سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور یوں ہم مسلسل کشمکش و پیچ میں ہیں۔ لہٰذا جن صاحب نے بھی اقتدار میں آنا ہے وہ براہِ کرم ہمیں صاف صاف بتائیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا صحیح تار غلط شخص کو اور غلط تار صحیح شخص کو موصول ہو جائے اور ظاہر ہے اس ''غریب مار'' سے کسی اُمیدوار کو فائدہ نہیں ہوگا۔

ویسے انہی دنوں میں ہم نے اخبار میں ایک خبر اس سارے معاملے سے ہٹ کر بھی پڑھی ہے۔ یہ خبر عین الیکشن کے دنوں میں پیدا ہونے والے اس بچے کے بارے میں ہے جس میں مردانہ اور زنانہ اعضاء بیک وقت پائے جاتے ہیں اور یوں اس میں مردانہ اور

زنانہ دونوں خصوصیات موجود ہیں، لہٰذا بچے کے والدین کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اس کا نام شیر افگن رکھیں کہ نور جہاں رکھیں۔ ڈاکٹروں نے والدین کو مشورہ دیا ہے کہ وہ فی الحال کچھ عرصہ انتظار کریں، کیونکہ اگر اس بچے میں مردانہ ہارمونز اکثریت میں ہو گئے تو یہ مرد ہو جائے گا اور اگر اس میں زنانہ ہارمونز غالب آ گئے تو یہ عورت بن جائے گی۔ بس یہ خبر پڑھنے کے بعد سے ہمیں بھی تھوڑا سا قرار آ گیا ہے اور ہم نے جو تارڈ رافٹ کر کے رکھا ہوا ہے، اسے مزید کچھ عرصے کے لیے ''سرد خانے'' میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ ابھی مکتوب الیہ کے سلسلے میں ''ہی'' (HE) ''شی'' (SHE) کا فیصلہ ہونا ہے۔ وہ اس لیے کہ جو ارکان اسمبلی منتخب ہو کر آئے ہیں ان کی جنس کے بارے میں تا حال وہی کنفیوژن ہے، جو اس بچے کے بارے میں ہے۔ کیونکہ ہمیں ان میں بھی مردانہ اور زنانہ اوصاف دونوں نظر آ رہے ہیں، اگر تو ان میں مردانہ اوصاف غالب آ گئے تو پھر مردانہ اسمبلیاں وجود میں آئیں گی اور یوں ان کا قائد بھی کوئی مرد ہوگا اور اگر ان میں زنانہ ہارمونز زیادہ نکلے تو پھر زنانہ اسمبلیاں بنیں گی، لہٰذا ہمیں اپنا مبارک بادی کا تار فی الحال روک کر رکھنا ہوگا۔ ایک میراثی کے ہاں پے در پے لڑکیاں پیدا ہو رہی تھیں، جبکہ ہر دفعہ وہ پیش گوئی کرتا تھا کہ اس دفعہ لڑکا پیدا ہوگا مگر بچارا ہر دفعہ شرمندہ ہوتا، حتیٰ کہ جب اس کے گھر آٹھویں لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے اپنی گھر والی سے کہا کہ بھلئے لوکے، اب ہماری عزت اسی میں ہے کہ ہم اس بچی کو مردانہ کپڑے پہنائیں اور لوگوں سے یہی کہیں کہ ہمارے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے، چنانچہ یہی مشہور کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ اسے لڑکا دیا ہے۔ چنانچہ لوگ جوق در جوق اسے مبارک دینے کے لیے آنے لگے، مگر شومئی قسمت کہ یہ راز کسی طرح کھل گیا کہ میراثی کے ہاں لڑکا نہیں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے اسے جھوٹ پر بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ تم تو کہتے تھے کہ لڑکا پیدا ہوا ہے، جبکہ یہ تو لڑکی ہے اس پر میراثی نے کہا ''موتیاں والیو! پیدا تو میرے گھر لڑکا ہی ہوا ہے، مگر وہ ذرا ماں پر گیا ہے۔'' سو ہمیں ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر خدانخواستہ اس دفعہ بھی ہماری

اسمبلیاں زنانہ نکلیں تو کہیں ان کے ''گھر والے'' بھی مردانہ کپڑے پہنا کر انہیں مرد مشہور نہ کریں اور اگر کبھی یہ راز افشا ہو جائے تو اس کی بھی وہی توجیہہ پیش کریں جو متذکرہ میراثی نے پیش کی تھی!

خیر، یہ میراثی کا تذکرہ تو اس سنجیدہ مسئلے میں یونہی آ گیا، کیونکہ ہم تو اب کالم کے آخر میں ''اولادِ نرینہ'' کے لیے دعا کرنے لگے تھے، ہمیں لڑکیوں سے کوئی چڑ نہیں مگر لڑکے کی دعا اس لیے کر رہے تھے کہ آگے اولاد کا سلسلہ انہی سے چلنا ہے چنانچہ اگر یہ اسمبلیاں بھی ''زنانہ'' ثابت ہوئیں تو اچھا نہیں ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ جو آٹھ سال بعد ہم نے رو رو کر اسمبلیاں حاصل کی ہیں۔ یہ ''شیر افگن'' ثابت ہوں اور اس شیر افگن کو کسی جہانگیر کی نظر نہ لگے اور اگر یہ اسمبلیاں خدانخواستہ ''نور جہاں'' نکلیں تو ہمیں ڈر ہے کہ شہزادہ سلیم نے اگر ان سے پوچھا کہ کبوتر کس طرح اُڑ گیا، تو اس نور جہاں نے مٹھی کھول کر دوسرا کبوتر بھی اُڑا دینا ہے کہ ''اس طرح اُڑ گیا'' تو پھر اس صورت میں ہم مبارک باد کا تار کسے بھیجیں گے؟

✧ ✧ ✧

ہیجڑوں کے انتخابات

قصور میں گزشتہ ہفتے ہیجڑوں کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا جس میں اندرون پنجاب سے نمائندہ ہیجڑوں نے شرکت کی۔ ہیجڑوں کا یہ اجتماع ان کے گرو کے چہلم کے موقع پر ہوا اور اس میں نئے گرو کا چناؤ کیا گیا۔ گرو کے چناؤ میں حصہ لینے والے بزرگ ہیجڑوں کے نام مخفی رکھے گئے۔ چناؤ کے وقت ہیجڑوں کے علاوہ کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی، چنانچہ چناؤ کے بعد بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے کس ہیجڑے کو اپنا گرو بنایا ہے۔ انتخاب کے بعد چاندی اور سونے کے منکوں کیساتھ گرو کی رسم ادا کی گئی اور ناچ گانے کی ایک ٹولی نے جب ایک پرانا گانا ''رم جھم برسے بادل وا'' گایا تو عین اسی وقت بارش شروع ہوگئی اور اس ٹولی پر لوگوں نے ہزاروں روپے برسائے!

ہمیں اس خبر کی اشاعت پر نہ صرف یہ کہ کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمارے نزدیک اس خبر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نامہ نگار نے ہیجڑوں کے گرو کے انتخاب کی یہ خبر عین ان دنوں میں ارسال کی، جب سات سال کے طویل مارشل لاء کے بعد انتخابات کی آمد آمد کا اعلان کیا جا رہا ہے، چنانچہ ہمیں یہ خبر کم اور Suggestion زیادہ لگتی ہے، یعنی اس خبر کی آڑ میں تجویز یہ کیا گیا ہے کہ اگر انتخابات کرانے ہی ہیں تو ایسے کراؤ جیسے ہیجڑوں کے انتخابات ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک اس خبر میں الیکشن کے طریق کار کے بارے میں بالواسطہ طور پر کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں اور وہ کچھ اس نوع کی ہیں:

۱۔ جن اُمیدواروں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دی جائے، ان کے

بارے میں پہلے یہ تسلی کر لی جائے کہ وہ مکمل ہیجڑے ہیں اور ان میں مردانگی کی رمق تک باقی نہیں۔

۲- اُمیدواروں کے علاوہ ووٹروں کے بارے میں بھی یہ یقین دہانی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ مکمل طور پر ہیجڑے ہیں۔

۳- جب انتخابات مکمل ہو جائیں اور لیڈر کا انتخاب کر لیا جائے تو اس منتخب لیڈر کا ہر قول اور فعل اس امر کی مکمل ضمانت ہو کہ وہ ہیجڑا ہے اور یوں چناؤ کے بعد بھی عوام کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے کس کو اپنا لیڈر چنا ہے۔

۴- جب چناؤ مکمل ہو جائے، لیڈر منتخب کر لیا جائے تو بزرگ ہیجڑوں جن کی ملک میں کوئی کمی نہیں، سے کہا جائے کہ وہ اس چناؤ پر مبارک باد دینے کے لیے ''گھوڑیاں'' گائیں اور پھر اس کے صلے میں انہیں ہزاروں لاکھوں روپے کی ''ویلیں'' دی جائیں۔

۵- ان انتخابات کے بعد جو حکومت عمل میں آئے، وہ اپنے عرصہ اقتدار کے دوران ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے دن رات پورے زور وشور سے ''رم جھم برسے بادل وا'' کا پراپیگنڈہ کرے اور اس کے لیے نئے ہیجڑے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، پرانے ہیجڑے بھی پوری وفاداری سے یہ ''قومی فریضہ'' انجام دے سکتے ہیں!

ممکن ہے ہمارے بعض قارئین ان معروضات سے ہمارے بارے میں یہ تصور قائم کریں کہ ہم ایک شکی بلکہ ''شکی القلب'' انسان ہیں اور یوں ہم نے اپنے نامہ نگار کی بھیجی ہوئی خبر کے بارے میں سراسر مفروضوں سے کام لیا ہے، تو ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایسے الزامات سے ہم ڈرنے والے نہیں ہیں، تاہم ان کی تسلی کے لیے ہم اس خبر کا آخری حصہ بھی یہاں درج کیے دیتے ہیں جس کے مطابق گرو کے انتخاب کے

موقع پر کھانے کے انتظامات بڑی خوبصورتی سے کیے گئے تھے۔ ہیجڑوں کے اس اجتماع میں شرکت کے لیے معززین شہر کو دعوت نامے بھی ارسال کیے گئے تھے قصور کے زندہ دل نوجوانوں نے باہر سے آنے والے ہیجڑوں کا استقبال کیا۔ ان کو ہار پہنائے، ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور تحائف بھی پیش کیے نیز اجتماع کے اختتام پر گرو کی طرف سے اپنے چیلوں کو سونے اور چاندی کے چھلے پہنائے گئے، سو خبر کا یہ آخری حصہ پڑھنے کے بعد قارئین کو ہمارے بارے میں یہ بدگمانی نہیں رہے گی کہ ہم نے کسی قسم کے گمان سے کام لیا ہے، کیونکہ خبر کے اس حصے میں بالواسطہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ووٹروں اور اُمیدواروں کے بارے میں یہ تسلی کر لی جائے گی کہ وہ ہیجڑے ہیں اور یوں ملک میں ہیجڑوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، تو پھر ''باہر'' سے آنے والوں کو نہ صرف یہ کہ کسی کا دھڑکا نہیں رہے گا بلکہ ان کا استقبال کیا جائے گا۔ ان کے گلے میں ہار ڈالے جائیں گے، ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جائیں گی اور انہیں تحائف پیش کیے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں نامہ نگار یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جب عوام اور حکومت دونوں ہیجڑے ہوں تو پھر ملک کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں رہتا بلکہ اس صورت میں غیر ملکی حملہ آوروں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے، گویا اس خبر کے حوالے سے ہم نے جن شکوک وشبہات کا اظہار آغاز میں کیا تھا، ان کی تصدیق اختتام پر بھی ہوتی ہے اور یوں اب ہمیں شکی یا ''شکی القلب'' کہنا درست نہیں۔

ان سطور میں ہم نے ابھی تک متذکرہ خبر میں پیش کی گئی تجاویز اور نتائج پر اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا کیونکہ یہ کام ہم آخر میں کرنا چاہتے تھے اور اس خبر میں پیش کی گئی تجاویز کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ بہت اچھی تجاویز ہیں اور الیکشن اگر کروانا ہی ہے تو وہ ان کی روشنی میں کروانا چاہیے۔ ان تجاویز کی حمایت ہم ''ذاتی'' وجوہ کی بنا پر کر رہے ہیں اور وہ ''ذاتی وجوہ'' یہ ہیں کہ ایک تو ہم خود رفتہ رفتہ ''ہیجڑوں'' کے گروہ میں شامل ہو چکے ہیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ یہ کالم ہم اسلام آباد میں بیٹھ کر لکھ رہے

ہیں۔ البتہ ان نتائج سے ہمیں اختلاف ہے جو تجاویز کے آخر میں اخذ کیے گئے ہیں، کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہیجڑے سے ہیجڑے شخص کی مردانگی بھی کبھی نہ کبھی جاگ پڑتی ہے۔ چنانچہ گزشتہ حکومت کے آخری دور میں اس کا ثبوت ملا، جب حیدرآباد کے ہیجڑے بھی سینہ تان کر بازار میں نکل آئے اور انہوں نے تالیاں بجاتے ہوئے یہ نعرے لگائے:

ایوب آیا...... میں نہ بولی
یحییٰ آیا...... میں نہ بولی
بھٹو آیا...... میں نہ بولی
دوبارہ آیا...... میں نہ بولی
چلاؤ گولی...... چلاؤ گولی!

چنانچہ متذکرہ خبر میں پیش کی گئی تجاویز کی افادیت اپنی جگہ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس طریق انتخاب کے نتیجے میں پوری کی پوری قوم حتمی طور پر بے غیرت ہو جائے گی اور یوں ملکی یا غیر ملکی حکمرانوں کو کھل کھیلنے کی مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی، ہمارے نزدیک قدرے مشکوک ہے، کیونکہ ہیجڑوں کی مردانگی کسی بھی وقت جاگ سکتی ہے اور وہ ''چلاؤ گولی، چلاؤ گولی'' کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا وفادارانہ مشورہ یہ ہے کہ ان تجاویز پر ایک دم عملدرآمد کرنے کی بجائے انہیں مزید بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور بہتر ہوگا اگر یہ تجاویز ہر دور میں موجود محض ''بزرگ'' داناؤں کے سامنے پیش کردی جائیں جو ''رم جھم برسے بادل وا'' گاتے ہوئے ان تجاویز کا خیر مقدم کریں گے اور انہیں مزید بہتر بنانے کے لیے اپنی اس دانائی کو بھی کام میں لائیں گے جو کئی حکومتوں کی بقا کے لیے کام میں آنے کے باوجود ابھی جوں کی توں ہے۔

◇ ◇ ◇

کام کی بات!

ووٹروں کی فہرست بنانے والے ادارے کو ہم کس طرح یقین دلائیں کہ ہم ماشاء اللہ عرصہ دراز سے بالغ ہو چکے ہیں بلکہ اور دس بیس سال میں تو پھر نابالغ ہونا شروع ہو جائیں گے۔ کیونکہ بچے اور بوڑھے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہمیں ان کالموں میں اپنی بلوغت کا اظہار اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ اب کے پھر ہم ووٹ ڈالنے سے محروم رہ گئے اور وجہ یہی ہے کہ ہمارا ووٹ نہیں بنا تھا۔ چلئے ۷۱ء کے انتخابات تو ہم معاف کیے دیتے ہیں کہ ان دنوں ہم امریکہ میں تھے، مگر ہمیں تو ۷۷ء کے انتخابات میں بھی کسی اُمیدوار کی خدمت کرنے یا اس سے خدمت لینے کے موقع سے محروم رکھا گیا، ایک تو ہمارے ہاں الیکشن کا رواج نہیں اگر کبھی بھولے سے کوئی حکمران یہ غلطی کر ہی بیٹھے تو اس کے کارندے ہمیں ووٹ ڈالنے نہیں دیتے۔ اب یہ بلدیاتی انتخابات تو کوئی ایسے انتخابات نہیں تھے کہ ہمارا ووٹ ڈالے جانے سے کسی اُمیدوار کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا مگر ہمیں بلدیاتی انتخابات والوں نے بھی نابالغ ہی سمجھا حالانکہ اس الیکشن میں کھڑے ہونے والے اُمیدواروں کے لیے بھی ''بلوغت'' کی کوئی شرط نہیں تھی۔ سو ہم نے یہ الیکشن ''رڑے میدان'' میں دیکھنے کی بجائے ''روزنِ دیوار سے'' دیکھا اور شیخ ابراہیم ذوق کو یاد کیا جنہوں نے فرمایا تھا۔

جھانکتے تھے ہم انہیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

اور اس سوراخ میں سے ہمیں واقعی بھڑوں کے کئی چھتے نظر آئے مثلاً گزشتہ روز ہمیں گوجرانوالہ کے ایک دوست ملے، منہ سوجا ہوا، چہرے پر خراشیں، برا حال بانکے دہاڑے۔ ہم نے پوچھا، میاں خیر تو ہے؟ بولے خیر ہے، بس ذرا ووٹ ڈالنے گیا تھا۔ ہم اس پر حیران ہوئے اور کہا ''تو کیا وہاں کسی بھڑ نے کاٹ لیا؟''

بولے ''نہیں! بھڑ نے نہیں کاٹا، مخالف اُمیدوار کے رضا کاروں نے پٹائی کی، مار کھانے کے بعد میں ڈاکٹر کے پاس گیا، وہاں سے سیدھا گھر پہنچا اور شکرانے کی دیگ چڑھائی۔''

اس پر ہم مزید حیران ہوئے اور کہا ''مار کھا کر شکرانے کی دیگ چڑھائی؟ یہ کیا بات ہوئی۔''

بولے ''اس لیے کہ وہاں تو گولیاں بھی چل رہی تھیں، میں تو خوش قسمت تھا کہ دو چار گھونسے کھا کر بخیریت لوٹ آیا، سو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا تو مجھ پر واجب تھا۔''

اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا بلکہ ایک دفعہ تو ہم نے ایک صاحب کو اس امر پر خدا کا شکر ادا کرتے دیکھا کہ جناب! ہمارے محلے کا ایک نوجوان ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے اس کی آنکھیں بچ گئیں۔

سو خواتین و حضرات! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ الیکشن بخیر و خوبی انجام پا گئے۔ بس اتنا ہے کہ کہیں کہیں کسی اُمیدوار نے خود کو ہارتے دیکھا تو گولیاں چلا چلا کر مخالف اُمیدوار کے ووٹروں کو بھگا دیا۔ فتح کا جلوس نکالا تو اس میں گولیاں چلا کر موج میلہ کر لیا، تاہم بحیثیت مجموعی انتخابات واقعی بہت پر امن ماحول میں ہوئے اور جس طرح عید کی خوشیوں میں سبھی شریک ہوئے ہیں، اسی طرح ان انتخابات میں بھی امیر، غریب، بادشاہ، وزیر سبھی شریک ہوئے، بلکہ کچھ وزیروں نے بقلم خود الیکشن لڑا اور کچھ نے لڑوایا اور یوں بادشاہ گر کہلوائے۔ ہمارا ارادہ آئندہ خود الیکشن لڑنے کا ہے اور یہ حوصلہ ہمیں ان بہت سے اُمیدواروں کو دیکھ کر ہوا ہے جو اس الیکشن میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمیں

اس سلسلے میں مزید حوصلہ ایک دوست نے دیا ہے جس کا کہنا ہے کہ الیکشن لڑنے کے لیے الیکشن کا کم اور لڑنے کا تجربہ زیادہ ہونا چاہیے اور ہمارے دوست کو ہمارے بارے میں یہ حسن ظن ہے کہ ہم خاصے جھگڑالو واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس دوست نے مشورہ دیا ہے کہ آئندہ الیکشن تک تم لڑ جھگڑ کر اپنا ووٹ بنواؤ، پھر الیکشن لڑو اور اس الیکشن لڑنے کے دوران مخالفوں کو ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم رکھنے کی پوری پوری کوشش کرو، انشاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے یہ مشورہ پلے باندھ لیا ہے، تاہم اس کے نتائج کی ذمہ داری بہر حال ہم پر نہیں! ہمارے اس دوست پر عائد ہوگی۔

ویسے ان انتخابات سے ایک بات اور بھی نکلی ہے جو ہم نے پلے باندھ لی ہے اور وہ یہ کہ الیکشن کوئی ایسا ہوا نہیں جس سے لوگوں کو ڈرایا جائے ایسے مواقع پر چھوٹے موٹے یا بعض صورتوں میں بڑے فسادات بھی ہو جاتے ہیں لیکن اگر حکمت عملی سے کام لیا جائے تو یہ واقعات خطرناک رُخ اختیار نہیں کرتے اور اس کا ایک ثبوت حالیہ بلدیاتی انتخاب بھی ہیں، لڑائی مار کٹائی بھی ہوئی ہے لیکن ایک ادارہ تو تربیت پا گیا ہے، سو اگر عام انتخابات کا انعقاد بھی عمل میں لایا جائے تو صورت حال نہ صرف یہ کہ خراب نہیں ہوگی بلکہ سنور جائے گی، ارباب اختیار اگر ہماری مانیں تو ''کوڑا گھٹ'' کر کے عام انتخابات بھی جلد از جلد کروا دیں کہ لوگ کھڑے کھڑے تھک گئے ہیں اب وہ بھی کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔

◇ ◇ ◇

عید، ٹرو اور مرو!

اس بار یار لوگوں نے عید ذرا کھل کر منائی ہے، چاند رات کو گلیوں اور بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور اگلی صبح یعنی عید کے روز چاروں اور رنگ و بو کا طوفان آ گیا تھا۔ آج عید کا تیسرا دن ہے یعنی ٹرو کے بعد مرو ہے۔ مگر رونقِ بازار پر جائیں تو پہلا دن ہی معلوم ہوتا ہے۔ احباب نے اس عید پر عید کارڈ بھی تھوک کے حساب سے ارسال کیے ہیں۔ ٹکٹیں کمیاب تھیں چنانچہ بیرنگ عید کارڈوں کا پلہ بھاری رہا۔ یوں تو ہمیں پھولوں سے لدے عید کارڈ بھی موصول ہوئے ہیں مگر اصل مزا ہمیں اس عید کارڈ نے دیا جو ہمارے اور چیئر مین بھٹو کے ایک مشترکہ "فین" نے ہمیں ارسال کیا ہے۔ عید کارڈ چیئر مین بھٹو کی ایک خوبصورت تصویر سے مزین ہے۔ چیئر مین کے گلے میں ہار ہیں اور وہ پاکستان کی سالمیت کے لیے دعا مانگ رہے ہیں۔ اندر یہ شعر لکھا ہے ؎

زندگی میں دو ہی لمحے ہم پہ گزرے ہیں کٹھن
اِک ترے آنے سے پہلے اِک ترے جانے کے بعد

عید صرف ہم آپ ہی کے لیے نہیں، دکانداروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ سو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے عید لوٹی، ہم نے ایک دکان سے تقریباً ڈھائی سو روپے کی اشیاء خریدیں۔ گھر آ کر ٹوٹل کیا تو اصل قیمت پونے دو سو روپے بنتی تھی۔ یعنی دکاندار نے دام بڑھا کر پچھتر روپے عید کی خوشی میں زیادہ وصول کیے تھے۔ ہم نے دکاندار کے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ کا پرزہ دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ اس میں پچیس روپے کا ایک آئٹم درج کرنا ابھی بھول

گیا ہے۔ ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ آیا اپنی ایمانداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے پچیس روپے مزید ادا کر کے آئیں یا اس کی ایمانداری کا امتحان لینے کے لیے اس سے پچاس روپے بقایا وصول کرنے کے لیے جائیں؟

ایک اور دکاندار نے ہمیں گولڈ لیف کا پیکٹ نو روپے میں عطا کیا، ہم نے احتجاج کرنے کی کوشش کی تو وہ اخوتِ اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھا، معانقے کے تین پھیرے مکمل کیے اور ''عید مبارک'' کہہ کر واپس اپنی گدی پر بیٹھ گیا!

اور اس معانقے سے یاد آیا کہ اس بار ہم نے عید ملنے والوں میں ''خدا ترسی'' کا جذبہ بہت غالب دیکھا ہے۔ چنانچہ کانوں کو پسلیوں کی وہ کڑکڑاہٹ سنائی نہیں دی جو عید ملتے وقت ہر سال سننے میں آتی تھی۔ بیشتر نے تو ''عید مبارک'' کہہ کر صرف مصافحے پر اکتفا کیا، کچھ دوستوں نے صرف کندھے سے کندھا لڑایا۔ جن کی محبت نے زیادہ جوش مارا یا جو زیادہ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھے انہوں نے بڑھ کر پورا معانقہ بھی کیا مگر کیا مجال جو پسلیوں کو ذرا زحمت ہوئی ہو۔ بس ایک آدھ نے سینے سے سینہ ملانے کا حق ادا کیا اور اسی سے ہم نے جانا کہ آج یومِ عید ہے۔ ورنہ ہم تو اسے ''یومِ خوف خدا'' ہی سمجھے بیٹھے تھے!

عید ملنے سے پہلے عید کی نماز پڑھنے کا معاملہ بھی درپیش تھا اور اس بار ہم نے اپنی جانماز تاک کر ایک باریش بزرگ کے پیچھے بچھائی تاکہ رکوع و سجود کے لیے ادھر ادھر دیکھنے کی بجائے سامنے دیکھا جائے۔ ہمارا یہ نسخہ کامیاب رہا کیونکہ نماز کے دوران ہمیں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ زحمت وہ مہربان خود ہی اُٹھاتے رہے۔

نماز کے بعد ہم نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ دعائیہ کلمے طویل تھے سو نمازی ''آمین'' کہنے میں عجلت سے کام لیتے تھے اور امام صاحب کا جملہ مکمل ہونے کا انتظار

نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس اجتماع میں جو دعا مانگی گئی، اس کی صورت کچھ یوں تھی:

"اے خدا! ہم گنہگار ہیں، تیرے نافرمان ہیں، آمین! ہم دنیا کے
کتے ہیں، بہت ذلیل ہیں، آمین! ہم بے حیا ہیں، بے غیرت ہیں!
آمین! ہم پستیوں میں گرے ہوئے ہیں، آمین! ہمیں سیدھا
راستہ دکھا، ہماری مشکلیں آسان کر، آمین!"

اور آخر میں ہماری دعا یہ ہے کہ اے خدا، اس میں سے صرف آخری جملے کو دعا سمجھ،
باقیوں سے صرف نظر کر کہ ہم احمق ہیں، نادان ہیں، آمین!

ایڈورڈ ہشتم اور یحییٰ خان!

حضرت احسان قریشی صابری نے ایک دفعہ بزورِ تحقیق یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ ایک اسلامی مملکت کا سربراہ صرف خاندانِ قریش ہی سے ہو سکتا ہے جس پر مصطفیٰ قریشی سے لے کر الطاف حسن قریشی تک کے چہروں پر مسرت اور اُمید کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اب ایک برطانوی پبلشر نے دعویٰ کیا ہے کہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اور ان کے خاندان کا تعلق ہاشمی خاندان سے ہے۔ اس کی تائید قطر سے شائع ہونے والے ایک عربی جریدے ''الامتہ'' (شمارہ اپریل ۱۹۸۶ء) نے بھی کی ہے جس کے ایک مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ برطانیہ کے ایک سابق حکمران بادشاہ کا نام اوفا تھا جو عربی نام ہے اور یہ بادشاہ مسلمان تھا۔ اس بادشاہ نے انگلستان پر ۷۵۷ء سے ۷۹۶ء تک یعنی ۳۹ برس حکومت کی اور اسی کے دورِ حکومت میں انگلستان کا تمام علاقہ اس قلمرو میں شامل ہوا۔ اس بادشاہ کا جاری کیا ہوا ایک سکہ جو ۱۹۴۱ء میں دریافت ہوا اس پر عربی زبان میں کلمہ طیبہ کے علاوہ ''ارسلہ بالہدیٰ و دین الحق'' والی آیت اور بادشاہ کے عربی نام ''اوفا'' کے علاوہ بسم اللہ بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ سکہ ۱۵۷ ہجری میں ڈھالا گیا۔ یہ تاریخ بھی سکے پر درج ہے اور بادشاہ کے دستخط بھی۔ ۱۵۷ء کا تطابق ۷۷۴ عیسوی سے ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تحقیق کی داد تو محققین ہی دے سکتے ہیں اور یوں اس کی تصدیق یا تردید بھی انہی کی طرف سے ہو سکتی ہے لیکن ایک جذباتی مسلمان کے طور پر ہمیں یہ جان کر خوشی بہت ہوئی ہے کہ موجودہ ملکہ الزبتھ اور ان کے خاندان کا تعلق ہاشمی خاندان سے

ہے یعنی کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔ اور اس قدر ننگِ اسلاف ہیں کہ نہ صرف اپنے آباء کے دین سے منہ موڑ چکے ہیں بلکہ انہیں اپنے ناموں کے ساتھ اپنی خاندانی نسبت لکھنے کی توفیق بھی نہیں رہی۔ چنانچہ شہزادہ چارلس کو ''شہزادہ چارلس ہاشمی'' کہلوانا چاہیے تھا کیونکہ ہمارے جی ایم سیّد اپنے تمام تر انحراف کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنے نام کے ساتھ سیّد ضرور لکھتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے سیّدوں کی ایک ایسی ایسوسی ایشن بھی بنائی ہے جس کے وہ غالباً عہدیدار بھی ہیں۔ اسی طرح کراچی کی ایک انجمن ''ساداتِ امروہہ'' جو انڈین لابی کی پناہ گاہ ہے، ساداتِ امروہہ کہلاتی ہے۔ حالانکہ یار لوگوں نے اسے ''فساداتِ امروہہ'' کا نام دے رکھا ہے۔ بہر حال ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایک تو مندرجہ بالا تحقیق حتمی طور پر درست ثابت ہو اور دوسرے برطانیہ کے اس ہاشمی خاندان کو خداوند کریم ایمان کی دولت عطا فرمائے کیونکہ اس سے ایک تو ان کی عاقبت سنور جائے گی اور دوسرے سیّد ضمیر جعفری کا وہ منصوبہ کامیاب ہو جائے گا جو انہوں نے اپنے ایک شعر ؎

میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ مغرب کی سکیم
اہلِ مغرب کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

کی صورت میں کیا تھا۔

ویسے مندرجہ بالا تحقیق تو آج منظرِ عام پر آئی ہے، لیکن شبہ ہمیں بہت پہلے سے تھا کیونکہ برطانیہ کی تاریخ اور اپنی تاریخ میں ہمیں بہت سی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ہماری تاریخ بھی قتل و غارت گری کے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور برطانوی تاریخ بھی قرن ہا قرن تک ایسے ہی خونچکاں واقعات سے ''لبریز'' ہے۔ چنانچہ اس میں بہت سے ''برادرانِ یوسف'' ہیں جنہوں نے ہوسِ اقتدار میں اپنے بھائیوں کو اُلٹا لٹکا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کا پہلا مارشل لا اور پہلا ''ریفرنڈم'' بھی برطانوی تاریخ ہی میں نظر آتا ہے جب آلیور کرامویل نے چارلس اوّل کی بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا اور بادشاہ

سلامت کو ''پھائے'' لگانے کے بعد مارشل لا لگایا۔ اس مارشل لا کو آئینی تحفظ دینے کے لیے آلیور کرامویل نے پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا، مگر پارلیمنٹ کے باہر کرنل پرائیڈ کو کھڑا کردیا جو ہر ممبر سے پوچھتا تھا کہ وہ اندر جا کر مارشل لاء کی توثیق کرے گا یا نہیں۔ اگر وہ انکار کرتا تو اسے اندر جانے سے روک دیا جاتا اور جو ممبر اقرار کرتا اسے پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جاتی اور نتیجتاً اس ''ریفرنڈم'' میں آلیور کرامویل کے مارشل لا کے حق میں سو فیصد ووٹ پڑے، تاریخ میں کرنل پرائیڈ کے اس کارنامے کو (Puridge of Pride) یعنی ''کرنل پرائیڈ کی چھانٹی'' کا نام دیا گیا۔ یہ الگ بات کہ اس فوجی انقلاب کے نتیجے میں پھانسی پانے والے بادشاہ چارلس اوّل کا بیٹا ملک سے بھاگ گیا تھا اور جلاوطنی میں اپنی قوتیں جمع کرتا رہا اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ مطلوبہ قوت حاصل کر چکا ہے تو وہ واپس برطانیہ آیا اور حکومت کا تختہ اُلٹا کر اپنے والد کے تخت و تاج کا وارث بن گیا اور پھر موصوف تاریخ میں ''چارلس دوم'' کہلائے۔

اسی طرح ہماری تاریخ میں ایک شہنشاہ صفت شاعر گزرا ہے جس نے

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا

والی بات کہی تھی یعنی محبوب کے ایک تل پر سمرقند و بخارا قربان کردیے تھے اور ایک ایسا ہی عاشق صادق برطانوی تاریخ میں بھی گزرا ہے جس نے شاعرانہ طور پر نہیں بلکہ سچ مچ اپنے محبوب پر سے تخت و تاج قربان کردیا۔ یہ فخرِ عشاق قبلہ ایڈورڈ ہشتم تھے جو رشتے میں موجودہ ملکہ الزبتھ کے تایا جان لگتے ہیں۔ موصوف ایک خاتون پر عاشق ہوئے، جس کا نام سمپسن Simpson تھا۔ یہ عفیفہ پہلے دو جگہ سے طلاق حاصل کر چکی تھی۔ فخرِ عشاق ایڈورڈ نے ان سے شادی کرنا چاہی مگر پارلیمنٹ نے ظالم سماج کا رول ادا کیا یعنی ان کی شادی کی راہ میں بہت سی آئینی رکاوٹیں کھڑی کردیں۔ اس پر ہمارے فخرِ عشاق نے شہنشاہیت کو ٹھوکر ماری اور تاج و تخت چھوڑ چھاڑ کر اپنی محبوبہ سے شادی کرلی۔ ہم نے موصوف کی تصویر دیکھی ہے اور یہ تصویر دیکھ کر فراق کا شعر یاد آیا تھا ؎

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا نہ کوئی زہرہ جبیں

تاہم واضح رہے کہ محبوب کا حسن کسی ہوس کار پر نہیں، عاشق صادق پر ہی کھلتا ہے۔ بہرحال اس عفیفہ نے طویل عمر پائی۔ چنانچہ صرف دو تین برس قبل قریباً نوے سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور اپنے پیچھے ایڈورڈ ہشتم کے وہ عاشقانہ خطوط چھوڑ گئیں جو موصوف نے ان کے نام لکھے تھے۔ چنانچہ خطوط اب کتابی صورت میں بھی دستیاب ہیں۔ جن صاحب کو ضرورت ہو وہ کسی بھی اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں۔ تاہم ہمیں شبہ ہے کہ ایڈورڈ اور سمپسن کے عشق کو ہوا دینے میں موجودہ ملکہ کے والد جارج ششم کا بھی کچھ ہاتھ ضرور ہوگا۔ کیونکہ اگر فخر عشاق اپنے عشق کی تکمیل کے لیے تاج وتخت نہ چھوڑتے تو جارج ششم کو ساری عمر حکمرانی کا موقع نہ ملتا اور یوں آج نہ سارا فرگوسن، سارا فرگوسن ہوتیں اور نہ لیڈی ڈیانا، لیڈی ڈیانا ہوتیں۔ ویسے یہ خاندان ماشاء اللہ شروع ہی سے عشق پیشہ ہے۔ ملکہ الزبتھ اوّل جنہیں ''کنواری ملکہ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے (کنواری ان معنوں میں کہ موصوفہ نے ساری عمر شادی نہیں کی) کسی کے احسان کو کبھی بھولتی نہیں تھیں۔ ایک دفعہ صرف بحری جہاز سے اُترنے لگیں تو نیچے کیچڑ تھا۔ پاس ہی ان کے خوبرو امیر البحر سر فرانس ڈریک کھڑے تھے۔ انہوں نے فوراً اپنا اوور کوٹ اُتارا اور ملکہ کے قدموں میں بچھا دیا اور یوں وہ ''آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا'' والے پچھتاوے سے بچ گئے۔ ملکہ محترمہ اس احسان کو نہ بھولیں۔ چنانچہ موصوفہ نے ساری عمر اس احسان کا بدلا احسان ہی سے دیا۔

بات چلی تھی محققین کی۔ اس تازہ تحقیق سے کہ برطانیہ کا موجودہ شاہی خاندان خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ہم نے خود کو ان محققین سے بڑا محقق ثابت کرنے کے لیے برطانوی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں باہمی مماثلتیں تلاش کرنا شروع کر دیں جن میں اگر کچھ غیر متعلق واقعات بھی آ گئے لیکن آلیور کرامویل کے

مارشل لاء اور اس مارشل لاء کی توثیق کے لیے کرنل پرائیڈ کا چھانٹی والا عمل، نیز فخر عشاق ایڈورڈ ہشتم کا ایک معمولی شکل وصورت والی عورت کے لیے تخت و تاج چھوڑ دینا بہر حال ایسے واقعات ہیں جو ہماری تلاش کردہ مماثلتوں میں خاصے اہم ہیں۔ البتہ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ برطانیہ میں تو ایک دفعہ مارشل لاء لگنے کے بعد تقریباً ہمیشہ کے لیے جمہوریت کی راہ ہموار ہوگئی اور بادشاہ صرف ''آئینی بادشاہ'' بن کر رہ گئے۔ جب کہ ہمارے ہاں ایک مارشل لاء دوسرے مارشل لاء کا جواز بن کر آتا ہے۔ اسی طرح ایڈورڈ ہشتم جیسے عاشق صادق کے مقابلے میں ہم نے یحییٰ خان جیسا ''عاشق'' پیدا کیا۔ ایڈورڈ ہشتم نے تو اپنی محبوبہ کے لیے حکومت چھوڑ دی۔ یحییٰ خان نے اپنی محبوباؤں کے لیے ملک توڑ دیا۔ بس یہاں آ کر ہماری تحقیق گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو ہماری پوری تاریخ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ جس سے ہمارا دل اُداس سا ہو گیا۔ لہٰذا ہم اس تذکرے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

امتحان میں ناکامی

گزشتہ روز ایک عزیز ہمارے پاس آئے اور کہا کہ وہ ایک اخبار کے لیے ''طالب علم امتحانوں میں فیل کیوں ہوتے ہیں؟'' کے موضوع پر سروے کر رہے ہیں لہٰذا آپ بھی اس سلسلے میں اپنی ماہرانہ رائے سے آگاہ کریں، ہم نے سوچا کہ اگر رائے دینی ہی ہے تو کیوں نہ اپنے کالم میں اس کا اظہار کریں، سو ہمارے نزدیک امتحانوں میں طلباء کے فیل ہونے کی بنیادی وجہ خود امتحان ہے یعنی اگر عزیز طلباء کا امتحان نہ لیا جائے تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک طالب علم بھی فیل نہ ہو۔ دراصل طلباء کا امتحان لینا طلباء کی صلاحیتوں اور ان کی تعلیمی استعداد پر عدم اعتماد کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ طلباء کے امتحانوں میں فیل ہونے کی دوسری وجہ ممتحن حضرات ہیں، اگر ہمارے ماہرین تعلیم عزیز طلباء پر عدم اعتماد کا اظہار کرنے پر تل ہی گئے ہیں...... یا دوسرے لفظوں میں

پھر کسی کو، پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو پھر ممتحن حضرات ایسے ہونے چاہئیں جن کے دل شفقت پدری سے معمور ہوں اور جو دوسروں اور بچوں کا بھلا چاہتے ہوں۔ مہنگائی کے اس دور میں ایسے شفیق حضرات کی کوئی کمی نہیں، چنانچہ اگر انہیں امتحانوں میں خدمت کا موقع دیا جائے اور چھاپہ مار ٹیم اور ان کے درمیان ایک مناسب فاصلہ رکھا جائے تو آپ یقین جانیں طلباء امتحانات میں کبھی فیل نہ ہوں، طلباء کے امتحانات میں فیل ہونے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے چنانچہ ذہنی

دباؤ کی وجہ سے وہ فیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر انہیں سمجھا دیا جائے کہ بیٹے! پاس ہونا یا نہ ہونا تو قسمت کا کھیل ہے، تم اپنے کھیل کود میں لگے رہو، اللہ مالک ہے تو ہمیں یقین ہے کہ اس کے بہت مثبت نتائج برآمد ہوں گے بلکہ طلباء اور معاشرے کے درمیان خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کی خاطر اگر ملازمتوں کے لیے امتحانوں میں فیل پاس ہونے کی شرط اُڑا دی جائے تو اس سے مزید اعتماد کی فضا پیدا ہو سکتی ہے، مگر کوئی ان پر اعتماد تو کر کے دیکھے۔

یہ سطور لکھتے ہوئے ہمیں یاد آیا کہ امتحانوں کے مرحلے سے صرف ''بیچارے طلباء ہی کو نہیں گزرنا پڑتا بلکہ ہمارے معاشرے کے مختلف طبقوں کو قدم قدم پر کسی نہ کسی امتحان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یوں متذکرہ عزیز نے ہم سے جو سوال کیا تھا، وہ تو خاصا ادھورا ہے مثلاً ایک طبقہ جس کے لیے روزِ اوّل سے لے کر روزِ آخر تک امتحان ہی امتحان ہیں، وہ عشاق کا ہے اور ان کے اس دکھ کو محسوس کر کے ہی اقبالؒ نے کہا تھا ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

ممکن ہے یہ دونوں مصرعے الگ الگ ہوں، مگر ہمارے نزدیک اصل شعر بہرحال اسی طرح ہونا چاہیے تھا، کیونکہ عشق میں جتنے امتحان درپیش آئے ہیں وہ ان رازدانوں ہی کی وجہ سے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ سیاست دانوں کا بھی ہے جسے زندگی میں بہت سے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے، مثلاً انہیں زبردست تحریک چلا کر مارشل لاء لگوانا پڑتا ہے اور پھر ایک دوسری تحریک کے ذریعے مارشل لاء اُتروانا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے سیاستدانوں کو جن کی ایک تعداد ماشاء اللہ اہلِ ثروت طبقے سے تعلق رکھتی ہے مگر رسم دنیا نبھانے کے لیے کبھی کبھار انہیں جیل بھی جانا پڑتا ہے۔ تحریک کے دنوں میں جلسے جلوس ہوں تو میلے کچیلے اور بدبودار لوگوں کے درمیان کچھ وقت بھی گزارنا پڑتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی کھانا پڑتا ہے یعنی زہر مار کرنا

پڑتا ہے بسا اوقات وسیع تر مفاد کے لیے اپوزیشن سے نکل کر اچانک وزیر بننا پڑتا ہے اور وزارت ہاتھ سے جاتی دیکھ کر اپوزیشن میں بھی آنا پڑتا ہے، غرضیکہ ان بے چاروں کی زندگی میں امتحان ہی امتحان ہیں، عزیز طالب علم انہیں قریب سے دیکھیں تو اپنے امتحان بھول جائیں۔

تاہم ہمارے ہاں سب سے زیادہ امتحانوں سے اگر کسی طبقے کو گزرنا پڑتا ہے تو وہ صاحبانِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ اقتدار کا حصول بجائے خود ایک امتحان ہے چنانچہ کئی اُمیدوار تو کمرہ امتحان میں پستول لے کر جاتے ہیں۔ حصولِ اقتدار کے بعد استحکام اقتدار اور زیادہ مشکل امتحان ہے کیونکہ اس کے لیے تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد قمیص کی آستین میں سے کبوتر نکالنے پڑتے ہیں۔ رسی پر سائیکل چلانا پڑتا ہے حتیٰ کہ کئی دفعہ مسخروں والی ٹوپی پہن کر رنگ میں اُچھل کود بھی کرنا پڑتی ہے۔ حصولِ اقتدار اور استحکام اقتدار کے بعد سب سے مشکل امتحان وہ ہوتا ہے جب اقتدار چھوڑنا پڑتا ہے۔ ''بھریا میلہ'' چھوڑنا سب سے مشکل کام ہے اور ہمارے ہاں اس امتحان میں آج تک کوئی ''پاسنگ نمبر'' لے کر بھی پاس نہیں ہوا چنانچہ سب کو فیل ہی کرنا پڑتا ہے اور فیل ہونے کے بعد ہی اس امتحان سے انہیں نجات ملتی ہے۔ سو ہم تو پوری دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں کہ امتحانات وغیرہ کا سسٹم یکسر ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس سے طلباء عشاق، سیاست دانوں اور صاحبان اقتدار کا وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ یوں بھی ہم مشرقی لوگوں کی ایک روایت یہ ہے کہ ہم کسی کو امتحان میں نہیں ڈالتے، چنانچہ یہ روایت ہمیں یہاں بھی نبھانی چاہیے اور حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ طلباء، عشاق، سیاستدانوں اور صاحبانِ اقتدار میں سے کسی کو بھی امتحان میں نہ ڈالا جائے تاہم اگر یہ امتحان ضروری ہیں تو پھر جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ممتحن بہت شفیق قسم کے لوگ ہونے چاہئیں تاکہ ہر ایک کو سند مل سکے اور بوقت ضرورت کام بھی آسکے۔

وغیرہ وغیرہ!

ہم نے ''سلطان السلاطین الدعا برق الظفر عرشی'' کا ایک خط جنرل ضیاء الحق کے نام پڑھا ہے جو شام کے ایک اخبار میں پورے صفحے پر شائع ہوا ہے۔ اس خط میں ان بزرگوار نے اپنے بارے میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ مامور خلیفۃ الحق، امام الزماں اور مجدد ہیں اور جنرل صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص الخاص مقربین میں سے ہیں حالیہ انقلاب وہ خود نہیں لائے بلکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس خط میں انہوں نے اپنے الہامات کی روشنی میں جنرل صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اب الیکشن کی بات ہرگز نہ کریں کیونکہ خدا نے انہیں اس کام کے لیے مامور نہیں کیا بلکہ اس نے ان سے زمانے کی امامت کا کام لینا ہے۔ ان کے ذریعے تیسری جنگ عظیم کرانی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں روس اور چین کے کروڑوں کمیونسٹوں کو مسلمان کرنا ہے، ظلمت کدہ ہند میں اسلام کی روشنی پھیلانا ہے، نیز سری لنکا میں کفر کے نشانات مٹانا ہیں!

ہمیں ''سلطان السلاطین الدعا'' کے ان الہامات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اُردو ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس خط میں استعمال ہونے والی بلیغ زبان ہمارے لیے باعث کشش ہے۔ مثلاً سلطان الدعا نے اپنے اس خط میں ایک لفظ ''وغیرہ'' کو ایسی ایسی جگہ استعمال کیا ہے کہ اس سے قبل ہم ''وغیرہ'' کے اس استعمال

سے یکسر غافل تھے۔ مثلاً ''پاکستان کا فوجی انقلاب اور آپ کا وجود'' کی ذیلی سرخی کے تحت وہ جنرل صاحب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں کہ ''عزیزی، چونکہ علیم وحکیم خدا تعالیٰ نے اپنے معجزانہ اور غیبی تصریحات وغیرہ کی راہ سے اپنے ازلی ارادوں وغیرہ کے مطابق ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان میں فوجی انقلاب کو وجود میں لا کر بھٹو وغیرہ کی حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے...... ''یا یہ کہ ''خدا کے کلام اور الہام نے کھلم کھلا طور پر یہ ظاہر و باہر کیا ہے کہ ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان کے اندر الیکشنوں کا ہونا میرے منشاء وغیرہ کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ان الیکشنوں کے لیے کوئی چارہ کیا گیا تو چارہ کرنے والوں کو اور سارے ملک پاکستان کو طرح طرح کے خطرناک نقصانات اور تباہی بربادی وغیرہ کا نشانہ بنانا پڑے گا۔ ہاں ہم اس امر پر بھی قادر ہیں کہ ایسے حالات وغیرہ پیدا کر دیں کہ ان کے نتیجے میں آئندہ الیکشن ہونے نہ پائیں۔''

یہ وغیرہ کا استعمال صرف انہی فقروں تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے بھی جگہ جگہ استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ مثلاً پاکستان کی فوجی حکومت کو ہر طرح زبردست سیاسی حمایت وغیرہ دی جائے گی۔ پاکستان کی فوج کو محض مجھ عاجز کی دعا و توجہ کی برکت سے خدا، رسول اور ملائکہ اللہ وغیرہ کی حمایت اور نصرت وغیرہ بخشی جائے گی کہ اس کے نتیجہ میں پاکستانی فوج معجزانہ فتوحات وغیرہ پائیں گی۔''

اور آخر میں ''خدائی رہنمائی کو حاصل کرنے کی راہ'' کے عنوان کے تحت سلطان السلاطین الدعا وغیرہ کا مزید استعمال کرنے کے لیے جنرل صاحب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں کہ ''میرے مکرم ومحترم عزیز اور روحانی فرزند! آپ نے اپنی تقریر میں خدائی رہنمائی کو پانے کا اشارہ بھی کیا ہے سو اس میں محض خدا اور رسول کی خاطر میں آپ کی توجہ دلاتا ہوں کہ کل انبیاء ورسل بے شمار اولیائے کرام، قرآن اور احادیث وغیرہ...... ان الہامات وغیرہ کی راہ سے خدا اور رسول کے لاکھوں اور کروڑوں علوم اور معادن وغیرہ مجھ کو حاصل ہیں۔ اس لیے آپ اپنے کل مقاصد وغیرہ میں صرف مجھ عاجز کے ذریعہ ہی خدا اور

رسول کی طرح کی رہنمائی وغیرہ پا سکتے ہیں لہٰذا میرے ساتھ رابطہ قائم کریں اور خط و کتابت اور ملاقات وغیرہ کی راہ سے میری ہر طرح کی خدمات حاصل کریں تاکید پر تاکید ہے۔
فقط والسلام

جیسا کہ ہم نے شروع ہی میں لکھا کہ ہمیں اس خط سے دلچسپی محض اس کے نادر ادبی اسلوب خصوصاً ''وغیرہ'' کے حیرت انگیز استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ ہم نہیں جانتے یہ خط جنرل صاحب کی نظر سے گزرا ہے کہ نہیں، غالباً نہیں گزرا کیونکہ ان کے بارے میں شنید ہے کہ وہ ادب اور ادیبوں کے قدردان ہیں، چنانچہ اگر انہوں نے یہ خط پڑھا ہوتا تو اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ازراہ ادب نوازی اس کا ''نوٹس ضرور لیتے، ممکن ہے ان سطور کے بعد یہ جلیل القدر خط ان کے مطالعہ میں آئے اگر ایسا ہوا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ جواب ضرور لکھیں گے اور سلطان السلاطین الدعا سیّد برق الظفر عرشی وغیرہ وغیرہ کی مزاج پرسی وغیرہ کریں گے کہ ایسے بزرگوں وغیرہ کی مزاج پرسی ضروری ہونی چاہیے۔

حضرت شاہ

حضرت شاہ ایک ایسا نام ہے جس کے آگے پیچھے اصولاً بہت کچھ ہونا چاہیے یعنی وہ تمام لاحقے اور سابقے جو کسی عرس کے اشتہار میں نظر آتے ہیں چنانچہ گزشتہ دنوں حضرت شاہ جب بریڈفورڈ سے ایک راز لیے لاہور آیا اور میں نے اس کے اعزاز میں ایک ریستوران میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تو مجھے وہاں کچھ ایسے چہرے بھی نظر آئے جو نامانوس تھے اور جنہیں میں نے مدعو نہیں کیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں ان سے پوچھتا کہ بھائی آپ نے کیسے زحمت کی ان میں سے ایک مرد شریف میری طرف آیا اور بولا ''قدوۃ السالکین مرشد کامل حضرت شاہ صاحب قبلہ تشریف لے آئے ہیں؟'' میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''برادرم یہ محفل بریڈفورڈ کے شاعر حضرت شاہ کے اعزاز میں ہے اور شاہ صاحب وہ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے حضرت شاہ کو ایک نظر دیکھا ایک سمارٹ سا نوجوان، کلین شیوڈ، سوٹ پہنا ہوا، یہ دیکھ کر موصوف کے چہرے سے عقیدت غائب ہوگئی۔ اس نے مایوسی کے عالم میں کہا ''میں نے اخبار میں ان کی آمد کی خبر پڑھی تھی مجھے کسی نے بتایا کہ حضرت سوکھے کے مریضوں کو دم کرتے ہیں چنانچہ میں تو اپنے بچے کو ساتھ لایا تھا۔''

لندن میں بخش لائل پوری کی زبان سے جب میں نے پہلی دفعہ حضرت شاہ کا نام سنا تو میرا اپنا تاثر بھی یہی تھا چنانچہ میں نے بخش سے پوچھا ''برادرم حضرت اور شاہ کے درمیان کیا ہے؟'' بخش نے کہا ''درمیان میں کچھ نہیں، پورا نام حضرت شاہ ہی ہے اور

حضرت شاہ میں بہت کچھ ہے'' اس کے بعد جب بریڈفورڈ میں غلام قادر آزاد اور ڈاکٹر طارق مرزا کی معیت میں حضرت شاہ کے ساتھ کچھ دن بسر ہوئے تو پتہ چلا کہ اس شخص کا نام ہی درویشوں والا نہیں، اس میں تو درویشوں والی بہت سی باتیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً اس میں انکساری اور عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ پنین ریڈیو کا مقبول ترین کمپیئر ہے۔ بریڈفورڈ میں مقیم پاکستانی اس کا پروگرام بڑے ذوق وشوق سے سنتے ہیں، کم گو اور شرمیلا نظر آنے والا حضرت شاہ پروگرام کرتے ہوئے بالکل کسی دوسرے رُوپ میں آ جاتا ہے، وہ ایک پُراعتماد اور آواز کے زیروبم کی نزاکتوں سے واقف ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے براڈ کاسٹر کی طرح اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی مقبولیت کا گراف نیچے آنے کی بجائے اُوپر ہی اُوپر جارہا ہے۔ میں نے پنین ریڈیو کے سٹوڈیو میں انٹرویو دیتے ہوئے اس کی مقبولیت کا مشاہدہ کیا لیکن اس درویش صفت انسان کے عجز وانکسار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وہ ثمر آور درخت کی طرح خلق خدا کے سامنے جھکنے کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہے حالانکہ ہمارے ہاں جس شخص کو چار لوگ جاننے لگیں اسے کھٹے ڈکار آنے لگتے ہیں اور وہ شہرت اور مقبولیت کی بدہضمی کا اس طرح شکار ہوتا ہے کہ حکیم ریاض قرشی کی معجونیں اور جوارشیں بھی اس کے کام نہیں آتیں۔ حضرت شاہ سرمایہ دار نہیں مگر وہ دل کا غنی ہے چنانچہ برطانیہ میں مقیم بہت سے ضرورتمند پاکستانی اور ادبی تنظیمیں اس کے دائیں ہاتھ کے قائل ہیں جس کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی۔ درویش صفت حضرت شاہ کی خوبیوں کے معترف ان ادبی تنظیموں کے کرتا دھرتا بھی ہیں جن کا حضرت شاہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ ایک طرح سے ان کی حیثیت حریف تنظیموں کی ہے چنانچہ جاوید اقبال ستار کی زبانی حضرت شاہ کی مدح سن کر مجھے بے پایاں مسرت ہوئی۔ ورنہ بقول ابن انشا ہمارے ہاں پیٹھ پیچھے تعریف کرنا مشرقی آداب کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

حضرت شاہ کو میں نے بریڈفورڈ اور کوپن ہیگن کے مشاعروں میں سنا۔ اس کا کلام اچھا تھا مگر میرا خیال تھا کہ وہ میری طرح ''پارٹ ٹائم'' شاعر ہے۔ اسے ''شیر پنجاب ہوٹل'' چلانے، انجمنیں چلانے، ریڈیو چلانے اور دوستوں کی محفلیں سجانے سے فرصت کہاں مل سکے گی مگر جب اس نے مجھے اپنی بیاض ''بے گھر آنکھیں'' کا مسودہ بھیجا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ شخص شعر کے معاملے میں گانٹھ کا پورا ہے۔ بیاض کی ورق گردانی سے پیشتر محض اس کے ماڈرن نام ''بے گھر آنکھیں'' کے حوالے سے میرا تاثر یہ تھا کہ اس میں کچھ اس قسم کی غزلیں ہوں گی ؎

شام ستم کو گوشہ تنہائی چاہیے
جیسے ہوا کو رات کی تنہائی چاہیے
رکھی ہوئی ہیں طاق میں آنکھیں یہ سوچ کر
دیوار و در کو شعلہ بینائی چاہیے
میرے لہو میں رات کے منظر اُچھال کر
چشم ہوس کو توشہ رُسوائی چاہیے

میں قارئین سے معذرت چاہتا ہوں کہ اس طرح کے شعر بغیر کسی کاوش کے مجھ پر ''نازل'' ہوتے چلے جا رہے ہیں مگر میں نے یہ سلسلہ یہیں روک دیا ہے کہ جو بات میں کہنا چاہتا تھا اسے ان شعروں سے تقویت نہیں مل رہی کیونکہ میں نے غور کیا ہے کہ ان شعروں میں خواہ مخواہ کچھ معنی پیدا ہو گئے ہیں جبکہ فیشن کے طور پر لکھی جانے والی جدید غزل بھی عادتاً لکھی جانے والی قدیم غزل کی طرح بے معنی ہوتی ہے، میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ حضرت شاہ اس نوع کی جدید غزل کی پیروی کرتا ہے نہ ''دیدہ دانستہ'' قدیم غزل کو اپنی منزل بناتا ہے بلکہ اپنے سیدھے سادھے جذبات کے اظہار کے لیے اسے جو لفظ مناسب معلوم ہوتے ہیں وہ ان سے اپنی غزل کی عمارت تعمیر کرتا ہے، اب یہ غزل کا مقدر ہے کہ ان لفظوں کی بدولت وہ کیا شکل اختیار کرتی ہے۔ چند شعر

ملاحظہ ہوں:

آیئے آپ بھی اس خانہ دل میں واپس
شام ہوتی ہے تو سب لوٹ کے گھر جاتے ہیں

کوئی اپنا دکھائی دیتا ہے
تو عجب سا دکھائی دیتا ہے

کتنے ناداں ہیں جو اِتراتے ہیں
موسم آتے ہیں گزر جاتے ہیں

زرد پتوں کی طرح شاخ سے ہم
ٹوٹتے ہیں تو بکھر جاتے ہیں

یہ غم نہیں کہ شہر سے قاتل گزر گیا
لوگو یہ حادثہ سر محفل گزر گیا
کشتی کو اس بھنور سے بچا تو لیا مگر
اس کشمکش میں سامنے ساحل گزر گیا

آوارگی میں یوں تو کئی بام و در ملے
دل کو طلب تھی جن کی نہ وہ رہ گزر ملے
دیکھا جو غور سے تو بصارت ہی چھن گئی
ایسے بھی زندگی میں ہمیں دیدہ ور ملے

میں جانتا ہوں کہ جو بات ہونے والی ہے
ستم ظریفی حالات ہونے والی ہے

ڈھول بن کر بکھر گئے ہم لوگ
جانے کس کس کے گھر گئے ہم لوگ
جانے پھر کیا سمجھ کے لوٹ آئے
جانے کیا سوچ کر گئے ہم لوگ
بعض اوقات تو ہوا یوں بھی
اپنی سوچوں سے ڈر گئے ہم لوگ

ہم وہ خوش فہم ہیں ان کے ستم و جور پہ بھی
یہی سوچا کوئی اس میں بھی بھلائی ہوگی

زمیں پہ رہتے ہیں جو لوگ ان کی بات کرو
کہ چاند تارے تو ہنستے ہیں آسمانوں میں

غم حیات سے فرصت کبھی ملی تو میں
تری نظر کے سوال و جواب سمجھوں گا

اپنے ہونٹوں پہ تبسم کو سجائے رکھئے
رُوپ دشمن ہے تو دشمن سے نبھائے رکھئے

اب آپ ہی بتائیں کہ یہ شعر سن کر حضرت شاہ کی دردمند اور حساس طبیعت کی

پوری تصویر نظروں کے سامنے نہیں آجاتی؟ کیا اس کے مزاج کی سادگی اس کی غزل کے بنیادی وصف کے طور پر سامنے نہیں آتی؟ کیا اس کی شاعری میں موجود بے ساختہ پن کی تاثیر کے بعد یہ گنجائش رہ جاتی ہے کہ اس کی شاعری کو جدید اور قدیم شاعری کے گھسے پٹے پیمانوں سے ماپا جائے؟ میر نے کہا تھا ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حضرت شاہ نے بھی استحصالی معاشرے کے کتنے ہی درد و غم کو جمع کیا تو یہ دیوان تیار ہوا۔ اس کے جسم میں ایک مضطرب روح ہے جس کا اضطراب اپنے دکھوں سے زیادہ دوسروں کے دکھوں کے حوالے سے ہے۔ آخر میں اس کی ایک خوبصورت مکمل غزل ملاحظہ فرمائیں ؎

دریا میں قدم رکھا سنبھلنا نہیں آیا
ڈوبے تو کچھ ایسے کہ نکلنا نہیں آیا
کچھ دور چلا ساتھ ہر اِک رہ گزر کے
لیکن ابھی اس راہ پہ چلنا نہیں آیا
اتنا بھی نہیں ہوش کہ رستوں کی خبر ہو
واپس ہی چلا جاتا کہ مڑنا نہیں آیا
ایسے میں کوئی آ کے مجھے راہ دکھائے
تنہائی کا جنگل ہے نکلنا نہیں آیا
طوفاں کی طرح زور میں اُٹھتا تو ہوں لیکن
لہروں کی طرح مجھ کو بکھرنا نہیں آیا
شیشوں کی طرح ٹوٹنا آتا ہے مجھے شاہ
شیشوں کی طرح مجھ کو پگھلنا نہیں آیا

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ملاقاتوں کے دوران حضرت شاہ مجھے ایک اعلیٰ درجے کا درویش صفت انسان لگا تھا جس کی تصدیق اس کی شاعری نے بھی کر دی ہے چنانچہ اب اگر کوئی اجنبی میرے پاس آئے اور پوچھے کہ ''میں نے اپنے بیمار بچے کو قبلہ حضرت شاہ صاحب مدظلہ العالی سے دم کرانا ہے، وہ کہاں تشریف رکھتے ہیں؟ تو میں کلین شیوڈ، سوٹ میں ملبوس، سمارٹ سے نوجوان کی طرف اشارہ کروں گا اور کہوں گا ''قبلہ حضرت شاہ صاحب وہ سامنے تشریف رکھتے ہیں جایئے آپ بھی اپنے دکھ ان کی جھولی میں ڈال دیجیے۔'' مجھے یقین ہے کہ حضرت شاہ نے اگر میری بات سن لی تو وہ خود ہی اپنی جھولی پھیلا کر سائل کے سامنے کھڑا ہو جائے گا!

(۳۱ر اگست ۱۹۸۹ء)

مسافروں کے ٹھکانے

ماڑی انڈس یا ماڑی ایکسپریس کے بارے میں ہم نے پہلے تو سنا ہی تھا، اب سفر کر کے بھی دیکھ لیا ہے۔ میانوالی کی بار ایسوسی ایشن نے قائداعظم کے یومِ ولادت کے سلسلے میں وہاں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور لاہور سے شاعروں کی پوری کھیپ اسی ٹرین سے میانوالی پہنچی تھی۔ احسان دانش، قتیل شفائی، مظفر وارثی، منور سلطانہ لکھنوی، اسرار زیدی، اقبال ساجد، نجیب احمد، حسن رضوی، شاہین نازلی، محمود شارب اور سیف زلفی وغیرہ شام کو سات بجے ماڑی انڈس میں بیٹھے اور جوں کی رفتار چلتی ہوئی اس گاڑی میں اگلے روز صبح دس بجے کے قریب میانوالی اسٹیشن پر اُترے۔ رات کو تھل کے علاقہ میں سے گزرتے ہوئے شعرائے کرام نے اپنے جسموں میں سردی اُترتی ہوئی محسوس کی اور اپنے اپنے کمبل شعرائے کرام نے اپنے گرد لپیٹ لیے۔ ماڑی انڈس کی بوگیوں (فرسٹ کلاس سمیت) کے دروازے بند نہیں ہوتے تھے، چنانچہ شعرائے کرام نے سگریٹ کے خالی پیکٹوں سے لے کر اپنی بیاضوں تک کو بروئے کار لاتے ہوئے ہوا کے راستے بند کرنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ مظفر وارثی سونے کے لیے اُوپر کی برتھ پر چلے گئے تھے مگر برتھ کی تنگ دامانی کے سبب مسلسل جاگ رہے تھے۔ انہوں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر جب اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے نچلی سیٹوں پر بیٹھے ''عوام'' سے مخاطب ہو کر کہا ''اس گاڑی میں ڈاکے بہت پڑتے ہیں۔ گزشتہ برس ایک شخص چلتی گاڑی میں سوار ہوا اور میرے سر کے نیچے سے میرا بیگ نکال

کر فرار ہو گیا۔ اس میں میرے کپڑے تھے۔ میانوالی ریلوے اسٹیشن پر معززین شہر نے جب میرا استقبال کیا تو میں سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھا اور میں نے پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے تھے۔''

یہ سن کر شعرائے کرام نے اپنے جسم میں ایک اضافی کپکپی محسوس کی اور شب بیداری میں مظفر وارثی کے ساتھ برابر کے شریک ہو گئے۔ حضرت مولانا اجمل نیازی مدظلہ العالی میانوالی سے شعراء کو اپنے ساتھ لانے کے لیے بطور خاص لاہور پہنچے تھے اور اب وہ بھی اس بوگی میں ان کے ساتھ سوار تھے۔ حسن رضوی اورینٹل کالج میں اجمل نیازی کے کلاس فیلو بھی تھے اور ہوسٹل میں روم میٹ بھی۔ یہ وہ دور تھا جب اجمل نیازی کلین شیوڈ تھے، جدید طرز کے لباس پہنتے تھے اور اورینٹل کالج کی مخلوط فضا میں ''مجسم قیامت'' تھے اور حسن رضوی یہاں اس اجمل نیازی کی ''فتوحات'' بیان کر رہے تھے مگر اجمل نیازی کے آج کی دنیا بدل چکی ہے۔ ٹخنوں سے اُونچی شلوار پہنتے ہیں، گھنی داڑھی اور دراز زُلفیں رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ سنتے تھے اور وقفے وقفے بعد زیر لب مسکراتے ہوئے ''بکواس نئیں کر'' کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ رات بھیگتی جا رہی تھی اور شعراء کی آنکھوں سے نیند اب کوسوں دور تھی۔ ماڑی ایکسپریس رینگتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور گاڑی امجد کندیانی (حال یحییٰ امجد) کے قصبہ کندیاں سے چند میل ادھر پہنچ کر رُک گئی۔ ماڑی انڈس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ نجیب احمد نے کہا ''ماڑی ایکسپریس کا نام'' بہت ہی ''ماڑی ایکسپریس'' ہونا چاہیے۔ میانوالی یہاں سے بیس پچیس میل رہ گیا تھا مگر پتہ چلا کہ انجن میں کوئی نقص واقع ہو گیا ہے اور اس میں گاڑی کھینچنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ دراصل ڈاکٹر وحید قریشی بھی اس گاڑی میں سوار ہیں جنہیں گورنمنٹ کالج میانوالی کے مذاکرے میں ایک مقالہ پڑھنا ہے۔ یہاں پونے دو گھنٹے کے قیام کے دوران انجن کا نقص دور کیا گیا اور ''ماڑی'' ایکسپریس ایک بار پھر چل پڑی۔ کندیاں کے بعد ایک بار پھر انجن کا سانس پھولا تاہم

کسی نہ کسی طور گاڑی میانوالی شہر پہنچ گئی۔ شعرائے کرام گاڑی سے اُترے، ڈاکٹر وحید قریشی بھی اُترے اور اپنے اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ گئے۔

شعراء کو مشاعرے کے دعوت نامے بار ایسوسی ایشن کے صدر سیّد کرامت حسین شاہ کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ شاہ صاحب میانوالی کی ایک ادب اور ادیب دوست شخصیت ہیں اور بڑے معروف وکیل ہیں۔ انہوں نے جناب حمید اللہ خاں نیازی کے صاحبزادے جناب اصغر خاں نیازی کے ہاں شعراء کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ یہاں مہمان شعراء کے ساتھ اصغر خان نیازی نے وہی سلوک کیا جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اصغر خاں نیازی کے والد جناب حمید اللہ نیازی پاکستان کے ادبی حلقوں کے لیے کوئی گمنام شخصیت نہیں ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک شعری مجموعے کا انتساب ان کے نام کیا ہے۔ یہاں ان سے بھی ملاقات ہوئی اور ان سے مل کر جی واقعی خوش ہوا کہ ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ شعراء نے اس بڑی حویلی کے مختلف کمروں میں اپنا اپنا سامان رکھا۔ شیو کیا، ٹیوب ویل میں نہانے کا تجربہ کیا اور ایک ویگن میں چشمہ بیراج کی سیر کو چلے گئے۔ شام کو کھانے کے بعد انہیں پنڈال میں لے جایا گیا جہاں اسپیکر پنجاب اسمبلی شیخ رفیق احمد مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ مرتضیٰ برلاس سیاہ اچکن اور سفید پائجامے میں ملبوس یہاں مشاعرے کے انتظامات میں سرگرم تھے اور اجمل نیازی سٹیج سیکرٹری کے فرائض سنبھالے ہوئے تھے۔ جب مشاعرہ اپنے عروج پر پہنچا تو اجمل نیازی نے اعلان کیا کہ ''اب میانوالی کے معروف شاعر سابق ڈپٹی کمشنر اور حال اعزازی مجسٹریٹ ملک عبدالرحمٰن اپنا کلام سنائیں گے۔''

ملک عبدالرحمٰن کا نام سنتے ہی حاضرین نے تالیاں اور سیٹیاں بجا بجا کر پورے پنڈال کو سر پر اُٹھالیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کی بہت مقبول شخصیت ہیں اور جب انہوں نے کان پر ہاتھ رکھ کر بھیرویں میں اپنی ''نثری غزل'' سنانا شروع کی تو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ مقبول کیوں ہیں؟ اس ''ورائٹی پروگرام'' کے دوران خالد احمد نے نعرہ لگایا ''ملک

صاحب شاعر نہیں ہیرا ہیں اور اس ہیرے پر لاہور کا حق ہے!'' اس پر ایک مقامی ستم ظریف نے بآواز بلند جواب دیا کہ ''اندرا گاندھی اہالیان میانوالی کو اس ہیرے کے عوض کشمیر آفر کر چکی ہے، مگر ہم نے انکار کر دیا تھا! صاحب صدر شیخ رفیق احمد چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے ہنس ہنس کر دہرے ہو رہے تھے مگر ملک عبدالرحمٰن کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی اور بلاشبہ خود اعتمادی کے یہ ''نمونے'' ہمارے ہاں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ملک عبدالرحمٰن کی پیدا کردہ فضا کا اثر مرتضٰی برلاس نے آ کر زائل کیا اور ان کے کلام پر داد تحسین کی نوعیت بدل گئی۔ اس کے بعد مشاعرہ رواں دواں ہو گیا اور رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا حسن نکھرتا چلا گیا۔

اگلے روز علی الصبح قتیل شفائی، خاطر غزنوی، خالد احمد، اسرار زیدی، ناصر زیدی، گلزار وفا چودھری، نجیب احمد، حسن رضوی، قائم نقوی، صابر ظفر اور آذر تمنا نے رخت سفر باندھا اور یہاں سے ایک سو ساٹھ میل دور واقع راولپنڈی کی طرف گامزن ہوئے جہاں سے انہوں نے واہ کینٹ کے لیے بس پکڑی اور یہ قافلہ جشن ندیم میں شرکت کے لیے واہ میں واقع آفیسرز کلب میں پہنچ گیا۔ یہاں جلیل عالی، احسان اکبر، سبط علی صبا، حسن ناصر اور حلیم قریشی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ تقریب کے اختتام پر واہ کی سیمنٹ فیکٹری کے پاس کھڑے ویگن کا انتظار کرتے ہوئے حسن ناصر نے فیکٹری پر سایہ کناں درختوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''ان درختوں پر سیمنٹ کی اس قدر ''دھول'' موجود ہے کہ اگر یہ درخت جھاڑے جائیں تو ایک مکان بآسانی بن سکتا ہے۔'' حلیم قریشی نے تردید کی اور کہا ''ایک مکان نہیں پوری کالونی بن سکتی ہے اور فیکٹری ملازمین کے لیے تعمیر شدہ کالونی میں یہی سیمنٹ استعمال ہوا ہے۔''

واہ سے لاہور جانے کے لیے واپس پنڈی پہنچ کر شعراء نے یہاں کے پاک ٹی

ہاؤس یعنی شالیمار ریستوران کا رُخ کیا مگر اس وقت وہاں ضمیر نفیس تک موجود نہ تھے، چنانچہ کھانا کھانے کے بعد پنڈی کے ادیبوں کے نام ایک رُقعہ چھوڑا گیا جس میں درج تھا کہ لاہور والے آئے تھے، مگر پنڈی والے موجود نہ تھے۔ چنانچہ ''رسم خلوص'' ادا کر کے واپس جارہے ہیں۔ ''رسم خلوص'' شالیمار میں بیٹھنے والے ادیبوں کی ''ٹرم'' ہے جس سے مراد اپنا اپنا بل ادا کرنا ہے۔ یہ قافلہ واپس لاہور آنے کے لیے جی ٹی ایس کے اڈے کی طرف جارہا تھا کہ خاقان خاور سے ملاقات ہوگئی اور اُستاد ذوق نے غالباً یہ شعر محبت، خلوص اور وضع داری کے اس پیکر ہی کے بارے میں کہا تھا ؎

اے ذوق کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

سادہ دل بندے

وفاقی وزیر پیداوار الحاج محمد خاقان عباسی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ خزاں میں انتخابات منعقد کرانے کا مطالبہ بچگانہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ حکومت صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت ہے اور وہ ان بلاوجہ مطالبات پر کان نہیں دھرے گی۔ جناب خاقان عباسی کے مطابق مس بے نظیر بھٹو سیاست میں نووارد ہیں اور ان کے متنازعہ بیانات نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سیاست آسان کام نہیں اور اس کے لیے فراست، عقل، دور اندیشی اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسٹر جتوئی کو پارٹی سے نکالنے اور اس پر بیگم بھٹو کی فکرمندی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر خاقان عباسی نے کہا کہ مس بے نظیر بھٹو مستقبل میں بھی ایسی غلطیاں کر سکتی ہیں۔ مسٹر خاقان عباسی نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ بھٹو خاندان آمرانہ فطرت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ کبھی بھی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے۔ مسٹر خاقان عباسی نے کہا کہ پیپلز پارٹی کسی نظریے کی نمائندگی نہیں کرتی اور غالباً یہ مفاد پرستوں کا ایک گروہ ہے جسے کنفیوژن اور شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے مس بے نظیر بھٹو کی چیئر مین شپ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہماری سماجی روایات ایک غیر شادی شدہ لڑکی کی لیڈر شپ کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو وہ یہ کہنا چاہتے ہیں اور شاید کہا بھی یہی ہو کہ چیئر پرسن ہماری سماجی روایات کے پیش نظر ملکی لیڈر شپ کے لیے موزوں نہیں ہیں! عباسی صاحب کا بیان ہم نے نقل کر دیا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ یہ بیان صرف نقل نہ کریں بلکہ اس کی نقل مارتے ہوئے کچھ باتیں اس کی حمایت میں بھی کریں۔ مثلاً عباسی صاحب بالکل صحیح کہتے

ہیں کہ خزاں میں انتخابات منعقد کرانے کا مطالبہ بچگانہ ہے۔ کیونکہ اس موسم میں جب درختوں سے پتے جھڑ رہے ہوں اور ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہو، الیکشن کروانا بدشگونی ہے۔ لہٰذا انتخابات کے لیے بہتر موسم منتخب کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے خیال میں اس کام کے لیے خزاں کی بجائے بہار کا موسم مناسب رہے گا! اگر ہم نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی تو عباسی صاحب کے بیان کے ظاہری الفاظ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اعتراض انتخاب پر نہیں موسم کے انتخاب پر ہے۔

لہٰذا ہم نے ان کی یہ مشکل حل کر دی ہے اور یوں بھی خزاں میں بہار نہیں آ سکتی۔ اگر مس بے نظیر بھٹو انتخاب خزانی کے نتیجہ میں بہار بھی دیکھنا چاہتی ہوں تو موسم تو موزوں چنیں۔ عباسی صاحب نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ مس بے نظیر بھٹو ابھی سیاست میں نووارد ہیں۔ ہمارے خیال میں انہوں نے یہ بات بطور اعتراض نہیں کی بلکہ سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بطور حوصلہ افزائی کہی ہوگی کیونکہ عباسی صاحب خود ملکی سیاست میں نووارد ہیں اور بہت کم وقت میں انہوں نے اقتدار تک رسائی حاصل کی ہے تاہم ممکن ہے ہماری یہ توجیہہ ٹھیک نہ ہو اور وہ کہنا یہ چاہتے ہوں کہ ضروری نہیں ہر نووارد اتنی جلدی اقتدار تک پہنچ جائے۔ کیونکہ انہوں نے ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ سیاست آسان کام نہیں اور اس کے لیے فراست، عقل اور دور اندیشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر ان کے بیان کا یہ حصہ ہمیں پھر سپورٹنگ محسوس ہوتا ہے کیونکہ بے نظیر بھٹو کے متعلق سیاسی مبصرین نے بحیثیت مجموعی ابھی تک یہی کہا ہے کہ اس خاتون نے تا حال فراست، عقل اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسٹر جتوئی کو پارٹی سے نکالنے اور اس پر بیگم بھٹو کی فکرمندی کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر خاقان عباسی نے کہا کہ مس بے نظیر بھٹو مستقبل میں بھی ایسی غلطیاں کر سکتی ہیں۔ ہم عباسی صاحب کے بیان کے اس حصے سے مکمل طور پر متفق ہوں کہ مسٹر جتوئی کو پارٹی سے نکالنے کا فیصلہ غلط ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ بلنڈر رہے اور عباسی صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ بے نظیر بھٹو مستقبل میں بھی ایسی غلطیاں کر سکتی ہیں۔ مگر غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔

آخر سندھ میں بے نظیر بھٹو کا مقابلہ کرنے کے لیے جی ایم سیّد کو پوری طرح اُبھارا گیا ہے۔ ممتاز بھٹو کو ملک میں لایا گیا ہے اور حفیظ پیرزادہ ان کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ مصطفیٰ جتوئی کو بے نظیر نے خود خلاف کیا ہے اور یوں فیڈریشن کی بات کرنے والی بے نظیر بھٹو جب سندھ میں کنفیڈریشن کی بات کرنے والوں کے ہاتھوں کارزہوں گی اور وہ مصطفیٰ جتوئی جیسے محب الوطن سیاست دان کی حمایت سے بھی محروم ہو چکی ہوں گی تو ان غلطیوں کا خمیازہ ملک وقوم کو بھگتنا پڑے گا۔ مسٹر خاقان عباسی نے اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ بھٹو خاندان آمرانہ فطرت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی خاقان عباسی نے بالکل صحیح کہی ہے۔ چنانچہ ہمیں اس خاندان سے کوئی حسن ظن نہیں بلکہ ہم خاقان عباسی صاحب کے ساتھ مل کر اس جماعت کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہیں جو چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی جتنی عوامی مقبولیت رکھتی ہو۔ اگر ان کے نزدیک کوئی ایسی پارٹی ہے تو پھر ہم سب کو مل کر اسے سپورٹ کرنا چاہیے اور مضبوط سے مضبوط تر بنانا چاہیے کیونکہ اس وقت قومی سلیت کا تقاضا یہ ہے کہ نسبتاً چاروں صوبوں میں یکساں مقبولیت رکھنے والی ایسی جماعت آئندہ قیادت کے لیے سامنے آئے جو وفاق پر یقین رکھتی ہو۔ اگر ہم اور خاقان عباسی صاحب اس تلاش میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر ہمیں مجبوراً پیپلز پارٹی کو متبادل کے طور پر قبول کرنا پڑے گا۔ ورنہ تھوڑے رینج والی محب الوطن سیاسی جماعتیں ان بڑے خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی جو اس وقت بہت واضح طور پر درپیش ہیں۔ خاقان عباسی صاحب کی اس بات سے بھی ہمیں جزوی طور پر اتفاق ہے کہ پیپلز پارٹی کسی نظریے کی نمائندگی نہیں کرتی اور غالباً یہ مفاد پرستوں کا ایک گروہ ہے جو اقتدار کا بھوکا ہے۔ جسے کنفیوژن اور شکست کا سامنا کرنا پڑے گا مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور وزارتوں میں مفاد پرستوں کا ایک غالب گروہ موجود ہے، بلکہ پاکستان کی ساری سابقہ تاریخ اسی ٹولے کے حکمرانوں سے مرتب ہوئی ہے۔ اسی طرح موجودہ دیگر سیاسی جماعتوں میں بھی مفاد پرستوں کا یہ عنصر بہرحال موجود ہے۔ چنانچہ خاقان عباسی صاحب خود ہی بتائیں کہ ہم اور ان جیسے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ (۱۷ مئی ۱۹۸۶ء)

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

گزشتہ دو تین روز سے ہم قاضی محمد اقبال پر بہت گرمی کھائے بیٹھے ہیں۔ ان قاضی صاحب سے ہمارا کوئی لمبا چوڑا تعارف نہیں۔ بس ان کے بارے میں اتنا معلوم ہوا ہے کہ موصوف بستی کوٹ چٹھہ تونسہ شریف میں رہتے ہیں۔ موسیقار اور گلوکار ہیں۔ اُستاد توکل خان کے شاگرد ہونے کے دعوے دار ہیں۔ وہ اور خواجہ خورشید انور مرحوم اکٹھے ریاض کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ راگ ملہار گا کر کسی بھی جگہ بارش کرا سکتے ہیں۔ خواہ اس جگہ بادلوں کا نام ونشان تک نہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان قاضی صاحب نے چیلنج کیا ہے کہ پاکستان اور بھارت کا کوئی بھی گلوکار ان کے ساتھ اس قسم کا مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ انشاء اللہ منہ کی کھائے گا۔

ظاہر ہے کہ قاضی صاحب پر ہمارے غصے کی وجہ ان کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ راگ ملہار گا کر کسی بھی جگہ بارش کرا سکتے ہیں۔ بلکہ غصے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ دعویٰ بہت لیٹ کیا ہے۔ گزشتہ دنوں جب قوم کو ان کی ضرورت تھی یعنی بارش نہ ہونے کی وجہ سے مسلسل لوڈشیڈنگ ہو رہی تھی، گرمی سے برا حال تھا، فصلیں تباہ ہو رہی تھیں، فیکٹریوں پر تالے پڑ رہے تھے، کاروبار تباہ ہو رہے تھے اور نہری پانی کی کمیابی کی وجہ سے صوبے ایک دوسرے کے کھنے سینکنے کو پھر رہے تھے۔ قاضی صاحب یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور منہ میں گھنگھیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ یار لوگوں نے اس دوران پانی کا مسئلہ حل کرنے

کے لیے کیسی کیسی تجویزیں پیش نہیں کیں۔ مصنوعی بارش برسانے کی بات کی گلیشیئرز کے دل موم کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے اور جب کچھ بس نہ چلا تو نماز استسقاء میں خدا کے حضور گڑگڑا کر بارش کے لیے دعا کی۔ مگر کوٹ چھٹہ کے قاضی صاحب کا دل نرم نہ ہوا۔ اب جب کہ بارانِ رحمت برسا ہے اور اتنا کھل کر برسا ہے کہ کھیتیاں سیراب ہوگئی ہیں، تربیلا اور منگلا کی جھیلیں پانی سے لبالب بھر گئی ہیں، لوڈ شیڈنگ سے چھٹکارا مل گیا ہے تو اپنے قاضی صاحب بولے ہیں کہ میں راگ ملہار گا کر کسی بھی جگہ بارش برسا سکتا ہوں۔ خواہ اس جگہ بادلوں کا نام ونشان تک نہ ہو۔ واہ قاضی صاحب آپ نے ہمارے ساتھ اچھی کی۔ آپ سے بہتر تو مہدی حسن ہیں جنہوں نے ایک دفعہ اپنے راگ سے چپ چپیتے ایک گلاس توڑ دیا تھا اور کہیں سے یہ آواز بھی سنی کہ کھایا پیا کچھ نہیں۔ ایک بار گلاس توڑا بارہ آنے! آپ نے بوقت ضرورت بارش تو برسائی نہیں اور اب جب کہ ان بارشوں سے لوگوں کے کوٹھے گرنے لگے ہیں، آپ نے راگ ملہار کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

ویسے قاضی صاحب کا یہ دعویٰ سن کر ابھی ابھی ہمارے ذہن میں ایک شک گزرا ہے اور وہ یہ کہ موصوف صاحب کہیں ''کھبی'' دکھا کر ''سجی'' تو نہیں مار رہے؟ یعنی بظاہر تو اس دعویٰ سے یہ لگتا ہے کہ وہ گلوکاری کے میدان میں پاؤں جمانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر درحقیقت ان کی پلاننگ سیاست میں آنے کی ہو؟ یہ شبہ ہمارے ذہن میں بلاوجہ نہیں اُبھرا۔ بلکہ ہماری پوری ملکی سیاست اس شبہے کو تقویت دیتی ہے۔ کیونکہ ہمارے سیاست دان بھی گرمی اور حبس کے موسم میں جب ذہنوں کی کھیتیاں خشک ہو رہی ہوں، لوگوں کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں، سیاسی لوڈ شیڈنگ زوروں پر ہو، اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں مزے سے بیٹھے رہتے ہیں یا ملک سے باہر چلے جاتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں فصل تو اس کے باوجود تیار ہونے لگی ہے تو وہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روموں سے باہر آتے

ہیں۔ دوسرے ملکوں سے پاکستان واپسی کا ٹکٹ کٹواتے ہیں اور کہتے ہیں لوگو! تمہارے نجات دہندہ آ گئے ہیں۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اور پھر ایسی قیامت کی چال چلتے ہیں کہ نئے ''نجات دہندوں'' کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب آدھے سیاست دان تو پہلے ہی سے ہیں۔ کیونکہ وہ بنے بنائے ''فنکار'' ہیں۔ چنانچہ ہمیں تو ان کے پوری طرح سیاست میں آنے کے خیال ہی سے خوف آنے لگا ہے۔

بات اگر سیاست دانوں کی چھڑی ہے تو کم ہمارے حکمران بھی نہیں۔ وہ بھی منیر نیازی کی نظم ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں'' کے مصداق مار گزیدہ کے لیے عراق سے تریاق اس کی موت کے بعد ہی منگوانے کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے ایک وزیر خزانہ نے ایک دفعہ اپنے بیان میں کہا تھا کہ سابقہ حکومتوں کی غلط معاشی پالیسیوں کی وجہ سے ملک تباہی کے گڑھے میں جا گرا ہے۔ حالانکہ تمام سابقہ حکومتوں کی غلط معاشی پالیسیاں بھی انہوں نے خود ہی بنائی تھیں۔ اسی طرح ہمارے ''اصلی تے وڈے'' حکمران گزشتہ آٹھ برس سے خود یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مارشل لاء ملک کے لیے ایک لعنت سے کم نہیں مگر جس طرح قاضی صاحب نے برے دنوں میں راگ ملہار سے بارش نہیں برسائی، اسی طرح ہمارے حکمرانوں نے ان برے دنوں میں مارشل لاء نہیں اُٹھایا۔ بلکہ اب بھی وعدہ فردا پر ٹال رہے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں نے ہمیں کبھی بنیادی جمہوریت دی، کبھی عوامی جمہوریت دی، کبھی اسلامی جمہوریت دی، نہیں دی تو حقیقی جمہوریت نہیں دی اور اس سلسلے میں وعدہ فردا بھی نہیں ہے۔ قاضی صاحب کے سلسلے میں کم از کم اتنا تو ہے کہ وہ وعدہ کر بیٹھے ہیں اور آئندہ جب بارشوں کی ضرورت محسوس ہوگی تو ہم ان کے دامن گیر ہوں گے کہ قبلہ! راگ ملہار گائیں، بارش برسائیں۔ وعدے پر پورے نہ اُترے تو خود

ہی جھوٹے کہلائیں گے۔ ہمارا کیا جائے گا۔ جائے گا تو ان کا بھی کچھ نہیں، اگر ان کا ارادہ واقعی سیاست میں آنے کا ہے، بلکہ اس صورت میں تو ان کا نام بلکہ مہدی حسن کا نام بھی بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ آئے گا اور وہ یوں کہ قاضی صاحب نے ''بارانِ رحمت'' کا وعدہ کیا اور پورا نہیں کیا اور ہمارے حکمرانوں نے بھی ہمیشہ ''بارانِ رحمت'' کا وعدہ کیا اور کبھی پورا نہیں کیا۔ اسی طرح مہدی حسن نے اپنے راگ سے گلاس توڑا، ہمارے ایک حکمران نے اپنے راگ سے ملک توڑ دیا اور یوں اگر دیکھا جائے تو قاضی صاحب اور مہدی حسن آئندہ زندگی میں اگر کچھ بھی نہ کریں تو بھی ان کا نام ملک کے زعماء کے ساتھ آئے گا!

ایں سعادت بزور بازو نیست!
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کچھ لوگوں کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو، ان کے عزائم بہت بلند ہوتے ہیں۔ بالکل اس میراثی کی طرح جو بازار سے ایک رسی خرید کر لایا اور اسے بیوی کو تھماتے ہوئے کہا ''لے بھئی بھلیئے لو کے رسی تو آ گئی ہے، بھینس بھی اب آ ہی جائے گی'' یا پھر ان سیاسی راہنماؤں کی طرح، جن کے پاس کرسیاں ہوتی ہیں، شامیانے ہوتے ہیں، پلاؤ کی دیگیں ہوتی ہیں، پلاؤ کھانے والے بھی ہوتے ہیں مگر اسے حلال کرنے والے نہیں ہوتا یا جیسے ہمارے ایک لنگور دوست جو کسی حور سے کم پر کبھی عاشق نہیں ہوئے اور اس ضمن میں انہوں نے کبھی پراُمید ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تاہم اس سلسلے میں ان کا موقف یہ ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں انسان کو اپنا معیار بہر حال گرانا نہیں چاہیے۔ یہ سب مثالیں اپنی جگہ مگر لندن میں مقیم ''نوائے وقت'' کی نمائندہ خصوصی محترمہ محسنہ جیلانی نے اپنے تازہ مکتوب میں جس بے وسائل مگر ''باہمت'' نوجوان کا واقعہ بیان کیا ہے وہ ان سب پر مستزاد ہے۔ اس اکیس سالہ نوجوان نے بے روزگاری سے تنگ آ کر جرائم کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس نوجوان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ کوئی اصلی تو کیا نقلی پستول بھی خرید سکتا۔ لہٰذا ڈاکہ ڈالنے کے لیے اس نے طریقہ یہ سوچا کہ کاغذ کا ایک پرزہ لیا اور اس پر لکھا ''میری جیب میں پستول ہے اور اگر تم نے تجوری سے سارا روپیہ میرے حوالے نہ کیا تو میں تمہیں گولی سے اُڑا دوں گا'' لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ کہ جب وہ یہ پرچہ لے کر ایک کیمسٹ کی دکان میں داخل ہوا اور اس نے سیلز گرل کو یہ پرچہ دینے کی

کوشش کی تو اس نے پڑھنا تو کجا یہ پرچہ لینے سے انکار کر دیا کہ شاید اس لڑکے نے پرچے میں کوئی فحش بات لکھی ہے۔ لہٰذا یہاں سے ناکام ہو کر یہ نوجوان برآبر میں ایک ایشیائی برتنوں کی دکان پر گیا اور جب اس نے ایشیائی دکان دار کو یہ رقعہ دیا تو اس نے کہا کہ یہ اسے پڑھنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ وہ انگریزی نہیں جانتا! یہاں سے ناکامی کے بعد یہ نوجوان ایک ''فوڈ ٹیک اوے شاپ'' پر گیا۔ شومئی قسمت کہ وہاں بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ دکاندار اس رقعے کو اس لیے نہیں پڑھ پایا کہ اس کے پاس پڑھنے کی عینک نہ تھی۔ آخر کار اس نے مایوس اور شرمندہ ہو کر پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور جرم میں ناکامی کے باوجود اس پر مجرم بننے کا ٹھپہ لگ گیا۔ کیونکہ عدالت نے اسے دو سال کے لیے پروبیشن نگرانی میں دے دیا۔

اس واقعے نے زیادہ لطف ہمیں اس لیے دیا کہ بالکل اسی نوعیت کا ایک لطیفہ ہم نے سن رکھا تھا۔ چونکہ یہ لطیف ایک دفعہ ہم اپنے کالم میں لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا اب کے اس کی صرف تلخیص سنا سکتے ہیں اور وہ تلخیص بس اس قدر ہے کہ ایک شخص کو ایک نامعلوم زبان میں ایک رُقعہ کہیں سے ملا اور اس نے وہ رقعہ جس کو بھی پڑھنے کو دیا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس شخص کی پٹائی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ وہ ایک ایسے دوست کے پاس پہنچا جو وہ زبان جانتا تھا۔ وہ دوست کسی لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے بحری جہاز پر سوار ہو چکا تھا۔ اس شخص نے وہ رُقعہ ایک پتھر میں لپیٹ کر اس کی طرف پھینکا تا کہ وہ اسے پڑھ کر سنائے اور یوں اس کا تجسس ختم ہو۔ مگر بد قسمتی سے یہ رُقعہ سمندر میں جا گرا۔ چنانچہ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ اس رقعہ میں لکھا کیا تھا؟

ہم جانتے ہیں کہ یہ ''لطیفہ'' انسان کو ہنساتا کم اور اسے غصے زیادہ دلاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے پوری تفصیل کے ساتھ سنانے کی بجائے اس کی صرف تلخیص سنائی ہے تا کہ غصے کی بھی تلخیص ہو سکے۔ تاہم کالم کے آغاز میں جو واقعہ ہم نے بیان کیا ہے، وہ خالص مزاح کی ذیل میں آتا ہے۔ کیونکہ اس کے اُوپر کی سطح پر مسکراہٹ تیر رہی ہے اور

اس کی تہہ میں غم چھپا ہوا ہے۔ بہرحال بے روزگاری کے ستائے ہوئے نوجوان نے ڈاکہ ڈالنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس پر

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

والا شعر یاد آ جاتا ہے مگر سچ پوچھیں تو ہمارے نزدیک یہ نوجوان محض اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے مارا گیا ورنہ اس انگریز نوجوان کے بزرگ بھی جب ہندوستان پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آئے تو ان کے پاس بھی نقلی پستول تک نہیں تھا مگر یہ لوگ کیا آرام سے ہندوستان کی ساری دولت ''ہونج'' کر انگلینڈ لے گئے اور اس کے علاوہ دوسو سال تک ہندوستان پر حکومت بھی کی۔ ہمارے پاکستان میں بھی اعلان تاشقند سے پردہ اُٹھانے کا وعدہ کر کے میلہ بھی لوٹ لیا گیا اور بتایا بھی کچھ نہیں۔ پاکستانی عوام کے لیے یہ اعلان اس رُقعے کی طرح ثابت ہوا جو سمندر میں گر گیا تھا اور یوں جس کے بارے میں آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ اس میں لکھا کیا تھا؟

ہمیں اس انگریز نوجوان سے ہمدردی اس لیے بھی ہے کہ سیلز گرل نے محض فحاشی کے شبے میں اس کا رُقعہ پڑھنے سے انکار کر دیا یا ایشیائی دکاندار انگریزی نہیں جانتا تھا اور جو دکاندار انگریزی جانتا تھا اس کے پاس پڑھنے کی عینک نہ تھی۔ چنانچہ یہ سارے اتفاقات سراسر بدقسمتی کی ذیل میں آتے ہیں مگر جس بات پر ہم دل ہی دل میں اس نوجوان کو مبارک دیے چلے جا رہے ہیں، وہ اس کی اوالعزمی ہے۔ یعنی پلے کچھ بھی نہیں اور ڈاکہ ڈالنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔ ہمارے بزرگ غفار خان کو چاہیے کہ انڈیا میں اُنہیں جو لاکھوں روپے کی تھیلیاں پیش کی گئی تھیں، اس میں سے کچھ رقم خرچ کر کے وہ اس نوجوان کو اپنے ٹکٹ پر پاکستان بلائیں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں بلکہ یہ دونوں عندلیب ایک دوسرے کے گلے لگ کر آہ وزاریاں کریں۔ کیونکہ دونوں کا کیس ایک جیسا ہی ہے۔ یعنی ہمارے خان صاحب بھی قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک بغیر

پیروکاروں کے لیڈری چلا رہے ہیں۔ وہ بھی ہر دور میں ایک رُقعہ جیب میں ڈال کر نکلتے ہیں کہ میری جیب میں پستول ہے۔ اگر تم نے پاکستان کے بارے میں میرے شکست خوردہ نظریات کو قبول نہ کیا تو گولی مار دوں گا۔ مگر ان کی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ عوام اس بات کو فحش سمجھ کر اسے پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے یا انہیں خان صاحب کی بات سمجھ ہی نہیں آتی اور یا پھر ان کے پاس وہ مخصوص نمبر کی عینک ہی نہیں ہے جس سے خان صاحب کے خیالات پڑھے جا سکتے ہیں۔ ہمارا یہ مشورہ بالکل مفت ہے۔ چنانچہ خاں صاحب کو چاہیے کہ وہ اوّلین فرصت میں اس پر عمل کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کریں۔ اپنے چھوٹے خان صاحب بھی!

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

ڈاکٹر باقر کی ہم نوائی

گزشتہ دنوں ہم نے اپنے محترم ڈاکٹر محمد باقر صاحب کا ایک مضمون ''شوریٰ پہ کیا گزری'' بڑے ذوق وشوق سے پڑھا لیکن اس مضمون کا ایک حصہ پڑھ کر ہم پر کیا گزری، بس یہ کالم ہم اس کیفیت کے بیان ہی کے لیے لکھ رہے ہیں، ڈاکٹر باقر نے شوریٰ کے ایک معزز رُکن کی حیثیت سے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ شوریٰ کے ارکان کے لیے مراعات تو بہت ہیں مگر انہیں کسی قسم کے اختیارات نہیں دیے گئے اور اس قصے میں ہماری دلچسپی کی چیز یں یہ مراعات والا حصہ ہی تھا۔ شاید اس لیے کہ ہمارے نزدیک بیک وقت مراعات اور اختیارات یعنی چپڑی اور دو دو کا ملنا ہر کسی کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ ان دونوں میں سے ایک چیز سے بہر حال دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے ''منافع اور اختیارات'' کے تحت شوریٰ کے ارکان کو ملنے والی مراعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''شورائیوں کے منافع اور اختیارات بظاہر بڑے عظیم الشان اور ان کے مرتبے کے مطابق ہیں، مثلاً یہ اعلان کیا گیا ہے کہ مراتب کے امتیاز کے وقت ہر شورائی کا فوج میں مرتبہ لیفٹننٹ جنرل کے مساوی ہوگا اور سول میں وفاقی حکومت کے سیکرٹری سے اُوپر ہوگا۔ سفر کے لیے چار ہزار روپے سالانہ کے کوپن دیے گئے ہیں جنہیں ہوائی جہاز اور گاڑی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، سرکاری اسفار کے لیے سفر خرچ اور طعام کا خرچ الگ دیا جاتا ہے۔ ٹیلیفون کے لیے چار سو روپے ماہوار اور ملک کے تمام ریسٹ ہاؤس مری سمیت ان کے لیے کھلے ہیں!''

اور بس ڈاکٹر صاحب کے مضمون کا یہ حصہ پڑھ کر ہمارے منہ میں پانی آ گیا اور ہم نے خود پر نفرین کی کہ ہم نے مجلس شوریٰ کی رُکنیت سے کیوں انکار کیا یا دوسرے لفظوں میں حکومت کی اس ناقدر شناسی پر ملول ہوئے کہ اس نے ہمیں رُکنیت کی پیشکش کیوں نہ کی؟ آج اگر ہم مجلس شوریٰ کے رُکن ہوتے تو لیفٹنٹ جنرل جتنی عزت تو ضرور ہوتی اور سول میں وفاقی سیکرٹری سے اُوپر کے درجے پر فائز ہوتے۔ خیر ہمیں تو آپ ایک طرف رکھیں، اگر ڈاکٹر صاحب شوریٰ کے اراکین کو ملنے والے اس مرتبے کا انکشاف نہ کرتے تو ہم ڈاکٹر صاحب کو بھی محض ایک عالم اور ایک دانشور سمجھتے، مگر یہ تو آج پتہ چلا کہ ان کا مرتبہ اس کے سوا بھی ہے۔ ویسے اگر شوریٰ کے اراکین کو اپنے نام کے ساتھ یہ عہدہ اعزازی طور پر لکھنے کی بھی اجازت ہوتی تو ہم ڈاکٹر باقر کو لیفٹنٹ جنرل ڈاکٹر محمد باقر لکھ کر کتنے خوش ہوتے؟ بلکہ اس پروٹوکول کی نسبت سے تو ہم اپنے محب اور شوریٰ کے چیئرمین خواجہ صفدر کو غالباً فیلڈ مارشل خواجہ صفدر لکھنے کی مسرت حاصل کرتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم اس شرمندگی سے بھی بچ جاتے جس کا سامنا ہمیں اس وقت کرنا پڑتا ہے جب ہم سے کوئی پوچھتا ہے کہ کوئی جنرل تمہارا واقف ہے؟ اور ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ایک جنرل مرچنٹ سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ مگر اس نے بھی ایک عرصے سے اُدھار دینا بند کیا ہے۔ بصورتِ دیگر اس سوال کے جواب میں ہم اپنے بزرگ ڈاکٹر باقر کا نام لے سکتے تھے بلکہ اگر زیادہ ایمرجنسی ہوتی تو خواجہ صفدر کا نام بھی لے سکتے تھے، مگر وائے افسوس ہم اس سہولت سے محروم ہی رہے!

مگر ہمیں ان مراعات کے بیان میں لیفٹنٹ جنرل سے زیادہ وفاقی سیکرٹری والے اعزاز میں زیادہ ''چارم'' نظر آیا ہے، کیونکہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک انسان یونہی نہیں پہنچتا بلکہ اس کے لیے ہمہ وقت جان ہتھیلی پر رکھنا پڑتی ہے۔ چنانچہ جب وطن کے دفاع کا وقت آتا ہے تو آگ اور خون کے دریا میں چھلانگ لگانا پڑتی ہے اور اس وقت کاندھوں پر لگے بلوں کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم دودھ پینے والے عاشقوں کو یہ اعزاز ''وارا'' نہیں کھاتا، ہمارے لیے وفاقی سیکرٹری والا اعزاز زیادہ مناسب ہے، سو

اگر مجلس شوریٰ کے ارکان کو سچ مچ وفاقی سیکرٹری کی مراعات حاصل ہو جائیں تو ہم اپنے احباب کے اصرار پر اور ملک وقوم کی خدمت کے لیے مجلس شوریٰ کی رُکنیت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اس صورت میں ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا، بس ہمارے سیکرٹری کو ہر فون کال پر صرف یہ کہنا ہوگا کہ صاحب میٹنگ میں ہیں یا یہ کہ صاحب باتھ روم میں ہیں۔ صاحب کی نشانی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ میٹنگ یا باتھ روم میں ہوتا ہے! وفاقی سیکرٹری کے اعزاز میں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ سابقہ حکومتوں کی پالیسیاں بنانے کے باوجود کسی نئی حکومت کی پالیسی بناتے ہوئے وہ بلا جھجک اپنی ہی بنائی ہوئی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ سابقہ حکومتوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہمیں بہت نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ سو مجلس شوریٰ کے ارکان کو اگر یہ اعزاز اپنے پورے اعزاز کے ساتھ نصیب ہو جائے تو زہے نصیب، کہ اس صورت میں تو خود ہم بھی ملک وقوم کی خاطر یہ بھاری ذمہ داری اُٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

ویسے یہ کالم یہاں تک لکھ چکنے کے بعد ہمیں خیال آیا ہے کہ جو باتیں ہم نے لکھی ہیں وہ اپنے طور پر غلط یا صحیح ہو سکتی ہیں، مگر اس کے لیے ہمیں ڈاکٹر محمد باقر کے کالم کو حوالہ نہیں بنانا چاہیے تھا کیونکہ وہ تو فقیر منش آدمی ہیں۔ ان کے لیے یہ ساری سہولتیں اور آسائشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں جو شوریٰ کے ارکان کو مہیا کی گئی ہیں۔ ہمیں تو متعدد باران کے مضامین پڑھ کر

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے؟

والے مصرعے کی معنویت کا اندازہ ہوا ہے، چنانچہ اپنے اس مضمون میں بھی انہوں نے زور اسی پر دیا ہے کہ بے شک یہ آسائشیں اور یہ مراعات بھی شورائیوں کو حاصل رہیں مگر انہیں کچھ ایسے اختیارات بھی ملنے چاہئیں جن سے وہ ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔ سو ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ہم بھی اپنی آواز شامل کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ شورائیوں کو کھل کر ملک وقوم کی خدمت کرنے کا موقع دیں، بصورت دیگران کے اندر خدمت کا جو جذبہ ہے، اسے پڑے پڑے پھپھوندی لگ جائے گی!

ڈاکٹر بٹالوی کی باتیں

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں، جن کا وسیع علم اور عمر ان کے مزاج کی شگفتگی کو متاثر نہیں کر سکی۔ ہوتا یوں ہے کہ بزرگوں کے پاس اگر نئی نسل کا کوئی فرد آن بیٹھے تو دس منٹ کے بعد یا تو وہ بزرگ معذرت کر لیتے ہیں اور یا وہ نوجوان رسہ تڑا کر بھاگ جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے پاس بیٹھنے والا کوئی نوجوان نہ تو ان کی محفل سے آنکھ بچا کر اُٹھنا چاہتا ہے اور نہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کو اس سے معذرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے گو ہمارا شمار اب نوجوانوں میں تو نہیں ہوتا، تاہم گزشتہ روز دو گھنٹے ہم نے بھی ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں گزارے ہیں اور جب ہمیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجبوراً ان سے اجازت طلب کرنا پڑی تو ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب ہمیں ہماری تاریخ کے متعلق وہ کچھ بتا گئے ہیں جو شاید کئی ضخیم کتابوں کے مطالعے کے بعد بھی ہمارے ذہن نشین نہ ہوتا۔ اس وقت ہم آپ کو اس گفتگو کی تفصیلات سنانے کے موڈ میں نہیں ہیں، البتہ ایک واقعہ ضرور سنائیں گے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں ہمیں سنایا تھا اور ہمیں شبہ ہے کہ شاید ہم اپنی کم مائیگی کی وجہ سے وہ تاثر آپ تک منتقل نہ کر سکیں، جو تاثر یہ واقعہ خود ڈاکٹر صاحب کی زبانی سننے سے ہم پر مرتب ہوا تھا۔

یہ انسانی زندگی کا ایک سیدھا سادا سا واقعہ ہے، جس کا مرکزی کردار بظاہر خود ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ہیں اور اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ڈاکٹر صاحب نام خدا جوان

تھے۔ میلہ چراغاں اپنے شباب پر تھا اور اس روز ڈاکٹر صاحب بھی اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں ''بلے'' لوٹ رہے تھے۔ اس روز ڈاکٹر صاحب، میلوں ٹھیلوں کی زندگی بالکل قریب سے دیکھنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دوست کے ساتھ پروگرام بنایا کہ تمام رات ''میلہ گاہ'' ہی میں بسر کی جائے۔ اس پروگرام کے تحت وہ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ادھر اُدھر جا رہے تھے۔ گردونواح اور دور دراز کے دیہات اور شہروں سے آئی ہوئی نوجوانوں کی ٹولیاں ''بولیاں'' گاتی ہوئی پاس سے گزر رہی تھیں۔ دکانیں کھانے پینے کی چیزوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور لاکھوں لوگوں کی مسرت بھری آوازوں سے کان پڑی صدا سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کو ''میں'' میں تبدیل کر دیں کہ ''کلام شاعر بزبانِ شاعر'' کا کچھ اپنا ہی لطف ہے۔ سو میں اور میرا دوست میلے کی رونقوں میں گم تھے اور ہمارا چہرہ بھی خوشی اور مسرت سے دمک رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان جو اپنے لباس کی تراش خراش سے ہندو معلوم ہوتا تھا، یکا یک میرے سامنے آ گیا۔ اس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا ''میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا ''پوچھو'' کہنے لگا ''انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟'' خوشیوں سے بھرے ہوئے اس میلے میں نوجوان کا یہ سوال اس قدر بے موقع اور غیر متوقع تھا کہ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی، اس کا چہرہ غم والم کی مجسم تصویر تھا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور میں نے مضبوطی سے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور دبکانے کے انداز میں پوچھا ''تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟'' وہ گھبرا گیا اور اس نے قدرے لیت ولعل کے بعد اعتراف کر لیا کہ وہ خودکشی ہی کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ڈی اے وی کالج کا طالب علم ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''کیا تمہیں کچھ مالی پریشانیاں ہیں'' کہنے لگا ''نہیں۔''

''کیا محبت میں ناکامی ہوئی ہے؟'' اس نے جواب دیا ''نہیں''

''تو پھر خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' اس کا جواب تھا کہ وہ ایک عرصے سے اس

اُلجھن میں مبتلا ہے کہ آخر انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ اس دنیا میں رہتا ہے مصیبتوں میں گھرا رہتا ہے۔ آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب حاصل کر کے رہے گا اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ اس پر میں نے اس سے پوچھا مجھے یہاں سب سے زیادہ خوش آپ ہی نظر آ رہے تھے اس لیے میں نے سوچا آپ سے پوچھا جائے کہ بھگوان نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ میرا خیال تھا کہ آپ اس سوال کا جواب جانتے ہوں گے۔

میں نے اس کی یہ گفتگو سنی تو اس کی کلائی کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر میلے سے نکل آیا۔ باہر آ کر ہم نے تانگہ لیا اور علامہ اقبال کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ علامہ دھوتی اور بنیان میں ملبوس چارپائی پر لیٹے تھے۔ ان دنوں الیکشن کی گہما گہمی زوروں پر تھی۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو الیکشن کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ مثلاً یہ کہ خواجہ دل محمد کو اپنی کامیابی کا بہت یقین ہے، تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ خودکشی پر تلا ہوا نوجوان علامہ کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا تھا اور علامہ نے اس کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی تھی، ہم نے کچھ دیر الیکشن کے بارے میں گفتگو کی اور پھر کہا ''ہم آج اس سلسلے میں حاضر نہیں ہوئے ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو نوجوان ہمارے ساتھ آیا ہے وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ ہم اسے آپ کے پاس لائے ہیں کہ اسے مطمئن کریں۔'' اس پر علامہ اقبال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا ''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا ''میرا کوئی مذہب نہیں۔''

یہ سن کر اقبال مسکرائے اور کہا ''تم غلط کہہ رہے ہو، اس دنیا میں کوئی شخص لامذہب نہیں ہے۔'' بالآخر نوجوان نے اقرار کیا کہ وہ ہندو ہے۔

''تناسخ پر یقین رکھتے ہو؟'' نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

علامہ نے حقے کی نَے منہ میں لی اور کش لینے کے بعد کہا ''اس صورت میں مرنے کے بعد تم تین قسم کی صورت حال سے دوچار ہو سکتے ہو۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خودکشی کے

بعد جو زندگی تمہیں ملے، وہ تمہاری موجودہ زندگی جیسی ہی ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دنیا اس سے بھی بدتر ہو۔ البتہ تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زندگی اس زندگی سے بہتر ثابت ہو۔ گویا تین میں سے دو چانسز تمہارے خلاف جاتے ہیں، لہٰذا خودکشی کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ دنیا خوبصورت ہے، تم نوجوان ہو، اسے مزید خوبصورت بنانے کی کوشش کرو۔'' جب ہم اس گفتگو کے بعد علامہ کی کوٹھی سے باہر نکلے تو نوجوان نے کہا ''اسے شانتی مل گئی ہے!'' جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا کہ یہ صاحب کون تھے جن سے آپ نے میری ملاقات کرائی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ ہندوستان کی مشہور شخصیت علامہ اقبال ہیں۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر روشنی کی ایک دوسری لکیر نمودار ہوئی۔

لیکن ہوا یوں کہ اس واقعے کے پندرہ دنوں بعد ہم نے اخبار میں پڑھا کہ ڈی اے وی کالج کے ایک طالب علم نے خودکشی کر لی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً اس نوجوان کی شکل گھوم گئی اور میں نے سوچا کہ بعد کے حالات نے اسے ایک بار پھر خودکشی کی طرف مائل کر دیا ہوگا اور میں تھوڑی دیر کے لیے مغموم ہو گیا۔ اس واقعے کو کئی برس گزر گئے، ایک روز میں اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک مضمون پر میری نظریں جم گئیں۔ اس کا موضوع خودکشی تھا۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ وہ ایک عرصے تک زندگی اور موت کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا، لیکن ایک ہمدرد انسان ان لمحوں میں اس کے آڑے آ گیا اور اسے علامہ اقبال کے پاس لے گیا۔ علامہ کی گفتگو نے اس کی سوچ کا رُخ بدل دیا اور مکمل طور پر اس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ علامہ کو اگرچہ یہ واقعہ اب سرے سے یاد نہیں ہے تاہم وہ ان کا یہ احسان تمام عمر نہیں بھول سکتا۔ وہ اس شخص کا نام جاننے کا متمنی بھی تھا، جو اسے علامہ کے پاس لے گیا تھا اور اس نے مضمون میں درخواست کی تھی کہ اگر وہ اسے پڑھے تو اپنے ایڈریس سے ضرور مطلع کرے کیونکہ وہ اسے بہت تلاش کر چکا ہے مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی...... اور ماضی میں خودکشی کے لیے گھر سے نکلنے والا یہ مضمون نگار دیوندر ستیارتھی تھا جو اس وقت ملک کی جانی پہچانی ادبی شخصیت بن چکا تھا۔''

پیپلز پارٹی کا ثقافتی موقف

چند روز پیشتر پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے چیئرمین جناب اسلم اظہر نے لاہور ٹیلی ویژن میں ادیبوں کو چائے کے کپ پر مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان سے ٹی وی پروگراموں پر رائے لی جائے۔ ہم اس گفتگو کی چند جھلکیاں اپنے کالم میں درج کر رہے ہیں۔ اس محفل میں ہمارے لیے فخر زمان کے ارشادات خصوصاً دلچسپی کے حامل تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے شعبہ ثقافت کے چیئرمین ہیں اور یوں ان کی رائے دراصل پاکستان پیپلز پارٹی کی رائے ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس محفل میں جن دوستوں نے گفتگو میں حصہ لیا، ان سب کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ بہر حال اس گفتگو کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں:

اسلم اظہر: میں چاہتا ہوں کہ فنون لطیفہ اور علم و ادب سے وابستہ لوگ اپنی تاریخ کے بارے میں سچ بولنا شروع کر دیں۔ سچ میں کوئی خطرناک بات نہیں ہوتی۔ اس سے ہمارے بچے اپنی تاریخ پر فخر کرنا سیکھیں گے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ جتنا زور ٹی وی ڈراموں پر صرف کیا جاتا ہے اتنا ہی زور بچوں کے پروگرام بہتر کرنے پر بھی صرف کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ بچوں کے پروگرام بھی ٹی وی کے فائیو اسٹار پروگرام تصور کیے جائیں۔

مہدی حسن (گلوکار نہیں): گزشتہ بارہ برس میں ٹی وی پر عورت کو یہ کہہ کر ذلیل کیا گیا کہ اگر وہ ملازمت کرے گی تو گھر تباہ ہو جائے گا۔ آئندہ ٹی وی کو اس ضمن میں مثبت

کردار ادا کرنا چاہیے۔
الطاف قریشی (اُردو ڈائجسٹ والے نہیں): بارہ برسوں میں قوم کو ذلیل کیا گیا۔ سرخوں کو ٹی وی پر کتا کہا گیا۔ جاگیرداری کی تعریف کی گئی۔ اب اگر دوبارہ انہی رائٹروں کو سامنے لایا گیا تو یہ لوگ خود کو نئے حالات میں کیسے ایڈجسٹ کریں گے؟
صفدر میر (مسکراتے ہوئے): ماضی میں بھی کچھ لوگوں نے خود کو بدلا۔ اب بھی وہ بدل جائیں گے۔
عزیز اثری: ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ اُلٹا ہمارے ''کاز'' کو نقصان پہنچائیں گے۔
سہیل گوئنڈی: مزدور دشمن، کسان دشمن اور عوام دشمن ادیبوں سے مصالحت ہمیں تباہ کردے گی۔ لہٰذا انہیں ذرائع ابلاغ سے دور رکھنا ہوگا۔
شاہد محمود ندیم (کئی برس کی رضا کارانہ جلاوطنی کے بعد وطن واپسی): یہاں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ایک بڑے کمیونسٹ انقلاب کے بعد میٹنگ ہو رہی ہے اور یہ فیصلہ کیا جا رہا ہے کہ انقلاب دشمنوں کو کس طرح ملیامیٹ کرنا ہے۔ حالانکہ ۱۶ نومبر کے انتخابات کے بعد جو حکومت وجود میں آئی ہے، اس میں ''آسمان'' اور جی ایچ کیو کا ہاتھ بھی ہے۔ نیز اس حکومت کا پروگرام بھی واضح نہیں ہے اور پنجاب میں تو بالکل متضاد نظریے کے لوگ سامنے آئے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی اپنی کچھ حدود ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اپنی آزادی کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور موثر طریقے سے کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟
اسلم اظہر: آپ نے نہایت بہترین طریقے سے صورت حال کو سمجھا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔
ظہیر کاشمیری: پاکستان ٹیلی ویژن پر سیکولر اور جمہوری سوچ رکھنے والوں کو آگے لایا جائے۔
احمد بشیر (سابق اے پی پی والے نہیں): ٹی وی پر بین کسی کو نہ کیا جائے بلکہ عوام دشمنوں کو پرموٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے۔ پنجابی اور دوسری پاکستانی زبانوں کو زیادہ

وقت دیا جائے۔ نیز علاقائی پروگرام دسرے صوبوں میں بھی دکھائے جائیں۔ علاوہ ازیں علاقائی پروگراموں کی اناؤنسمنٹ بھی علاقائی زبانوں میں کی جائے۔

اسلم اظہر: ہم ٹی وی کا دوسرا چینل شروع کر رہے ہیں جو علاقائی تعلیم اور علاقائی ثقافتوں کے فروغ کے لیے وقف ہوگا۔

احمد بشیر: تحریک پاکستان کی تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ اقبال اور قائداعظم بڑے قوم پرست لیڈر تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ آخر وہ اپنے موقف سے کیوں ہٹے؟ ویسے بھی ہماری تاریخ محمد بن قاسم سے شروع نہیں ہوتی، بہت پہلے سے شروع ہوتی ہے۔

اسلم اظہر: کراچی میں ایک تاریخ دان نے مجھے ایک بہت اچھی تجویز پیش کی ہے۔ اس کے مطابق ہم پاکستان کی تاریخ چھ ہزار سال سے شروع کریں گے۔

صفدر میر: تحریک پاکستان پر دستاویزی پروگراموں کے سلسلے میں گزشتہ دوسو برسوں پر خصوصی فوکس کیا جائے۔ نیز سب سے زیادہ زور گزشتہ چالیس برسوں پر دیا جائے جب غلام محمد جیسے لوگوں نے غیر آئینی حرکات کا آغاز کیا۔

فخر زمان: اب میں کچھ باتیں بغیر لگی لپٹی رکھے کہنا چاہتا ہوں۔ ادیب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کوڑے کھانے والے، دوسری اکیڈمی آف لیٹرز کے جلسے میں جانے والے۔ وہ تو اس محفل میں بھی موجود ہیں۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو آج کی میٹنگ میں کبھی شامل نہ ہوتا۔ بہرحال میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ٹی وی پر نظر آئے اور عوام نے احتجاج کیا تو اس کا جواب آپ کو دینا پڑے گا۔ ضیاء کے دور میں ترقی پسندوں نے بھی ٹی وی پر لکھا مگر ان کی تحریریں ان کے موقف سے ہٹی ہوئی نہیں تھیں۔ میں آج یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر رجعت پسندوں سے لکھوایا گیا تو پیپلز پارٹی اور عوام ان پروگراموں کو ٹی وی سے نہیں چلنے دیں گے۔

حسن رضوی: پاکستانی ادیب جب بھارت جاتے ہیں تو بھارتی ریڈیو اور ٹی وی سے ان کے انٹرویو نشر کیے جاتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں اس پر پابندی ہے۔ جب کہ ہمیں

بھی بھارتی ادیبوں کے انٹرویو ریڈیو اور ٹی وی سے نشر کرنے چاہئیں۔
فخر زمان: بھارتی ادیبوں میں سے بھی صرف بائیں بازو کے ادیبوں مثلاً علی سردار جعفری اور امرتا پریتم وغیرہ کے انٹرویو نشر کرنے چاہئیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ یا ان جیسے دوسرے رجعت پسند ادیبوں کے نہیں!
مستنصر حسین تارڑ: گزشتہ گیارہ سالہ دور میں جبر کے بارے میں بہت خوبصورت کہانیاں لکھی گئیں اور اس پر ہمیں غدار کہا گیا اور غدار کہنے والے یہاں موجود ہیں۔ اگر آپ کہانیاں دوبارہ انہیں لوگوں کو لکھنے کے لیے کہیں گے تو یہ ظلم ہوگا۔

ادیبوں کی اس محفل میں جن ادیبوں نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا، ان میں مسعود اشعر، ڈاکٹر آغا سہیل، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، امجد اسلام امجد، یونس جاوید، اے حمید، الطاف فاطمہ، یونس بٹ، سلیم چشتی، جمیل ملک، منو بھائی اور انتظار حسین سمیت بہت سے ادیب شامل تھے۔ علاوہ ازیں کئی نامور ادیب اس محفل میں موجود ہی نہیں تھے۔ کچھ ادیب ایسے بھی تھے جنہیں مدعو ہی نہیں کیا گیا تھا۔ حسن رضوی بھی ان میں شامل تھے۔ محفل کے اختتام پر ایک ستم ظریف نے اسلم اظہر سے کہا کہ جناب یہ میٹنگ تو بہت اچھی رہی۔ اب کچھ ادیبوں کی میٹنگ بھی بلائیے۔ اسی طرح ایک بذلہ سنج نے تقریب کے اختتام پر مستنصر حسین تارڑ کو روک لیا اور کہا تمہاری تقریر سے لگا کہ گیارہ سالہ دور آمریت میں غضنفر مہدی کے بعد سب سے زیادہ ظلم تم پر ہوا ہے۔ تمہیں صبح کی نشریات میں اس ظلم کی تفصیلات بیان کرنا چاہئیں۔

(۱۸ فروری ۱۹۸۹ء)

✧ ✧ ✧

مولانا تھانوی کے لیے مفت مشورے

آج (۱۳ راکتوبر) کے نوائے وقت میں دو خبریں ساتھ ساتھ لگی ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ مولانا احترام الحق تھانوی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور دوسری خبر یہ کہ کماد سے ملنے والے ایک لاوارث بچے کو اولاد نرینہ سے محروم عورت نے گود لے لیا۔ اس خبر کے ساتھ بچے کی تصویر بھی لگی ہے۔ جب کہ پہلی خبر کے ساتھ مولانا احترام الحق تھانوی کی تصویر نہیں لگائی گئی۔ ہمیں یہ دونوں خبریں پڑھ کر بے اندازہ مسرت ہوئی۔ کیونکہ اب مولانا اور لاوارث بچہ دونوں محفوظ ہاتھوں میں آ گئے ہیں۔ مولانا بہت عرصے سے پیپلز پارٹی سے کھنچے کھنچے سے نظر آتے تھے اور یوں کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہے تھے۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ وہ کم از کم گزشتہ ایک برس سے آغوش عافیت میں جانا چاہتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے وعدہ کیا مگر موقع آنے پر مولانا کو گھر پر ہی روتا بسورتا چھوڑ گئے۔ یہ تو بھلا ہو سندھ کے وزیر اعلیٰ سیّد غوث علی شاہ کا کہ وہ مولانا کو ایک ''ریڑھی'' میں بٹھا کر وزیر اعظم کے پاس لے گئے، جہاں مولانا نے اعلان کیا کہ وہ اپنے چودہ ساتھیوں سمیت مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس کا اجر شاہ صاحب کو بھی ملا اور وہ یوں کہ اس اعلان کے ساتھ ہی ایک بیان اخبار میں شائع ہوا کہ مولانا احترام الحق تھانوی اور ان کے ساتھیوں کی مسلم لیگ میں شمولیت کا سہرا وزیر اعلیٰ سندھ کے سر ہے، جنہوں نے سندھ کے نازک ترین بحرانوں میں بھی بردباری اور سیاسی فکر کا دامن واقعی بہت مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ بلکہ ہم تو گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسے تھوڑا سا ڈھیلا کریں تاکہ بردباری اور سیاسی فکر کو سانس لینے میں آسانی ہو۔

متذکرہ خبر کے حوالے سے مولانا احترام الحق تھانوی کی ایک بات ہمیں بہت اچھی لگی اور وہ یہ کہ دستورِ زمانہ کے مطابق مولانا نئی سیاسی پارٹی میں اپنے ''ہزاروں ساتھیوں سمیت'' شامل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے صرف چودہ ساتھیوں کی ذمہ داری لی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے ساتھ چودہ آدمی ہیں، جو زیادہ سے زیادہ ایک ویگن کی سواریاں ہیں۔ یوں بھی چودہ افراد کی مہمان نوازی کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب ''ون ڈش پارٹی'' کی رسم کو رواج دینے کی کوشش کی جارہی ہو۔ سندھ کا تو ہمیں پتہ نہیں، البتہ پنجاب میں ان دنوں وزراء صرف اس دعوت میں شرکت کرتے ہیں، جس میں ایک ڈش پکائی گئی ہو۔ چنانچہ آج ہی کی ایک خبر کے مطابق ایک دعوت سے چند وزراء اس لیے اُٹھ کر چلے گئے کہ وہاں ایک سے زیادہ کھانے کی ڈشیں موجود تھیں۔ ممکن ہے سندھ میں وزراء کو کھانے کی کھلی چھٹی ہو۔ مگر پنجاب میں وزراء کو زیادہ کھانے کی اجازت نہیں۔ بہرحال یہ تمام صورت حال مولانا احترام الحق تھانوی اور ان کے چودہ ساتھیوں کے علم میں ہونی چاہیے۔ اگرچہ اب صورت حال بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ بقول شخصے جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔

ویسے مولانا کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ نفس کے غرور میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔ ہم چونکہ خود علماء کے خاندان میں سے ہیں اور یوں علماء کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ سارے نہیں تو کچھ علماء خاصے متکبر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ وہ امراء وغیرہ سے ملتے وقت ایک آن سی برقرار رکھتے ہیں۔ صاحبانِ اقتدار کو ہیچ سمجھتے ہیں اوّل تو بہت کم کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوتے ہیں لیکن دِین کی سربلندی کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھیں تو پھر دوسری صف میں کبھی نہیں بیٹھتے۔ جبکہ ہمارے مولانا احترام الحق تھانوی خدا کے فضل سے اس قسم کی باتوں سے قطعاً مبرا ہیں۔ جب یہ پیپلز پارٹی میں تھے تو ان کا ایک گروپ فوٹو ہم نے اخبار میں چھپا دیکھا تھا۔ جس میں مس بے نظیر بھٹو اور پارٹی کے دوسرے عہدیدار کرسیوں پر بیٹھے تھے جب کہ مولانا ان کے پیچھے مودب کھڑے تھے۔ اب مولانا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی اس انکساری کو برقرار رکھیں گے۔ اس انکساری کے

بہت سے فائدے ہیں۔ خدا خوش ہو نہ ہو ''خداوند'' ضرور خوش ہوتے ہیں۔

مولانا کو پسند کرنے کی ایک دو وجوہ تو ہم نے اُوپر بیان کی ہیں۔ ایک وجہ ان کے اور ہمارے نام کا ہم صوت ہونا بھی ہے۔ صرف ہم صوت ہی نہیں بلکہ ان کے نام میں بھی حق آتا ہے اور ہمارے نام میں بھی حق شامل ہے اور یوں ہم دونوں حق کا ساتھ دینے والے ہیں بلکہ صدر ضیاء الحق بھی ہم حق کا ساتھ دینے والوں میں شامل ہیں۔ اس کا ثبوت مولانا کا ماضی ہے۔ ہمارے کالم ہیں اور صدر ضیاء الحق کا دور حکومت ہے۔ اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ ہاتھ کھڑا کر کے دیکھے۔ بہر حال مولانا کو چونکہ ہم پسند کرتے ہیں اس لیے ہم انہیں ایک مشورہ دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو سے ملاقات کے دوران انہیں ایک بات کی تسلی ضرور کر لینا چاہیے تھی اور وہ مولانا کوثر نیازی کے حوالے سے تھی۔ مولانا کوثر نیازی کے تعلقات بھی وزیر اعظم جونیجو کے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ لہٰذا یہ پوچھ لینے میں کوئی حرج نہ تھا کہ اگر مولانا کوثر نیازی اور مولانا احترام الحق تھانوی بیک وقت جونیجو صاحب کی حمایت کریں تو کہیں اس سے جونیجو صاحب کی مخالفت کا پہلو تو نہیں نکلتا۔ یہ بات ہم کسی بری نیت سے نہیں کر رہے بلکہ مولانا تھانوی اور مولانا کوثر نیازی کی خوئے دوستی کو مدنظر رکھ کر کہہ رہے ہیں۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم ان دونوں میں سے ایک جونیجو صاحب کی مخالف صف میں شامل ہو جائے اور آخر میں ایک مشورہ ہم نے مولانا احترام الحق تھانوی کو دینا ہے اور وہ بھی بر بنائے اخلاص جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ''نوائے وقت'' میں مولانا کے مسلم لیگ میں شامل ہونے اور ایک لاوارث بچے کو اولادِ نرینہ سے محروم عورت کے گود میں لینے کی خبریں ساتھ چھپی ہیں۔ مولانا کو اس ضمن میں اپنے تعلقات بروئے کار لا کر اس قسم کی خبروں کو ساتھ ساتھ نہیں چھپنے دینا چاہیے کہ کاپی پیسٹنگ کے وقت بعض اوقات سرخیاں بدل جاتی ہیں جس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اُمید ہے مولانا ہمارے ان مشوروں پر غور فرمائیں گے۔ وما علینا الا البلاغ

گزٹ نوٹیفکیشن

چند روز پیشتر ہمارا ایک کالم ''شاہ صاحب'' کے زیرعنوان شائع ہوا تھا، جس میں ہم نے بتایا تھا کہ لوگ کس خلوص سے ہمیں ''شاہ صاحب'' کہہ کر پکارتے ہیں مگر ہم کفرانِ نعمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ ہم شاہ صاحب نہیں ہیں۔ تاہم ایک طویل عرصے تک احباب کے اصرار اور ان کے پے در پے شاہ صاحب کہنے کی وجہ سے ہمیں مجبوراً یہ ٹائٹل قبول کرنا پڑا۔ خدا بھلا کرے سیالکوٹ کے جناب احسان قریشی صابری کا کہ انہوں نے ہمیں اس ضمن میں ضمیر کی ملامت سے بچالیا ہے اور یہ جو ہم ''شاہ صاحب'' کہلوانے پر اندر ہی اندر کچھ نادم سا ہوتے تھے، احسان قریشی صاحب نے نہ صرف یہ کہ ہمیں اس احساس سے چھٹکارا دلایا ہے بلکہ اگر تبدیلی نام کے لیے ایک صبر آزما دفتری طریق کار سے نہ گزرنا پڑتا تو ہم نے اب تک کاغذوں میں اپنے نام کے ساتھ ''شاہ'' کا اضافہ کرلیا ہوتا اور یوں اس وقت تک سرکاری طور پر ''شاہ صاحب'' کہلوا رہے ہوتے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے احسان قریشی صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

از طرف شاہ احسان الحق صابری (ریٹائرڈ پرنسپل)
ریلوے روڈ سیالکوٹ

بخدمت شاہ عطاء الحق قاسمی
''نوائے وقت'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ کس نے آپ کو کہا ہے کہ آپ اپنے نام کے ساتھ ''شاہ'' کا لقب نہیں لکھ سکتے؟ آپ تو خالص قریشی النسل ادیب ہیں ساڑھے سات سو سال گزرے سلطان غیاث الدین بلبن نے حضرت بابا فرید گنج شکر پاک پٹنی کے فرمانے پر ایک شاہی فرمان جاری کیا تھا۔ اس فرمان میں تحریر تھا کہ پہلے تین خلفاء کی آل اولاد اپنے نام کے شروع میں لفظ ''شاہ'' لکھا کرے (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان کی اولاد) چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کی اولاد اپنے نام کے آخر میں لفظ شاہ لکھا کرے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ اسماعیل شہید، شاہ رُکن عالم مدفون ملتان، سیّد نہیں تھے قریشی فاروقی تھے۔ فی زمانہ شاہ احمد نورانی اور شاہ فرید الحق بھی سیّد نہیں ہیں مگر شاہ جی کہلاتے ہیں۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری چونکہ حضرت علی کی اولاد میں سے تھے اس لیے وہ اپنے نام کے آخر میں شاہ لکھا کرتے تھے۔ آپ کے والد صاحب قبلہ مولانا بہاء الحق قاسمی کے ہم سبق تھے۔ میں نے اسی موضوع پر ۱۴ جنوری ۱۹۸۶ء کے ''پاکستان ٹائمز'' میں ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے اس کی پوری چھ کاپیاں آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ اس کا عنوان ہے "Castes and Sub-Castes" آئندہ سے آپ مجھے ''شاہ'' لکھا کریں اور میں آپ کو ''شاہ لکھا کروں۔'' ورنہ سلطان غیاث الدین بلبن کے شاہی فرمان کی حکم عدولی ہوگی۔

پرانا دُعاگو
احسان الحق قریشی صابری

یہ خط ایسا نہیں تھا کہ ہم اسے کاغذوں میں گنوا دیتے۔ چنانچہ بہتوں کے بھلے کے لیے ہم نے اسے اپنے کالم میں درج کر دیا۔ کیونکہ جناب احسان الحق قریشی صابری بلکہ شاہ احسان الحق صابری کی طرف سے اس گراں قدر انفارمیشن کے بعد نہ صرف یہ کہ ہم بیٹھے بٹھائے سابقہ تاریخوں میں شاہ ہو گئے ہیں، بلکہ اس ''نوٹیفکیشن'' کا ''بینیفٹ''

ہماری وجہ سے ان لاکھوں لوگوں کو بھی ملا ہے جو صدیقی، فاروقی اور عثمانی ہونے کے باوجود شاہ صاحب کہلانے کے حق سے محروم تھے۔ شاہ صاحب کہلانے کی یہ سہولت اگر صرف سلطان غیاث الدین بلبن کی طرف سے ملی ہوتی تو شاید آج جمہوری دور میں ایک سلطان کے فرمان کی اتنی اہمیت نہ ہوتی مگر احسان الحق قریشی صابری کے مطابق تو یہ فرمان حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے فرمانے پر جاری ہوا لہٰذا اس کی حیثیت اب تو واقعی حکم کی ہے، جس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔

قریشی صاحب کے اس خط میں جو بات ہمیں زیادہ دلچسپ لگی وہ لفظ ''شاہ'' نام کے آگے یا پیچھے لکھنے کے حوالے سے ہے یعنی اصحابؓ ثلاثہ کی آل اولاد اپنے نام کے شروع میں ''شاہ'' لکھے اور جن کا سلسلہ نسب چوتھے خلیفہ راشد یعنی حضرت علیؑ سے ہے، وہ اپنے نام کے آخر میں شاہ لکھیں اور قریشی صاحب نے اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید سے لے کر شاہ احمد نورانی اور شاہ فریدالحق تک کی جو مثالیں دی ہیں، اس کے بعد بظاہر بحث کی زیادہ گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر ایک مسئلہ ''شاہ'' کے علاوہ بھی ہے اور وہ لفظ ''سیّد'' سے متعلق ہے، یعنی کئی لوگ اپنے نام کے شروع میں اور کئی نام کے آخر میں ''سیّد'' لکھتے ہیں، پہلے تو ہم سمجھا کرتے تھے کہ یہ لاحقہ سابقہ خود اختیاری ہے مگر صابری صاحب کا خط پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں یہ خیال گزرا ہے کہ ممکن ہے اس ''تقدیم و تاخیر'' کی بھی کوئی تاریخی وجہ ہو۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے دوست عالم علی سیّد سے پوچھا تھا کہ وہ سیّد اپنے نام کے آخر میں کیوں لکھتے ہیں، جس کا جواب اس ستم ظریف نے یہ دیا کہ عالم علی وہ شروع کے ہیں، سیّد بعد میں بنے ہیں اس لیے وہ سیّد بعد میں لکھتے ہیں۔ جی ایم سیّد ہمارے قریب ہوتے تو یہ بات کبھی ہم ان سے بھی پوچھتے، تاہم ان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ''جی ایم'' پہلے ہیں اور ''سیّد'' بعد میں ہیں مگر بقول شخصے براہ راست ان سے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟

اب اگر بات چل نکلی ہے تو ''شاہ'' کے علاوہ اپنے نام کے ساتھ ''خان'' لکھنے

والوں کا معاملہ بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی ایک خان تو وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق پختونوں سے ہے، مگر ''خانوں'' کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو پختون نہیں، بلکہ کشمیری ہے مثلاً سردار عبدالقیوم خان اور ایئر مارشل اصغر خان وغیرہ۔ اب یہ تحقیق بھی ''شاہ احسان الحق صابری'' ہی نے کرنی ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ دراصل قریشی صاحب اس قسم کی تحقیقات کے ''ماسٹر'' ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے بہت تحقیق کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ ازروئے شریعت حکمرانی کا حق صرف قریشیوں کو حاصل ہے، اس وقت تو ہم نے ان کے بیان کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی، لیکن چونکہ اب ہم بھی ''شاہ'' ہیں لیکن صرف نام کے ہیں، لہٰذا بہتر ہوگا قریشی صاحب، قریشیوں کے باقاعدہ ''شاہ'' ہونے کے ضمن میں صرف تحقیق پر اکتفا نہ کریں، تحریک بھی چلائیں، ہم ان کے ساتھ ہیں بلکہ وہ لاکھوں لوگ بھی اس تحریک میں ان کے ہم نوا ہوں گے جنہیں قریشی صاحب نے سلطان بلبن کے ایک ''گزٹ نوٹیفکیشن'' کے مطابق ''شاہ'' قرار دیا ہے!

پولیس اسٹیٹ اور مارشل لاء

ایک دلچسپ خبر جھنگ سے موصول ہوئی ہے۔جس کے مطابق جھنگ پولیس کی تمام نفری کی پریڈ پولیس گراؤنڈ میں ہوئی۔ اس موقع پر جھنگ کے نئے ایس پی میجر عارف چودھری موجود تھے۔ ریہرسل پریڈ کے بعد تمام ملازمین کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ایس پی نے فوری طور پر آنسو گیس کھولنے کا حکم دیا تاکہ یہ تجربہ کیا جا سکے پولیس ملازمین آنسو گیس کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ آنسو گیس کے بعد پولیس ملازمین میں بھگدڑ مچ گئی، کئی ملازمین کو زکام ہو گیا اور کئی کے بیمار ہو جانے کی خبر ملی ہے۔

ہم نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے ہمارا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا ہے۔ ایس پی جھنگ نے پولیس ملازمین پر جو تجربہ کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ ہے لیکن بہتر ہوتا اگر آنسو گیس کے بعد ان پولیس ملازمین پر لاٹھی چارج بھی کیا جاتا تاکہ پتہ چلتا کہ لاٹھی کھانے کے سلسلے میں ان کی قوتِ برداشت کتنی ہے؟ اسی طرح یہ تجربہ مختلف مرحلوں میں آگے بھی بڑھایا جا سکتا ہے مثلاً انہیں تھانے میں بلا کر پنکھے سے باندھ کر اُلٹا لٹکایا جانا بھی ضروری ہے تاکہ اس ضمن میں بھی ان کی قوتِ برداشت کا اندازہ ہو سکے۔ ان کے پائجامے میں چھچھوندر چھوڑی جا سکتی ہے۔ تھانیدار صاحب کے کمرے میں گھنٹوں مودب کھڑے ہونے کو کہا جا سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کئی دن تک انہیں غیر قانونی طور پر محبوس رکھنے کا تجربہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کے گھروں میں چھاپہ مار کر وہ سب کچھ

دہرانے کا تجربہ بھی ہونا چاہیے جو عام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ ان کی قوتِ برداشت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ کئی دفعہ اس نوع کی خبریں اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں کہ پولیس والوں نے کسی کنبے کا برہنہ جلوس نکالا اور انہیں رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے تھانے تک لائے لیکن یہ اس قدر شرمناک بات ہے کہ اسے تجربے کے طور پر بھی دہرانا اچھا نہیں لگتا۔ بس اس ضمن میں ان کی قوتِ برداشت زبانی دریافت کر لینی چاہیے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ قوتِ برداشت آزمانے کا تجربہ شیطان کی آنت کی طرح دراز ہو سکتا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں دیں مثلاً اگر قتل کا کوئی معمہ حل ہوتا نظر نہ آئے یا قتل کی ''قوت خرید'' زیادہ ہو تو یہ قتل کسی ایسے بے بس اور بے نوا سے شخص پر ڈال دیا جاتا ہے جو اپنا دفاع نہ کر سکتا ہو اور ہمارے معاشرے میں خواتین سے زیادہ مجبور اور بے بس مخلوق کون سی ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ تجربہ دہرانا بھی مناسب نہیں، کیونکہ ہمیں اس کے تصور ہی سے گھن آتی ہے۔ البتہ جھنگ کے ایس پی چاہیں تو اپنے پولیس ملازمین کے ہاں سے باری باری ہیروئن برآمد کروا سکتے ہیں تاکہ جھوٹے کیس میں ملوث ہونے کے ضمن میں ان کی قوتِ برداشت کا اندازہ ہو سکے۔ اسی طرح کھاتے پیتے پولیس والے پر بکری کی چوری اور کسی شاعر کے نیفے سے بم کی برآمدگی کا تجربہ بھی کیا جا سکتا ہے غرضیکہ اس قسم کے بہت سے تجربے اور بھی ہیں جو کیے جا سکتے ہیں مگر اس قصے کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ایس پی جھنگ نے جو تجربہ کرنا تھا کر لیا۔ اب ضروری نہیں کہ وہ اس ضمن میں ہمارے ''مفت مشوروں'' سے بھی استفادہ کریں۔

ویسے ایک دلچسپ حسن اتفاق یہ بھی ہے کہ ادھر ایس پی جھنگ کے حوالے سے متذکرہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی اور ادھر اسی روز کے اخبار میں ایک خبر آئی جی پولیس سندھ کے حوالے سے بھی چھپی۔ آئی جی پولیس سندھ کے حوالے سے شائع ہونے والی

خبر میں بتایا گیا کہ آئی جی نے نابینا نوجوانوں کو محکمہ پولیس میں بحیثیت کانسٹیبل بھرتی کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں۔ جس اخبار نے یہ خبر شائع کی ہے ہمیں اس سے یہ گلہ ہے کہ اس نے یہ خبر شائع کیوں کی کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ''خبر'' نہیں۔ کیونکہ پولیس میں ''نابیناؤں'' کو ایک عرصے سے بھرتی کیا جارہا ہے۔ البتہ اس کا ''اعتراف'' پہلی بار کیا گیا ہے۔ بہر حال اگر پولیس کے حوالے سے شائع ہونے والی پہلی اور دوسری خبر کو ملا کر پڑھا جائے تو ان دونوں خبروں کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم ہمارے اس کالم سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ ہم پولیس کے پورے محکمے کے خلاف ہیں اور ہمیں ان میں کوئی ہمدرد اور شفیق افسر یا جوان نظر نہیں آتا کیونکہ پولیس اور فوج کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر ایک ہی ہے۔ ہم ان دونوں محکموں کی اہمیت اور افادیت کے زبردست قائل ہیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ معاشرے میں ان کی عزت وتکریم میں اضافہ ہو۔ ہماری اگر کوئی خواہش ہے تو وہ بس اتنی کہ پولیس ملک کو پولیس اسٹیٹ نہ بنائے اور فوج ملک میں مارشل لاء نافذ نہ کرے۔ اگر یہ دونوں محکمے ''پیاز'' کھانے کی یہ عادت چھوڑ دیں تو ان سے زیادہ قابل تکریم اور دلوں میں گھر کرنے والے محکمے اور کوئی نہیں ہیں۔

(۱۶ نومبر ۱۹۸۵ء)

تصنیفات

جرُمِ ظریفی ، خندِ مکرّر ، شرگوشیاں ، تجاہلِ کالمانہ ، ڈھول دھپا ، شوقِ آوارگی ، گوروں کے دیس میں ، دُنیا خوبصورت ہے ، دلّی دور است ، بارہ سنگھے ، بُلبلے ، مزید گنجے فرشتے ، وصیّت نامے ، عطایئے ، ہنسنا رونا منع ہے ، روزنِ دیوار سے ، ملاقاتیں ادھوری ہیں ، مجموعہ (طنز و مزاح) ، مجموعہ (کالم) اور مجموعہ (سفرنامے)